انسان بڑا کیسے بنا

میخائل ایلین اور ایلینا سیگال

دانیال

میخائل ایلین اور ایلینا سیگال

پہلی بار : ۱۹۶۷ء
دوسرا ایڈیشن : ۱۹۸۴ء
تیسری بار : ۱۹۸۶ء
نگرانِ اشاعت : حوری نورانی
ناشر : ملک نورانی،
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز ۲
عبداللہ ہارون روڈ کراچی
طابع : احمد برادرس، کراچی
قیمت : ۳۳ روپے

ترتیب

صفحہ

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

عظیم انسان

کرۂارض پر ایک عظیم ہستی ھے۔
اس کے ھاتھ ایسے ھیں کہ وہ آسانی سے انجن اٹھا لیتے ھیں۔
اس کے پیر ایسے ھیں کہ وہ ھزاروں میل کا راستہ ایک دن میں طے کر لیتے ھیں۔
اس کے پر ایسے ھیں کہ وہ اس کو بادلوں کے اوپر وھاں لے جاتے ھیں جہاں پرندہ پر نہیں مارسکتا۔
اس کے پیراک پر ایسے ھیں کہ وہ تہہ آب کسی مچھلی سے بہتر کام دیتے ھیں۔
اس کی آنکھیں ایسی ھیں کہ غائب چیز کو دیکھ سکتی ھیں اور کان ایسے ھیں کہ دنیا کے دوسرے سرے کی بات سن سکتے ھیں۔
یہ ھستی اتنی طاقت‌ور ھے کہ پہاڑوں کے اندر سرنگیں بناتی ھے اور آبشاروں کو ھوا میں معلق کر دیتی ھے۔
وہ اپنی مرضی کے مطابق دنیا کے خدوخال بدل رھی ھے، جنگل لگا رھی ھے، سمندروں کو ایک دوسرے سے ملا رھی ھے، ریگستانوں کو سیراب کر رھی ھے۔
یہ عظیم ھستی کون ھے؟
انسان۔
لیکن وہ عظیم کیسے بن گیا، کرۂارض کا مالک کیسے بنا؟
اس کتاب میں ھم یہی بتانا چاھتے ھیں۔

پہلا باب

نظر نہ آنے والا پنجرا

ایک زمانہ تھا جب انسان عظیم نہیں بلکہ حقیر تھا، قدرت کا فرماں بردار غلام، اس کا مالک نہیں۔

قدرت پر اس کا زور اتنا ہی کم تھا اور اس کی آزادی اتنی محدود تھی جیسے جنگلی جانور یا پرندے کی۔

کہاوت تو یہ ہے کہ ''چڑیا کی طرح آزاد،،۔

لیکن کیا چڑیا واقعی آزاد ہوتی ہے؟

یہ سچ ہے کہ اس کے پر ہوتے ہیں اور وہ کہیں بھی جا سکتی ہے، جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں کے اوپر۔ جب خزاں میں سارس جنوب کی طرف اڑ کر جاتے ہیں تو ہمیں بڑا رشک آتا ہے۔ اوپر روشن آسمان میں وہ باقاعدہ قطار بنا کر اڑتے ہیں اور نیچے کھڑے لوگ اپنے سر اٹھا اٹھا کر اوپر دیکھتے ہیں اور حیرت سے کہتے ہیں ''چڑیوں کو دیکھو! وہ ہر جگہ اڑکر جا سکتی ہیں!،،

لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا چڑیاں ہزاروں میل اسی لئے اڑتی ہیں کہ ان کو سفر پسند ہے؟ نہیں وہ خوشی سے نہیں بلکہ ضرورتاً ایسا کرتی ہیں۔ ان کی منتقل ہونے والی عادتیں بےشمار نسلوں اور ہزاروں سال کے دوران زندگی کی جدوجہد میں پیدا ہوئی ہیں۔

چونکہ ہر چڑیا ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑکر جا سکتی ہے اس لئے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ہر قسم کی چڑیاں دنیا کے ہر حصے میں کیوں نہیں پائی جاتیں۔

اگر ایسا ہوتا تو ہمارے صنوبر کے شمالی جنگل اور سفیدے کی گپھائیں شوخ رنگ طوطوں اور لوؤں سے بھری پڑی ہوتیں۔ جنگل سے گذرتے ہوئے ہم اپنے سر کے اوپر میدانی چکاوک کی جانی پہچانی چہچہاہٹ سنتے۔ لیکن نہ تو ایسا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے کیونکہ چڑیاں اتنی آزاد تو نہیں ہیں جتنی وہ معلوم ہوتی ہیں۔

دنیا میں ہر چڑیا کا اپنا مقام ھے۔ ایک جنگل میں رہتی ھے تو دوسری کھلے میدان میں اور تیسری ساحل سمندر پر۔

ذرا سوچو تو عقاب کے پروں میں کتنی قوت ھوتی ھے! لیکن وہ اپنی حد سے باھر نکل کر کبھی گھونسلا نہیں بنائیگا۔ سنہرا عقاب اپنا بڑا سا گھونسلا کھلے اور بےدرخت میدانوں میں نہیں بناتا اور میدانی عقاب کبھی جنگل میں گھونسلا نہیں بناتا۔

ایسا معلوم ھوتا ھے جیسے جنگل استیپی میدان سے ایسی نظر نہ آنےوالی دیوار کے ذریعہ علحدہ کیا گیا ھے جس کے اندر سے ہر جانور اور ہر جانور چڑیا نہیں گذر سکتی ھے۔

تم کو جنگل کے سچے باسی مثلاً بٹیر، جنگلی مرغی اور گلہری کبھی میدانوں میں نہیں ملینگے اور میدانوں کے جانور جیسے تغدار اور پھدکنے والا چوھا (jerboa) وغیرہ جنگل میں نہیں دکھائی دینگے۔

اس کے علاوہ ہر جنگل اور ہر میدان میں بہت سی نظر نہ آنےوالی دیواریں ھوتی ھیں جو اس کو چھوٹی چھوٹی دنیاؤں میں بانٹ دیتی ھیں۔

جنگل کی سیر

جنگل میں گھومتے وقت تم نظر نہ آنےوالی دیواروں کو پار کرتے رہتے ھو اور جب تم درخت پر چڑھتے ھو تو تمہارا سر نظر نہ آنےوالی چھتوں کو پار کرتا رہتا ھے۔ ایک بڑے مکان کی طرح پورا جنگل منزلوں اور فلیٹوں میں تقسیم ھوتا ھے۔ ان سب کا وجود واقعی ھے چاھے وہ تمہیں نظر نہ آئیں۔ پھر بھی یہ سچ ھے کہ جنگل میں گھومتے وقت تم دیکھتے ھو کہ وہ بدلتا رہتا ھے۔

مثلاً تم دیکھوگے کہ اچانک چیڑ کے درختوں کی جگہ صنوبر کے پیڑ آ گئے اور بعض جگہ صنوبر دوسری جگہوں کے مقابلے میں زیادہ لمبے ھیں۔ یہاں تم سبز کائی کے قالین پر چل رہے ھو اور وھاں زمین گھاس یا سفید کائی سے ڈھکی ھوئی ھے۔

شہروالے کے لئے یہ سب جنگل ھے لیکن اگر جنگلات کے کسی ماھر سے پوچھا جائے تو وہ کہیگا کہ یہاں ایک نہیں چار جنگل ھیں۔ مثلاً تم نشیب میں چیڑ کے درختوں کی گپھا دیکھوگے جہاں فرش پر کائی کا انتہائی دبیز قالین ھے۔ اس کے آگے ریتیلی ڈھلوان پر گہرے ماشی رنگ کی کائی کے درمیان صنوبر کے پیڑ ھیں جن کے چاروں طرف لال نیلی بیریوں کی جھاڑیاں ہر جگہ نظر آئینگی۔ اور اوپر ریتیلی پہاڑیوں

جنگل کے دو باسی — ہدہد اور کراس‌بل

پر سفیدی مائل ماشی رنگ کی کائی کے درمیان صنوبروں کا جھنڈ ہوگا اور آگے نم جگہ میں گھاس سے ڈھکا ہوا صنوبروں کا قطعہ ملیگا۔

دیکھو، تم تین دیواروں کے بیچ سے گذر گئے جو جنگل کے چار سنساروں کو ایک دوسرے سے علحدہ کرتی ہیں لیکن تم نے اس طرف دھیان بھی نہ دیا۔

اگر گھروں کی طرح جنگلوں میں بھی نام کی تختیاں لگی ہوتیں تو تم کو چیڑ کے جنگل میں درختوں پر کراس‌بل (cross bill)، جنگلی مرغی اور تین انگلیوں والے ہدہد کی تختیاں لٹکتی نظر آئیں اور پتیوں والے درختوں کے جنگل میں دوسری قسم کی تختیاں یعنی سبز ہدہد اور پھدکی وغیرہ کی۔

ہر جنگل کئی منزلہ ہوتا ہے۔

صنوبر کے جنگل میں دو اور کبھی کبھی تین منزلیں بھی ہوتی ہیں۔ نچلی منزل کائی یا گھاس کی ہوتی ہے۔ بیچ‌والی جھاڑیوں کی اور اوپری منزل صنوبر کے درختوں کی ہوتی ہے۔

شاہ بلوط کے جنگل میں تو سات منزلیں ہوتی ہیں۔ سب سے اوپروالی بلوط، ایش، لینڈن اور میپل کی چوٹیوں سے بنی ہوتی ہے اور ہوا میں بلندی پر لہراتی رہتی

ہے۔ گرمیوں میں وہ ایک سرسبز چھت بن جاتی ہے اور خزاں میں رنگارنگ ہو جاتی ہے۔ عظیم الشان بلوطوں کی چوٹیوں سے آدھی بلندی تک پہاڑی ایش، جنگلی سیب اور ناسپاتی کے درختوں کی کلغیاں بھی پہنچتی ہیں۔

ان کے نیچے جھاڑ جھنکاڑ کا ایک جال پھیلا ہوتا ہے۔ جھاڑیوں کے نیچے پھول اور گھاسیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی تہہ بہ تہہ اگتی ہیں۔ اور زمین سے بالکل قریب نرم کائی ہوتی ہے۔

جنگل کا گودام تہہ زمین ہوتا ہے اور یہاں ہم کو درختوں اور جھاڑیوں کی جڑیں ملتی ہیں۔

صنوبر یا پتےدار درختوں کے جنگلوں کی ہر منزل کے اپنے باشندے ہوتے ہیں۔ شکرہ اپنا گھونسلا سب سے بلندی پر بناتا ہے۔ اس کے نیچے کسی درخت کے کھوکھلے میں ھدھد اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہے۔ کستورا نے کٹیلے کی جھاڑی میں بسیرے کا انتظام کیا ہے۔ نچلی منزل میں رہنےوالی بن‌مرغی ادھر ادھر دوڑتی رہتی ہے۔ تہہ زمین گودام میں جنگلی چوھوں کی سرنگیں اور گھر ہوتے ہیں۔

اس بڑے گھر میں ہر قسم کے کمرے ہوتے ہیں۔ اوپر کی منزلوں میں دھوپ آتی ہے اور خشکی رہتی ہے۔ نچلی منزل میں اندھیرا اور نمی پائی جاتی ہے۔ ایسے سرد کمرے بھی ہوتے ہیں جو صرف گرمیوں میں رھائش کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور گرم کمرے بھی ہیں جن میں سارے سال رھا جا سکتا ہے۔

زمین کے اندر بل گرم رہتا ہے۔ ایک ایسے بل کا درجۂ حرارت ناپا گیا جس کی گہرائی ڈیڑھ میٹر تھی۔ یہ جاڑوں کی بات ہے جب کہ باہر درجۂ حرارت -18° سنٹی گریڈ تھا لیکن بل کے اندر $+8^\circ$ سنٹی گریڈ تھا۔

درخت کے کھوکھلے میں اس سے کہیں زیادہ سردی ہوتی ہے۔ یہاں تو جاڑوں میں کوئی جانور ٹھٹھر کر جم بھی سکتا ہے۔ لیکن گرمیوں میں یہ بڑی اچھی جگہ ہوتی ہے خصوصاً الوؤں اور چمگادڑوں کے لئے جو ہمیشہ ''رات کی پالی،، میں نظر آتے ہیں اور دن بھر کسی اندھیرے کمرے میں سورج سے چھپ کر اونگھنا پسند کرتے ہیں۔

انسان تو اکثر اپنی رھائش‌گاہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر، ایک منزل سے دوسری منزل چلا جاتا ہے۔ لیکن جنگل میں عملی طور پر یہ ناممکن ہے۔

بن مرغی اپنے تاریک اور نم گھر کو کسی خشک، روشن بالاخانے سے کبھی نہ بدلے گی۔ اور شکرہ جو بالاخانے کا دلدادہ ہے یہ کبھی نہ پسند کریگا کہ اس کا گھونسلا نِچلی منزل پر کسی درخت کی جڑ کے پاس ہو۔

جنگل کے بندی

تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ ایک گلہری نے پھدکنےوالے چوہے سے گھر کا تبادلہ کرنے کا فیصلہ کیا - گلہری تو جنگل میں رہتی ہے اور پھدکنےوالا چوہا کھلے استیپی میدان یا ریگستان میں -

گلہری کا گھر درخت میں اونچے پر ہوتا ہے، کھوکھلے میں یا ڈالیوں کے درمیان اور پھدکنے والا چوہا زمین کے اندر بل میں رہتا ہے -

اب اپنے نئے گھر تک پہنچنے کے لئے پھدکنےوالے چوہے کو درخت پر چڑھنا پڑیگا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکیگا کیوں کہ اس کے پنجے درختوں پر چڑھنےوالے نہیں ہوتے -

دوسری طرف گلہری بھی زمین کے اندر نہیں رہ سکتی - اس کی تمام عادتیں اور طور طریقے تو درختوں پر رہنےوالوں کے ہوتے ہیں -

ہم اس کی دم اور پنجے ہی دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے -

گلہری کے پنجوں کی بناوٹ شاخیں پکڑنے، اخروٹ اور صنوبر کے پھل درختوں سے چننے کے لئے ہوتی ہے اور اس کی دم ایک اڑن چھتری کا کام کرتی ہے جو اس کو ایک شاخ سے دوسری شاخ تک لمبی چھلانگ مارنے میں مدد دیتی ہے - جب کوئی شکاری جانور اس پر جھپٹتا ہے تو بھاگنے اور جست لگانے میں بھی اس کی دم کام آتی ہے -

لیکن استیپی میدانوں کے پھدکنےوالے چوہوں کے پنجوں اور دم کی ساخت تو گلہری سے بالکل مختلف ہوتی ہے - مسطح، کھلے استیپی میں تو پناہ کے لئے نہ کوئی جھاڑی ہوتی ہے اور نہ درخت - دشمن سے بچ نکلنے کا بس یہی واحد طریقہ ہے کہ بھاگ کر غائب ہوجائے یعنی زمین کے اندر گھس جائے - اور یہی پھدکنےوالا چوہا کرتا بھی ہے - وہ اوپر کسی الو یا الوعقاب کو منڈلاتے دیکھتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ اپنی بہت سی تہہ زمین سرنگوں میں سے ایک میں غائب ہو جاتا ہے - اسی لئے اس کے پنجے ایسے ہوتے ہیں - اچھلتے وقت وہ اپنے لمبے پچھلے پیر آگے کی طرف زور دینے کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس کے سامنے کے چھوٹے پیر زمین کھودنے کے لئے ہوتے ہیں - وہ اپنے دشمنوں سے بل میں پناہ لیتا ہے جو اس کو گرمیوں میں گرمی اور جاڑوں میں سردی سے بھی بچاتا ہے -

اور اس کی دم کا کیا استعمال ہے؟ پھدکنے والے چوہے کی دم اس کے پنجوں کی بہترین مددگار ہوتی ہے - جب یہ چھوٹا سا جانور اپنے پچھلے پیروں پر بیٹھ کر

چاروں طرف دیکھ بھال کرتا ہے تو اس کی دم اس کو تیسرے پیر کی طرح سہارا دیتی ہے اور جب وہ جست لگاتا ہے تو اس کی دم رخ بدلنےوالے آلے کا کام دیتی ہے۔ اگر اس کی دم نہ ہو تو پھدکنےوالا چوھا ہر بار جست لگانے میں ہوا میں قلا کھاکر دھم سے زمین پر آ رہے۔

اس لئے اگر گلھری اور پھدکنےوالا چوھا اپنے گھروں کا تبادلہ کریں، استیپی کو جنگل سے بدلیں اور کھوکھلے کو بل سے تو ان کو اپنی دمیں اور پنجے بھی بدلنا ہونگے۔

اگر ہم جنگل اور استیپی کے دوسرے باسیوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ سے ایک نظر نہ آنےوالی زنجیر کے ذریعہ بندھا ہے، ایسی زنجیر سے جس کو توڑنا بہت مشکل ہے۔

بن مرغی جنگل کی نچلی منزل میں رہتی ہے کیونکہ اس کی من بھاتی غذا تو گودام میں ہوتی ہے۔ اس کی لمبی چونچ خاص طور سے زمین کے اندر سے کینچوؤں کو کھینچ لانے کے لئے بنی ہے۔ چونکہ بن مرغی کے لئے درخت پر کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے وہ درخت پر کبھی نہیں ملیگی۔

لیکن تم کو تین انگلیوں یا شوخ رنگ کا بڑا ھدھد شاذونادر ہی زمین پر ملیگا۔ اس کا کام تو سارا دن کسی چیڑ یا برچ کے درخت کے تنے پر ٹھونگیں مارنا ہے۔

وہ کیوں ٹھونگیں مارتا ہے؟ وہ کیا تلاش کرتا ہے؟

اگر تم چیڑ کے درخت کی چھال کا ایک ٹکڑا چھڑا لو تو دیکھوگے کہ تنے پر ٹیڑھی میڑھی لائنیں ہر طرف چلی گئی ہیں۔ یہ نقاشی، چھال کے کیڑے کی بنائی ہوئی سرنگیں ہیں جو اس نے لکڑی چبا چباکر بنائی ہیں۔ ہر ٹیڑھی میڑھی لائن کے آخر میں ایک چھوٹا دندانہ ہوتا ہے اور ہر داندانے میں اس کیڑے کا انڈا تتلی میں تبدیل ہوکر کیڑا بنتا ہے۔ کیڑا چیڑ کے درخت کا عادی ہو گیا ہے اور ھدھد کیڑے کا۔ ھدھد کی سخت چونچ آسانی سے درخت کی چھال کو پھاڑ دیتی ہے اور اس کی زبان اتنی لمبی اور لوچدار ہوتی ہے کہ وہ ٹیڑھی میڑھی لائنوں پر لہراتی ہوئی جاتی ہے اور انڈوں کو ھڑپ کر لیتی ہے۔

اس طرح ایک زنجیر سی ہے: چیڑ کا درخت، چھال کا کیڑا اور ھدھد۔

یہ ان زنجیروں میں سے صرف ایک ہے جنھوں نے ھدھد کو درخت اور جنگل کا پابند بنا رکھا ہے۔

یہاں درخت پر اسے اپنی غذا ملتی ہے۔ صرف چھال کا کیڑا ہی نہیں بلکہ دوسرے کیڑے اور ان کے انڈے بھی۔ جاڑوں میں ھدھد بڑی صفائی کے ساتھ صنوبر

نے مخروطی پھلوں کو درخت کے تنے اور کسی شاخ کے درمیان رکھ کر ان کے بیج نکال لیتا ہے۔ ھدھد اپنے کنبے کے لئے کسی درخت کے تنے میں کھوکھلا بناتا ہے۔ اس کی سخت دم اور پنجوں کی طرح مضبوط چنگل اس کو تنے پر چڑھنے اترنے میں مدد دیتے ہیں۔ تو پھر وہ اپنی درختوں کی زندگی کو کسی دوسری چیز سے کیوں کر بدل سکتا ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ھدھد اور گلہری جنگل کے باسی نہیں، بندی ہیں۔

مچھلیاں خشکی پر کیسے آئیں

جنگل کی چھوٹی موٹی دنیا ان بہت سی ننھی منی دنیاؤں میں سے ہے جن سے مل کر بڑی دنیا بنتی ہے۔

اس دھرتی پر صرف جنگل اور استیپی میدان ہی نہیں ہیں۔ یہاں پہاڑ، ٹنڈرا، سمندر اور جھیلیں بھی ہیں۔

ہر ایک پہاڑ پر نظر نہ آنےوالی دیواریں ایک چھوٹی سی دنیا کو دوسری دنیا سے الگ کرتی ہیں۔

اور ہر سمندر ان دیکھی چھتوں کے ذریعہ منزلوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

ساحل پر لہروں سے ٹکرانےوالی چٹانیں بےشمار گھونگھوں سے ڈھکی ہوتی ہیں۔ وہ ان چٹانوں سے اتنی مضبوطی سے چپک جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کو چٹانوں سے نہیں جدا کر سکتا۔

اور آگے دھوپ سے روشن پانی میں، سبز اور بادامی سمندری گھاس کے درمیان رنگ برنگی مچھلیاں اچھلتی نظر آتی ہیں، شفاف جیلی مچھلی ادھر ادھر تیرتی ہے اور ستارہ مچھلی آہستہ آہستہ تہہ کے قریب تیرتی رہتی ہے۔ تہہ آب چٹانیں انوکھے جانوروں سے ڈھکی ہوئی ہیں جو پودوں کی طرح غیرمتحرک ہیں۔ ان کو اپنی غذا نہیں تلاش کرنی پڑتی۔ وہ خود ان کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ یہ سرخ ascidia ہیں جو دو منہ‌والی صراحی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے غذا ملتی ہے جو وہ پانی کے ساتھ چوس لیتے ہیں۔ چمکدار سمندری [illegible] اپنے پنکھڑیوں جیسے چنگلوں میں ان مچھلیوں کو گرفتار کر لیتے ہیں جو ان کے بالکل قریب آ جاتی ہیں۔

سمندر کی تہہ میں، اس کے تاریک فرش پر، جہاں رات ہی رہتی ہے، دن کبھی نہیں آتا، جہاں ہمیشہ تاریکی چھائی رہتی ہے بالکل ہی مختلف دنیا ہے۔ سمندر کی

گہرائیوں تک روشنی نہیں پہنچتی اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں سمندری گھاس نہیں ہوتی کیونکہ اس کو روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سمندر کی تہہ ایک وسیع قبرستان ہے جہاں جانوروں اور پودوں کی باقیات اوپر سے نیچے آتی رہتی ہیں۔

دس پیروں اور لمبے چنگلوں والے کیکڑے کیچڑ میں رینگتے رہتے ہیں۔ چوڑے منہ والی مچھلیاں اندھیرے میں تیرتی ہیں۔ کچھ کے تو آنکھیں ہوتی ہی نہیں کچھ کے دو آنکھیں ہوتی ہیں جو دوربین کی طرح باہر نکلی ہوتی ہیں۔ ایسی مچھلیاں بھی ہوتی ہیں جن کے جسم پر آتشیں گل ہوتے ہیں۔ وہ ننھے منے جہازوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جن کی کھڑکیوں کی روشنی جھلک رہی ہو۔ ایسی مچھلیاں بھی ہوتی ہیں جن کا اپنا مینارۂ روشنی ہوتا ہے۔ وہ ان کے سر سے اوپر کی طرف نکلا ہوتا ہے اور چمکتا ہے۔

یہ نرالی دنیا ہماری دنیا سے کتنی مختلف ہے!

لیکن سمندری ساحل کی اتھلے پانی کی پٹی بھی خشک زمین سے کتنی الگ ہے حالانکہ ان کو ایک واحد خط، ساحل کا خط علحدہ کرتا ہے۔

کیا ایک دنیا کے باسی دوسری دنیا کو منتقل ہو سکتے ہیں؟ کیا کوئی مچھلی سمندر کو چھوڑ کر خشکی پر منتقل ہو سکتی ہے؟

یہ تو بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مچھلی کی زندگی تو پانی سے وابستہ ہے۔ خشکی پر رہنے کے لئے اس کو گلپھڑوں کے بجائے پھیپھڑوں کی اور پروں کے بجائے پیروں کی ضرورت ہوگی۔ مچھلی سمندر کی زندگی کے بجائے خشکی کی زندگی اسی وقت اختیار کر سکتی ہے جب وہ مچھلی نہ رہے۔

لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مچھلی مچھلی نہ رہے؟

اگر تم یہ سوال ایک سائنس داں سے کرو تو وہ تم کو بتائیگا کہ لاکھوں سال پہلے بعض قسم کی مچھلیاں واقعی خشک ساحل پر آگئیں اور مچھلیاں نہیں رہیں۔ پانی سے خشکی تک کے اس عبوری، دورنے سال دو سال نہیں لئے۔ اس میں لاکھوں سال لگ گئے۔

آسٹریلیا کے دریاؤں میں جو کبھی کبھی خشک ہو جاتے ہیں ایک قسم کی سینگ مچھلی (hornfish) پائی جاتی ہے جس کی تیرنے کی تھیلی پھیپھڑے کی طرح ہے۔ جب سال کے خشک حصے میں پانی کی سطح کم ہونے لگتی ہے اور دریا صرف گدلے نالے بن جاتے ہیں تو تمام دوسری مچھلیاں مر جاتی ہیں اور پانی کو گندہ کر دیتی ہیں۔ صرف سینگ مچھلی اس خشک زمانے میں بھی زندہ رہتی ہے کیونکہ گل پھڑوں

2088

کے علاوہ اس کے پھیپھڑے بھی ہوتے ہیں اور جب اس کو ہوا کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنا سر پانی سے باہر نکال دیتی ہے۔

افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ایسی بھی مچھلیاں ہیں جو بغیر پانی کے بھی رہ سکتی ہیں۔ وہ خشکی کے زمانے میں ریت کے اندر گھس جاتی ہیں اور بے حس وحرکت پڑی رہتی ہیں صرف اپنے پھیپھڑوں سے سانس لیتی ہیں یہاں تک کہ برسات کا موسم پھر آ جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مچھلیاں پھیپھڑے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

لیکن پیروں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ہاں، وہ پیر بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ اس کے لئے تو زندہ مثالیں موجود ہیں۔ گرم منطقوں میں خشکی پر پھدکنےوالی مچھلیاں ہوتی ہیں جو صرف ساحل پر ہی نہیں پھدک سکتیں بلکہ درختوں پر بھی چڑھ جاتی ہیں۔ ان کے جوڑواں پر پیروں کا کام دیتے ہیں۔

یہ تمام انوکھی ہستیاں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ مچھلیاں پانی سے نکل کر خشکی پر آ سکتی تھیں۔ لیکن ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ واقعی ایسا ہی ہوا؟

معدوم جانوروں کی ہڈیاں ہمیں یہ داستان بتاتی ہیں۔ زمین کے قدیم پرتوں کی کھوج میں ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کرتے ہوئے ایک ایسے جانور کی ہڈیاں پائی ہیں جو بڑی حد تک مچھلی سے مشابہ ہے پھر بھی وہ مچھلی نہیں تھا۔ یہ مینڈک یا ٹرائٹن (triton) کی طرح جل‌بھومی جانور تھا۔ اس جانور کو stegocephalus کہا جاتا ہے۔ اس کے پروں کے بجائے باقاعدہ پانچ انگلیوں‌والے پیر تھے۔ جب وہ تھوڑی مدت کے لئے کنارے پر آتا تھا تو وہ ان پیروں کی مدد سے آہستہ آہستہ چل سکتا تھا۔

آؤ، اب ذرا معمولی مینڈک کو غور سے دیکھیں۔ جب وہ انڈے سے نکلتا ہے تو وہ دمدار ہوتا ہے۔ اور اس کے اور مچھلی کے درمیان بہت کم فرق ہوتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لاکھوں سال پہلے مچھلی کی بعض قسموں‌نے اس دیوار کو پار کر لیا جو سمندر اور خشکی کے درمیان حائل تھی لیکن اس عبوری دور میں ان میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جل بھومی جانور مچھلی کی اولاد ہیں اور وہ خود رینگنے والے جانور کے اجداد میں ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کے قدیم اجداد رینگنےوالے جانور ہیں۔ ان میں سے بہتیرے ایسے بھی ہیں جو پانی کو بالکل بھول چکے ہیں۔

بے زبان گواہ

پتھرائے ہوئے جانوروں کی ھڈیاں اس بات کی بے زبان گواہ ھیں کہ جانداروں میں لاکھوں برسوں کے دوران تبدیلیاں ہوئیں۔

ان میں کس طرح تبدیلی پیدا ہوئی؟

انگریز سائنس‌داں چارلس ڈاروں کے نظریۂ ارتقا پیش کرنے سے پہلے یہ ایک راز تھا۔ جو کام ڈاروں نے شروع کیا تھا اس کو دو روسی سائنس‌دانوں کووالیفسکی اور تیمیریازیف نے جاری رکھا اور جب انھوں نے اپنا وسیع مطالعہ پائہ تکمیل تک پہنچا لیا تو ھم کو وہ باتیں سمجھا دیں جو ھمارے دادا کبھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

دنیا میں ھر جاندار کا وجود اپنی جگہ کی مناسبت سے ہے، اس فضا اور ماحول کے مطابق جس میں وہ رھتا ہے۔ لیکن دنیا میں کچھ بھی یکساں نہیں رھتا۔ گرم آب و ہوا سرد ھو جاتی ہے، اس جگہ پہاڑ نمودار ھو جاتے ھیں جہاں پہلے میدان تھے۔ سمندر کی جگہ خشکی لے لیتی ہے، صنوبر کے جنگلوں کی جگہ پتیوں‌والے جنگل آ جاتے ھیں۔

اور جب چاروں طرف کی چیزیں بدلتی ھیں تو وہاں کے جانداروں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟

■ بھی بدلتے ھیں۔

بھر حال، یہ ان کے طے کرنے کی بات نہیں ہوتی کہ وہ کیسے بدلینگے۔ کوئی ھاتھی اچانک اپنی خوراک بدل کر پتوں، گھاس اور پھلوں کی جگہ گوشت تو نہیں کھانے لگے گا۔ کوئی ریچھ یہ نہیں کہیگا کہ ”مجھے گرمی لگتی ہے۔ میں اپنی بالدار جھبری کھال اتار دوں“۔

جاندار اپنی مرضی کے مطابق نہیں بدلتے۔ وہ بدلتے ھیں کیونکہ وہ نئی طرح کی غذائیں کھانے اور نئے حالات میں رھنے پر مجبور ہوتے ھیں۔ اور جو تبدیلیاں ہوتی ھیں وہ ھمیشہ تو ان کی بھلائی کے لئے یا کارآمد نہیں ہوتی ھیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جانور یا پودے نئے حالات میں رفتہ رفتہ ختم ھو جاتے ھیں کیونکہ تو ان کی زندگی کے لئے جو چیزیں ضروری ھیں وہ ان کو نہیں ملتیں جیسی کہ ان کے اجداد کو ملتی تھیں۔

■ بھوک اور سردی سے مرجاتے ھیں یا شاید ان کو غیرمعمولی گرمی اور خشکی ستاتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کا آسانی سے شکار ہوجاتے ھیں۔ ان کی اولاد اور بھی بیمار ہوتی ہے اور نئے حالات میں زندہ رھنے کی نسبتاً کم صلاحیت رکھتی ہے۔ آخر

میں یہ پوری کی پوری قسم ختم ہوجاتی ہے کیونکہ وہ تبدیلیوں پر قابو نہیں پا سکتی۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جانداروں میں ایسی تبدیلیاں ہوں جو کارآمد ہوں، نقصاندہ نہ ہوں۔ سازگار حالات میں ایسی کارآمد تبدیلیاں آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتی ہیں۔ ان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔

وقت گذرنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نسلیں اپنے اجداد سے مشابہت نہیں رکھتیں۔ ان کی فطرت ہی بدل جاتی ہے۔ ایسے حالات میں رہ سکتی ہیں جو ان کے اجداد کے لئے مضرت‌رساں ہوتیں۔ رہن سہن کے نئے حالات سے مانوس اور ان کی عادی بن جاتی ہیں۔ یہاں فطری انتخاب کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ جاندار جو اپنے کو نئے حالات کا عادی نہیں بنا سکے تباہ ہو گئے اور جن سے ایسا ممکن ہوا وہ باقی رہ گئے۔

تیمیریازیف نے ایک مثال پیش کی ہے۔ ایک ہاتھی‌چوک کا درخت پہاڑوں میں لگایا گیا۔ میدانی ہاتھی چوک کا تنا لمبا اور پتیاں خوب پھیلی ہوتی ہیں۔ پہاڑوں میں یہ درخت چھوٹا ہوگیا اور اس کی پتیاں زمین کے قریب پھیل گئیں۔

اس تبدیلی کی وجہ یہ ہوئی کہ ہاتھی چوک نے اپنے کو ایک نئی فضا میں پایا۔ پہاڑ کی آب و ہوا اور زمین دونوں میدان سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ اور یہ تبدیلی اس کے لئے اچھی بھی تھی۔ اب اس کے لئے اپنی پتیاں برف کے نیچے چھپا کر جاڑوں کی سرد ہواؤں اور پالے سے پناہ لینا آسان تھا۔

ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ماحول کی تبدیلی سے جاندار مخلوق کی فطرت بدل جاتی ہے۔

یہ بات اس سے واضح ہوتی ہے کہ مچھلیاں رفتہ رفتہ تبدیل ہوکر جل بھومی مخلوق بن گئی ہیں۔

اس کی ابتدا زمانہ تاریخ سے قبل کے پایاب سمندروں اور جھیلوں سے ہوئی تھی جو رفتہ رفتہ سوکھ رہے تھے۔ مچھلی کی وہ قسمیں جو اپنے کو زندگی کے نئے طریقے کا عادی نہیں بنا سکیں مرنے لگیں اور صرف وہ قسمیں بچیں جنھوں‌نے طویل مدت تک بغیر پانی کے رہنا سیکھ لیا۔ خشک موسم میں یا تو ریت میں چلی جاتی تھیں یا قریب‌ترین جوہڑ میں۔ اپنے پروں کو پیروں کی طرح استعمال کرتی تھیں۔ قدرت نے چھوٹی سی چھوٹی جسمانی تبدیلی کا استعمال کیا جو خشکی پر کارآمد ہو سکتی تھی۔ ان مچھلیوں کی تیراکی کی تھیلی رفتہ رفتہ پھیپھڑوں میں تبدیل ہو گئی۔ اور جوڑی‌دار پروں نے پیروں کی شکل اختیار کر لی۔

اس طرح کچھ پانی کے باسیوں نے اپنے کو خشکی کی زندگی کا عادی بنا لیا۔
تبدیلی کی صلاحیت نے ھی مچھلی کے پروں، اس کی تیراکی کی تھیلی اور جسمانی ساخت کو نئے ماحول کے مطابق تبدیل کر دیا۔
انتخاب نے صرف وھی تبدیلیاں برقرار رکھیں جو کارآمد تھیں اور جو مضرت‌رساں تھیں ان کو ختم کر دیا۔
نسلی وراثت نے ان کارآمد تبدیلیوں کو آئندہ نسلوں میں منتقل کیا، ان میں اضافہ کیا اور ان کو مضبوط بنایا۔
کووالیفسکی نے گھوڑے کی تاریخ کے بارے میں تحقیقات کرکے ایک اور واضح مثال پیش کی ھے۔
واقعی یہ یقین کرنا مشکل ھے کہ گھوڑا ایسے چھوٹے جانور کی اولاد ھے جو کسی زمانے میں گھنے جنگلوں میں رہتا تھا اور گرے پڑے درختوں کے اوپر سے صفائی کے ساتھ چھلانگ لگاتا تھا۔ اس چھوٹے جانور کے گھوڑے جیسے کھر نہیں تھے۔ اس کے پیر چھوٹے تھے اور پانچ انگلیوں‌والے پنجے رکھتے تھے۔ اس سے اس کو جنگل کی ناھموار زمین پر قدم جما کر چلنے میں مدد ملتی تھی۔
وقت آیا کہ یہ بڑے جنگل چھدرے ھونے لگے اور ان کی جگہ میدانوں نے لے لی۔ اب گھوڑے کے جنگل‌باسی بزرگوں کو اکثر کھلے میدان میں آنا پڑتا تھا۔ خطرے کی حالت میں یہاں جنگل کی طرح کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی۔ فرار کا طریقہ محض تیزرفتاری تھی۔ جنگلوں میں چھپنے کا جو طریقہ تھا وہ میدانوں میں نہیں رہا۔ اس کی جگہ بھاگ‌دوڑ نے لے لی اور بہت سے جنگلی جانور تعاقب میں ختم ھو گئے۔ صرف وھی درندوں سے بچے جن کی ٹانگیں سب سے لمبی اور تیزرفتار تھیں۔
ایک مرتبہ پھر قدرت نے اپنے انتخاب سے کام لیا، اس نے ھر اس تبدیلی کو تلاش کرکے محفوظ رکھا جو جانور کو تیز دوڑنے میں مدد دیتی تھی اور ھر اس چیز کو رد کر دیا جو دوڑنے میں استعمال نہیں ھو سکتی تھی۔
گھوڑے کے بزرگوں کو زندگی کی آزمائشوں نے یہ دکھایا کہ تیز دوڑنےوالے جانوروں کے پیروں میں بہت سی انگلیوں کی ضرورت نہیں ھے۔ اگر وہ مضبوط اور سخت ھو تو بس ایک کافی ھے۔ ایک زمانے میں گھوڑے کے تین انگلیاں تھیں اور آخرکار پھر ایک ھی رہ گئی۔ جس گھوڑے کو ھم موجودہ زمانے میں دیکھتے ھیں اس کے ایک لمبی انگلی یعنی کھر ھے۔
میدان میں آکر گھوڑے کے صرف پیر ھی نہیں بدلے بلکہ اس کا سارا جسم بدل گیا۔ مثلاً اس کی گردن کو لے لو۔ اگر اس کے پیر زیادہ لمبے ھوگئے ھوتے اور گردن چھوٹی ھی رہ جاتی تو گھوڑا اس گھاس تک نہ پہنچ سکتا جو اس کے قدموں کے

نیچے ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قدرت نے چھوٹی گردن‌والے گھوڑوں کو رد کر دیا جیسا کہ وہ چھوٹے پیروں‌والے گھوڑوں کے ساتھ کر چکی تھی۔

اور گھوڑے کے دانتوں کے بارے میں؟ وہ بھی بدل گئے۔ میدان میں گھوڑے کو سخت اور موٹے پودے کھانا پڑے جن کو اسے پہلے اپنی داڑھوں سے چباکر باریک کرنا پڑتا تھا۔ اور اسی لئے اس کے دانت بھی بدلے۔ اب اس کے دانت ایسے ہیں جو سوکھی گھاس کو بھی چباکر باریک کر سکتے ہیں۔

گھوڑے کے پیروں، گردن اور دانتوں کو بدلنے کے زبردست کام میں پانچ کروڑ سال لگے۔ اور اس عمل کے دوران بہت سے جانور ختم ہو گئے۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ جو دیواریں سمندر کو خشکی سے اور جنگل کو میدان سے علحدہ کرتی ہیں وہ مستقل نہیں ہیں۔ سمندر یا خشک ہو جاتے ہیں یا خشکی پر چڑھ آتے ہیں، میدان ریگستانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، سمندر کے باسی رینگ‌کر خشکی پر آ جاتے ہیں اور جنگل کے رہنے‌والے میدانوں میں رہنے لگتے ہیں۔ لیکن کسی جانور کے لئے اپنی چھوٹی موٹی دنیا چھوڑنا، اپنے ماحول کی زنجیروں کو توڑنا کتنا مشکل ہے۔ ان زنجیروں کو توڑنے کے بعد بھی وہ آزاد نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک ان دیکھے پنجرے سے دوسرے پنجرے میں پہنچ جاتا ہے۔

جب گھوڑا جنگل چھوڑکر میدان میں آیا تو وہ جنگل کا باسی نہ رہا، میدان کا رہنے‌والا ہو گیا۔ ایک مرتبہ اگر کسی قسم کی مچھلی کو پانی سے باہر خشکی کا راستہ مل گیا تو پھر یہ مچھلیاں سمندر کو نہیں واپس ہوئیں کیونکہ واپسی کے لئے دوبارہ تبدیلی کی ضرورت تھی۔ یہی ان کئی قسم کی خشکی کی مچھلیوں کے ساتھ ہوا جو خشکی سے سمندر کو واپس ہوئیں۔ ان کے پیر پھر پروں میں تبدیل ہوگئے۔ مثلاً وھیل کو ایسا "مچھلی جیسا" بننا پڑا کہ جو لوگ اس کے آغاز کے بارے میں نہیں جانتے ہیں اس کو مچھلی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ صرف ظاھری صورت اور طریقۂ زندگی کے لحاظ سے مچھلی سے مشابہت رکھتی ہے۔

انسان آزادی کی راہ پر

دنیا میں تقریباً دس لاکھ قسم کے جانور ہیں اور ہر ایک اپنی چھوٹی موٹی دنیا میں رہتا ہے جس کا وہ عادی بن گیا ہے۔

بعض جگہوں پر ایک قسم کے جانوروں کو یہ ان‌دیکھا نشان ملیگا کہ "دور رہو" اور دوسری قسم کو ایسی جگہ "خوش‌آمدید" کا ان‌دیکھا نشان ملیگا۔
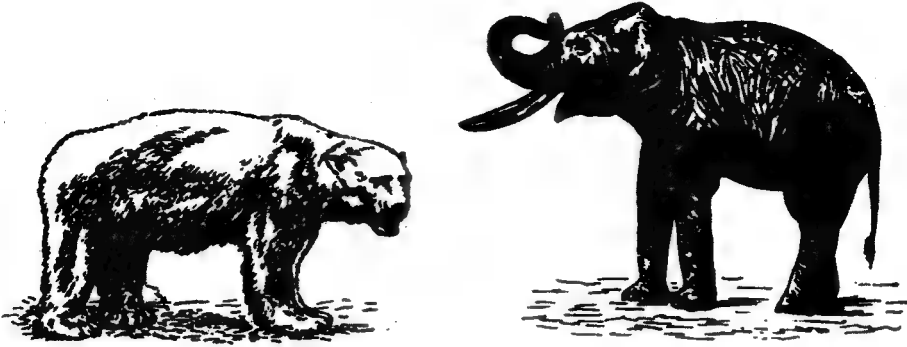
قطبی ریچھ اور ہاتھی اب صرف چڑیا گھر میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں

ذرا سوچو تو کسی قطبی ریچھ کا منطقۂ حارہ کے جنگل میں کیا حال ہوگا۔ اس کا تو دم گھٹ جائیگا کیونکہ اس کا سمور کا موٹا کوٹ تو اتارا نہیں جا سکتا۔ لیکن گرم خطوں کا کوئی رہنےوالا مثلاً ہاتھی تو آرکٹک کے برف میں ٹھٹھر کر مرجائیگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جس کی زندگی گرم غسل میں بسر ہوتی ہو اس کے جسم پر تو کھال ہی ہوگی۔

دنیا میں صرف ایک ایسی جگہ ہے جہاں قطبی ریچھ اور ہاتھی پڑوسی ہوتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں دنیا کے ہر حصے کے جانور ہوتے ہیں۔ یہاں میدانوں کے جانور جنگلوں کے جانوروں سے صرف چند گز کے فاصلے پر نظر آتے ہیں اور پہاڑی جانور ان کے برابر رہتے ہیں۔ یہ جگہ چڑیا گھر ہے۔

چڑیا گھر میں تو جنوبی افریقہ کے برابر ہی آسٹریلیا ہوتا ہے اور آسٹریلیا کا پڑوسی شمالی امریکہ ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا سے جانور یہاں آتے ہیں۔ لیکن وہ خود نہیں آئے ہیں۔ انسان‌نے یہاں ان کو لاکر جمع کیا ہے۔

سوچو تو کہ ان سب کو خوش رکھنا کتنی مشکل بات ہے! ہر جانور اپنی چھوٹی موٹی دنیا کا عادی ہوتا ہے۔ اور انسان کو ان سب کے لئے ایسے حالات پیدا کرنا چاہئے جو ان کی چھوٹی موٹی دنیا کے مطابق ہوں۔

یہاں ایسا تالاب ہونا چاہئے جو سمندر کی یاد دلائے اور وہاں ریگستان کا ایک ٹکڑا۔

پھر جانوروں کو کھلانا پلانا ہے۔ ان کو ایک دوسرے کو ہڑپ کرنے سے باز رکھنا ہے۔ قطبی ریچھ کو غسل کے لئے ٹھنڈا پانی چاہئے۔ بندروں کو گرمی

کی ضرورت ہوتی ہے ۔ شیر کو ہر روز اپنی خوراک کے مطابق کچا گوشت چاہتا ہے اور عقاب کو اتنی جگہ چاہئے کہ وہ اپنے پروں کو حرکت میں لا سکے ۔

میدانوں، جنگلوں، پہاڑوں، ریگستانوں اور سمندروں کے جانوروں کو انسان مصنوعی طور پر اکٹھا کرتا ہے تو اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے لئے ایسی مصنوعی فضا بھی پیدا کی جائے کہ وہ ختم نہ ہو جائیں ۔

انسان خود کس قسم کا جانور ہے؟ میدانی، جنگلی یا پہاڑی جانور؟

کیا جنگل میں رہنےوالے آدمی کو ''جنگلی آدمی،، اور دلدل میں رہنےوالے کو ''دلدلی آدمی،، کہا جا سکتا ہے؟

نہیں، بالکل نہیں ۔

کیونکہ ایسا آدمی جو جنگل میں رہتا ہے میدان میں بھی رہ سکتا ہے ۔ اور جو آدمی دلدل میں رہتا ہے اس کو زیادہ خشک جگہ منتقل ہونے سے خوشی ہوگی ۔

آدمی کہیں بھی رہ سکتا ہے ۔ اس دنیا میں مشکل سے ہی کوئی ایسا کونا ہوگا جہاں آدمی نہ پہنچا ہو اور جہاں کوئی ایسا نہ دکھائی دینےوالا نشان ہو جو کہتا ہو ''انسان، دور رہو!،، ۔ آرکٹک میں تحقیقات کرنےوالے بہتی ہوئی برفانی چٹانوں پر رہتے ہیں ۔ اگر ان کو اچانک انتہائی گرم ریگستانوں میں جانا پڑے تو ان کو کوئی مشکل نہ ہوگی ۔

اگر کوئی آدمی استیپی میدان سے جنگل کو یا جنگل سے میدان کو منتقل ہوتا ہے تو اسے اپنے ہاتھ پیر اور دانت نہیں بدلنا پڑتے ۔ اگرچہ اس کا جسم موٹے سمور سے ڈھکا نہیں ہوتا پھربھی وہ جب جنوب سے شمال کو جاتا ہے تو ختم نہیں ہو جاتا ۔

اس کو سمور کا کوٹ، ٹوپی اور بوٹ جوتے سردی سے اسی طرح بچاتے ہیں جیسے جانوروں کا سمور ان کو بچاتا ہے ۔

آدمی نے گھوڑے سے کہیں زیادہ تیز چلنا سیکھ لیا ہے لیکن اس کے لئے اسے اپنی انگلیوں سے نہیں دستبردار ہونا پڑا ۔

آدمی نے مچھلی سے کہیں زیادہ تیز تیرنا سیکھ لیا ہے لیکن اس کے لئے اسے ہاتھ پیروں کی جگہ مچھلی کے پروں کی ضرورت نہیں ہوئی ۔

رینگنےوالے جانوروں کو پرندوں میں تبدیل ہونے میں لاکھوں برس گذر گئے ۔ ان کو اس تبدیلی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی کیونکہ اس تبدیلی کے دوران وہ اپنے اگلے پنجوں سے محروم ہو گئے جو پر بن گئے ۔ انسان نے چند صدیوں میں اڑنا سیکھا ہے لیکن اس کو اپنے بازوؤں سے نہیں محروم ہونا پڑا ۔

آدمی نے یہ گر سیکھ لیا کہ نظر نہ آنے والی دیواروں کے درمیان سے، جو جانوروں کو اپنا قیدی بنا لیتی ہیں، بلاتبدیلی کیسے گذرا جا سکتا ہے۔

انسان ایسی بلندیوں تک جا سکتا ہے جہاں سانس لینے کے لئے ہوا نہیں ہے پھر بھی زمین پر صحت‌مند اور چاق وچوبند واپس آتا ہے۔

جب سوویت ہوابازوں نے فضا میں بلندی کے تمام ریکارڈ توڑ دئے تو زندگی کی عام چھت زیادہ بلند ہو گئی اور اس دنیا کے حدود کے پار ہو گئی جس میں زندہ مخلوقات آباد ہیں۔

جانوروں اور چڑیوں کا انحصار پوری طرح قدرت پر ہوتا ہے۔ ریاضی کے کسی سوال کے حل کا انحصار اس کے شرائط پر ہوتا ہے۔ یہی صورت قدرت کی ہے۔ ہر جانور ایسا مسئلہ ہے جس کو زندگی نے کامیابی سے حل کر لیا ہے۔ مسئلے کے شرائط ــ زندگی کے حالات ہیں اور اس کا جواب پنجوں، پیروں، پروں، مچھلی کے پروں، چونچوں، چنگلوں، عادتوں اور طور طریقوں کی ایک وسیع فہرست ہے۔ جواب کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جانور کو کہاں اور کیسے رہنا ہے۔ میٹھے یا کھاری پانی میں یا خشکی پر، ساحل پر یا سمندر میں، سمندر کی تہہ میں یا سطح سمندر سے قریب، شمال یا جنوب میں، پہاڑوں پر یا وادیوں میں، سطح زمین پر یا تہہ‌زمین، استیپی میدانوں میں یا جنگلوں میں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کون سے جانور اس کے پڑوسی ہوتے ہیں۔

جانور پوری طرح اپنے ماحول کا محتاج ہوتا ہے۔

لیکن آدمی اپنی مرضی کے مطابق ماحول بناتا ہے۔ اکثر قدرت کی کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے اور ان شرائط کو کاٹ دیتا ہے جو اسے پسند نہیں ہیں۔

قدرت کی کتاب کہتی ہے: ''ریگستان میں بہت کم پانی ہے،،۔ لیکن جب ہم ریگستان میں گہری نہریں کھود دیتے ہیں تو ہم اس حالت کو ختم کردیتے ہیں۔

قدرت کی کتاب کہتی ہے: ''شمال کی زمین بنجر ہے،،۔ ہم زمین میں کھاد ڈال کر اس کو بدل دیتے ہیں۔ ہم کئی سال تک خودبخود اگنے والی گھاسیں اور پھلی‌دار فصلیں بوکر زمین کو زرخیز بناتے ہیں۔

قدرت کی کتاب کہتی ہے: ''جاڑے کے موسم میں سردی اور رات میں اندھیرا ہوتا ہے،،۔ لیکن آدمی ان باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ وہ اپنے گھر کو جاڑے میں گرم اور رات میں روشن کرتا ہے۔

ہم برابر اپنے ماحول کو بدلتے رہتے ہیں۔

جو جنگل ہمارے چاروں طرف ہیں شجرکاری اور جنگلوں کی کٹائی کی وجہ سے مدت ہوئے اپنی صورت‌شکل بدل چکے ہیں۔
اب ہمارے استیپی میدان بھی پہلے کی طرح سپاٹ ویرانے نہیں رہے ہیں۔ ان کو آدمی زیرکاشت لایا ہے۔
ہمارے پودے، ہماری گیہوں اور رئی کی فصلیں، ہمارے سیب اور ناسپاتیوں کے درخت ان جنگلی اناج کی گھاسوں اور پھل کے پیڑوں کی طرح بالکل نہیں ہیں جو کسی زمانے میں ویرانوں میں اگتے تھے۔
آپ کو ایسے قدرتی درخت کہاں ملیں گے جن میں سیب اور ناسپاتیاں دونوں پیدا ہوتی ہوں یا آدھے میں میٹھی بیریاں ہوں اور آدھے میں جنگلی بیریاں! یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے انوکھے پھل روسی سائنس‌داں اور ماہر باغبانی ایوان میچورین نے پیدا کئے ہیں۔
ان کی تعلیم کی پیروی کرنےوالے سائنس‌داں اب قدرت کی برابر تبدیل ہونےوالی خوبیوں اور اس کی وراثت اور انتخاب کی صفات کو اس راہ پر لگا سکتے ہیں جو آدمی کے لئے مفید ہو۔
ایسے گھریلو جانور جیسے گھوڑے، گائیں اور بھیڑیں اب جنگلی نہیں ہوتے۔ ان کو آدمی پالتا پوستا ہے اور ان کی افزائش کرتا ہے۔
آدمی نے جنگلی جانوروں کے طور طریقے بدل ڈالے ہیں۔ بعض جانور غذا کی تلاش میں آدمی کے گھروں اور کھیتوں سے بہت قریب رہتے ہیں اور بعض آدمی سے بھاگنے کی کوشش میں اس سے بہت دور جنگلوں اور ویرانوں مین چلے گئے ہیں۔ آدمی کے ظہور سے پہلے ان جانوروں کے اجداد وہاں نہیں رہتے تھے۔
ایک زمانہ وہ بھی آئےگا جب آدمی کوئی اصلی جنگل یا ویرانہ دیکھنا چاہےگا تو اس کو خاص محفوظ جگہوں کو جانا پڑیگا کیونکہ انسان دنیا کا چہرہ بالکل بدل دےگا۔
ان محفوظ جگہوں کی سرحدیں کھینچتے ہوئے ہم قدرت سے کہتے ہیں: ”تم کو ہم یہاں کی مالکہ رہنے دیں گے لیکن اس سرحد کے پار ہر چیز ہماری ہے۔“
انسان روزافزوں قدرت کا مالک بنتا جا رہا ہے۔
یہ صورت ہمیشہ سے نہ تھی۔
ہمارے زمانۂ تاریخ سے قبل کے اجداد قدرت کے ویسے ہی غلام تھے جیسے اس دنیا میں رہنےوالے دوسرے جانور۔

اپنے اجداد سے ملاقات

لاکھوں سال پہلے جنگلات اور ان کے درخت، جانور اور گھاسیں ہمارے موجودہ جنگلوں اور باغوں سے مختلف تھے۔

ان قدیم زمانے کے جنگلوں میں منہدی، لارل اور میگنولیا کے پودوں کے ساتھ برچ، لائم اور میپل کے بڑے بڑے درخت اگتے تھے۔ انگور کی بیلیں اخروٹ کے درختوں سے لپٹی رہتی تھیں اور بیدمجنوں کے پڑوسی کافور اور عنبر دینےوالے درخت ہوتے تھے۔

بڑے بڑے دیوپیکر درختوں کے سامنے عظیم‌الشان شاہ بلوط بھی بالشتیا معلوم ہوتا تھا۔

اگر ہم آج کے جنگل کو کسی مکان سے تشبیہہ دیں تو اس زمانے کا جنگل فلک‌بوس عمارت کی طرح ہوتا تھا۔

اس ''فلک‌بوس عمارت،، کی سب سے اوپری منزل روشن اور چہل پہل والی ہوتی تھی۔ وہاں بڑے بڑے رنگین پھولوں کے درمیاں، شوخ رنگ کی کلغیوں‌والی چڑیاں ادھر ادھر اڑتی تھیں اور ان کی آوازیں جنگل میں گونجتی تھیں۔ لنگور ادھر ادھر شاخوں سے جھولتے تھے۔

دیکھو، بندروں کا ایک غول شاخوں پر اس طرح دوڑ رہا ہے جیسے وہ کوئی پل پار کر رہا ہو۔ مائیں اپنے بچوں کو زوروں سے سینے سے لگائے ہیں اور ان کے منہ میں چبائے ہوئے پھل اور اخروٹ بھر رہی ہیں۔ وہ بچے جو ذرا بڑے ہیں اپنی ماؤں کے پیر پکڑے ہیں۔ اور اس غول کا جھبرا بڈھا سردار بڑی چستی سے ایک تنے پر چڑھ رہا ہے اور سارا غول اس کے پیچھے ہے۔

یہ بندروں کی کون سی قسم ہے؟ آجکل تم کو یہ چڑیا گھر میں بھی نہیں ملیں گے۔ یہ وہی بندر ہیں جن کی نسل سے آدمی، چمپانزی اور گوریلا کے اجداد پیدا ہوئے۔ ابھی ہماری ملاقات زمانۂ تاریخ سے قبل کے اجداد سے ہوئی۔

تیز دانت‌والے چیتے کے اگلے دانت بالکل خنجر کی طرح ہوتے تھے

وہ سب جنگل کی سب سے اوپروالی منزل پر رہتے تھے۔ وہ زمین سے بہت بلندی پر ایک درخت سے دوسرے درخت تک شاخوں کے ذریعہ سفر کرتے رہتے تھے جیسے یہ شاخیں پل، بالکونیاں اور گزرگاھیں ھوں۔

جنگل ھی ان کا گھر تھا۔ رات کو وہ درختوں کے دوشاخے میں ڈالیوں سے بنے ھوئے بڑے بڑے گھونسلوں میں آرام کرتے تھے۔

جنگل ان کا قلعہ تھا۔ وہ اوپروالی منزل پر اپنے جانی دشمن تیز دانتوں والے چیتے سے پناہ لیتے تھے۔

جنگل ان کا بھنڈار تھا۔ وھاں اوپر کی شاخوں میں وہ اپنا کھانا — پھل اور اخروٹ جمع کرتے تھے۔

لیکن جنگل کی چھت کے نیچے زندگی بسر کرنے کےلئے ان کو ایک شاخ سے جھول کر دوسری شاخ تک جانا سیکھنا پڑتا تھا اور یہ بھی کہ درختوں کے تنوں سے کس طرح اوپر نیچے چڑھا اترا جائے اور ایک درخت سے کود کر دوسرے تک کس طرح پھنچاجائے۔ ان کو پھلوں کو چننا اور اخروٹوں کو توڑنا سیکھنا پڑا۔ ان کی انگلیوں کو چست، آنکھوں کو تیز اور دانتوں کو مضبوط ھونا چاھئے تھا۔

ھمارے اجداد بہت سی زنجیروں سے جنگل سے منسلک تھے اور صرف جنگل ھی سے نہیں بلکہ اوپر چوٹی‌والی منزلوں سے۔ آدمی نے ان زنجیروں کو کس طرح توڑا؟ جنگلی مخلوقات نے کس طرح یہ ھمت کی کہ وہ اپنا پنجرا چھوڑکر اپنے گھر کی سرحدوں سے باھر قدم رکھے؟

دوسرا باب

ہمارے ہیرو کی دادی اور چچیرے رشتے دار

جب پرانے زمانے میں کوئی مصنف آدمی کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں اپنی کہانی شروع کرتا تھا تو وہ عام طور پر اپنی کتاب کے پہلے ہی بابوں میں اپنے ہیرو کے خاندان اور اس کے اجداد کا تفصیلی ذکر کرتا تھا۔

چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد یہ پتہ چل جاتا کہ جب اس کی دادی لڑکی تھی تو کتنے خوبصورت گاؤن پہنتی تھی اور شادی سے پہلے ماں اس دن کے خواب کیسے دیکھا کرتی تھی۔ دنیا میں اس ہیرو کے ظہور، اس کے پہلے دانت، پہلے الفاظ، پہلے قدم اور پہلی شرارتوں کے بارے میں طویل بیان ہوتا تھا۔ دس باب بعد لڑکا گرامر اسکول میں داخل ہوتا تھا اور دوسری جلد کے آخر میں محبت میں مبتلا ہوجاتا تھا۔ تیسری جلد میں وہ بہت سی مہموں اور واقعات کے بعد آخرکار اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تھا اور اس کہانی کا خاتمہ عام طور پر اس طرح ہوتا تھا کہ بزرگ اور بوڑھا ہیرو اور اس کی سفید بالوں والی بیوی اپنے گلاب جیسے گالوں والے پوتے کو پیار سے دیکھ رہے ہیں جو پہلی مرتبہ ڈگمگاکر زمین پر قدم رکھ رہا ہے۔

ہم بھی آپ کو انسان کی زندگی اور اس کے کارناموں کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔ اور پرانے زمانے کے ناول نگاروں کی پیروی کرتے ہوئے ہم اپنے ہیرو کے قدیم آباواجداد، اس کے خاندان اور رشتےداروں، زمین پر اس کے ظہور کے بارے میں اور یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ اس نے چلنا، باتیں کرنا، سوچنا کیسا سیکھا۔ ہم اس کی جد و جہد، خوشی اور غم، فتوحات اور شکستوں کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن ہمیں اعتراف کرنا پڑیگا کہ ابتدا میں ہم اپنے کو بڑی مشکل میں گرفتار پاتے ہیں۔

ہم اپنے ہیرو کی ''جدہ'' کے بارے میں کیسے بیان کریں، اس بوزنہ جدہ کے بارے میں جن کی اولاد ہماری قسم ہے، جب کہ اس جدہ کو ختم ہوئے لاکھوں سال بیت چکے ہیں؟ ہمارے پاس ان کی کوئی تصویر بھی تو نہیں ہے کیونکہ تم تو جانتے

لوگوں نے بندر اور آدمی کے درمیان مشابہت کو زمانہ ہوئے دیکھ لیا تھا ۔ بلکہ اس پرانے زمانے کی ڈرائنگ میں اس مشابہت کو ذرا مبالغے سے بھی دکھایا گیا ہے

ہوگے کہ بوزنے (apes) تصویرکشی نہیں کر سکتے ۔ جیسا کہ پچھلے باب میں کہا جا چکا ہے ہماری ملاقات زمانۂ تاریخ سے قبل والی جدہ سے صرف عجائب گھر میں ہو سکتی ہے ۔ لیکن یہاں بھی یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ اس زمانے میں کیسی لگتی تھیں کیونکہ اب ان کی صرف چند ہڈیاں اور دانت ہی باقی رہ گئے ہیں جو افریقہ، ایشیا اور یورپ کے مختلف حصوں میں پائے گئے ہیں ۔

ہمیں اپنے ہیرو کے ''چچیرے بھائی بہنوں،، سے واقفیت حاصل کرنے کا زیادہ اچھا موقع ہے ۔

جبکہ آدمی مدتوں ہوئے زمانۂ تاریخ سے قبل کے گرم منطقےوالے جنگلات چھوڑ کر پوری طرح زمین پر آباد ہو گیا ہے اس کے رشتےدار گوریلا، چمپانزی، لنگور (gibbon) اور اورانگ اوتان ابھی تک جنگلی جانور ہیں ۔ بعض لوگوں کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ ان کو ایسے ذلیل اور حقیر رشتےداروں کی یاد دلائی جائے ۔ بعض تو اس دور کے رشتے سے بالکل ہی انکار کرتےہیں ۔ اور ایسے بھی لوگ ہیں جو اس بات کی طرف اشارے کو بھی گناہ سمجھتے ہیں کہ آدمی اور چمپانزی کی جدہ ایک ہی ہے ۔

لیکن حقیقت تو ضرور سامنے آئے گی ۔ ہم یہ ساری کتاب اس کے ثبوت سے بھر

سکتے تھے کہ آدمی اور بوزنے میں رشتےداری ہے۔ پھر بھی اس موضوع پر طویل اور الجھے ہوئے بحث ومباحثے کے بغیر اگر کوئی آدمی چڑیاگھر میں جاکر ایک گھنٹہ بھی چمپانزی اور اورانگ‌اوتان کو غور سے دیکھے تو اس کو اس خاندانی مشابہت پر حیرت ہوگی جو آدمی اور ان بوزنوں میں ہے۔

ہمارے رشتےدار رافائل اور روزا

چند سال ہوئے مشہور روسی سائنس‌داں ایوان پاولوف کی لیباریٹری میں جو لینن گراد کے قریب موضع کولتوشی میں (اب یہ گاؤں پاولووا کہلاتا ہے) واقع ہے دو چمپانزی لائے گئے جن کے نام رافائل اور روزا تھے۔

آدمی اپنے بیچارے جنگلی رشتےداروں کے ساتھ زیادہ مہربانی کا برتاؤ نہیں کرتا اور عام طور پر انہیں سیدھا پنجروں میں بند کر دیتا ہے۔ لیکن اس موقع پر افریقہ کے جنگل کے مہمانوں کا گرمجوشی سے خیرمقدم کیا گیا۔ ان کو علحدہ ایک فلیٹ رہنے کے لئے دیا گیا جس میں سونے، کھانے اور کھیلنے کے کمرے اور غسل خانہ تھا۔ ان کے لئے سونے کے کمرے میں آرام‌دہ بستر اور چھوٹی میزیں تھیں۔ کھانے کے کمرے میں میز سفید میزپوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ الماری کے خانے کھانے کی چیزوں سے بھرے تھے۔

اس آرام‌دہ فلیٹ کی کسی بات سے یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ اس کے رہنے والے بوزنے ہیں۔ کھانا ہمیشہ پلیٹوں میں دیا جاتا تھا اور کھانے کے لئے چمچے ہوتے تھے۔ رات کو بستر بچھائے جاتے تھے اور تکیوں کو نرم کر دیا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی مہمان بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے تھے اور پلیٹوں سے پھل کا رس سڑسڑاکر پیتے تھے اور رات کو تکیوں پر سر رکھنے کے بجائے سر پر تکئے رکھ لیتے تھے۔

پھر بھی اگر رافائل اور روزا کے عادات و اطوار انسانوں جیسے نہ تھے تو ان سے قریب تو ضرور تھے۔

مثلاً روزا ایک گھرگرہست عورت کی طرح الماری کی کنجیوں کا گچھا استعمال کرنا جانتی تھی۔ یہ کنجیاں نگران کی جیب میں رہتی تھیں۔ روزا چپکے چپکے پیچھے سے آتی اور اس سے گچھا چھین لے جاتی۔ وہ آنکھ جھپکاتے میں الماری کے پاس پہنچ جاتی، کرسی پر چڑھ کر قفل میں ٹھیک کنجی لگاتی۔ شیشے کے پیچھے مزیدار خوبانیوں کے اوپر انگور کے خوشے دیکھتی۔ کلائی کی ہلکی سی حرکت قفل کو کھول دیتی اور روزا کے ہاتھ میں انگوروں کا ایک خوشہ ہوتا۔

رافائل کھا رہا ہے

رافائل کام کر رہا ہے
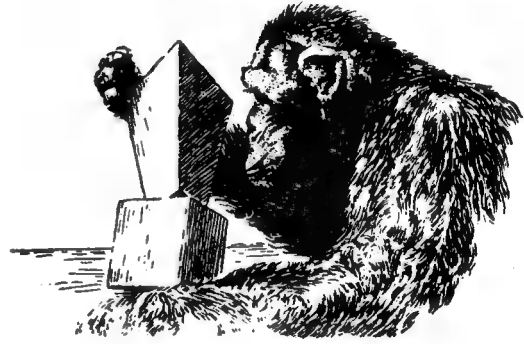
رافائل ڈرائنگ بنا رہا ہے
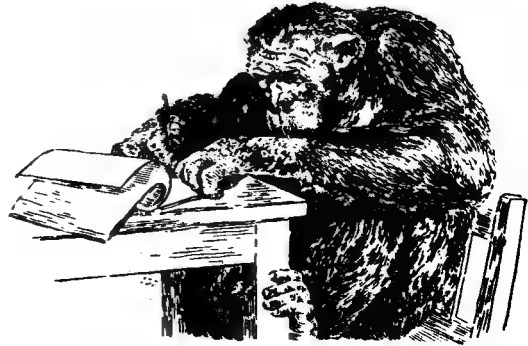
ہمیں رافائل کے بارے میں بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ اس کے سبقوں میں کیا منظر ہوتا تھا! اس کی ٹریننگ کی چیزوں میں خوبانیوں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری اور مختلف سائز کے سات بلاک تھے۔ لیکن یہ ویسے بلاک نہ تھے جن سے بچے کھیلتے ہیں۔ رافائل کے بلاک ان سے کہیں بڑے تھے۔ سب سے بڑا معمولی اسٹول کے برابرتھا اور سب سے چھوٹا ایک نیچی تپائی جیسا۔ خوبانیوں کی ٹوکری چھت میں لٹکا دی جاتی تھی۔ اب رافائل کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا تھا کہ وہ خوبانیوں تک کیسے پہنچے اور ان کو کھائے۔

پہلے تو رافائل اس مسئلے کو نہیں حل کر سکا۔

گھر پر یعنی جنگل میں تو اس کو پھل حاصل کرنے کے لئے بہت اونچے تک چڑھنا پڑتا تھا۔ لیکن یہاں تو پھل کسی شاخ پر نہیں تھے۔ وہ ہوا میں لٹک رہے تھے اور صرف سات بلاکوں کے ذریعہ اوپر چڑھا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر سب سے بڑے بلاک کے اوپر بھی چڑھتا تو وہ خوبانیوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھلوں تک پہنچنے کی کوشش کے دوران بلاکوں کو لڑھکاتے ہوئے رافائل نے یہ دریافت کی کہ اگر وہ ان بلاکوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر چڑھے تو وہ خوبانیوں سے بہت قریب پہنچ جائیگا۔ رفتہ رفتہ، وہ تین بلاکوں کا مینار بنانے میں کامیاب ہوا، پھر چار اور پانچ کا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ وہ ان کو اوپر نیچے جیسے چاہے نہیں لگا سکتا تھا۔ ان بلاکوں کا ایک مقررہ نظام تھا۔ پہلے سب سے بڑا، پھر اس سے کم بڑا اور پھر اسی طرح اور کم بڑے۔

بہت بار رافائل نے چھوٹے بلاکوں کے اوپر بڑے بلاک چنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ڈھیر ہلنے لگا اور گرنے کے قریب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس پورا ڈھیر معہ رافائل کے ایک لمحے میں نیچے آرھیگا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کیونکہ بہرحال وہ بندر تھا اور چست و چالاک اور تیز بھی۔

آخرکار مسئلہ حل ہو گیا۔ رافائل نے سائز کے لحاظ سے ساتوں بلاک اوپر نیچے چن دئے جیسے کہ واقعی ان سے وہ سات نمبر پڑھ لئے ہوں جو ان بلاکوں پر بنے تھے۔

جب وہ ٹوکری تک پہنچ گیا تو اس ہلتے ہوئے مینار پر بیٹھ کر اس نے مزے سے لے کر خوبانیاں کھائیں جو بڑی محنت سے حاصل کی تھیں۔

اور کون جانور ایسا انسانی طریقہ اختیار کر سکتا تھا؟ کیا کوئی کتا بلاکوں کا ایسا مینار بنا سکتا تھا؟ حالانکہ کتا تو بہت سمجھدار جانور ہوتا ہے۔

وہ سب لوگ جو رافائل کو کام کرتے دیکھتے تھے انسان سے اس کی مشابہت پر حیران رہ جاتے تھے۔ وہ بلاک اٹھاتا، اس کو اپنے شانے پر رکھتا اور اس کو

ایک ہاتھ سے سنبھال کر ڈھیر تک لے جاتا۔ لیکن اگر وہ غلط سائز کا بلاک ہوتا تو رافائل اس کو نیچے رکھ دیتا اور اس پر بیٹھ جاتا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ ذرا دیر آرام کرنے کے بعد وہ اپنی غلطی دور کرنے کے لئے پھر کام کرنے لگتا۔

کیا چمپانزی آدمی بن سکتا ہے ؟

لیکن اگر یہ صورت ہے تو کیا چمپانزی کو آدمی کی طرح چلنا، باتیں اور کام کرنا نہیں سکھایا جا سکتا؟

بہت برسوں پہلے جانوروں کے مشہور ٹرینر ولادیمیر دوروف کا خیال تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ انھوں نے اپنے پالتو چمپانزی میمس کو تربیت دینے کی مہینوں کوشش کی۔ میمس بڑا اچھا شاگرد تھا۔ اس‌نے چمچے سے کھانا، تولیہ استعمال کرنا، کرسی پر بیٹھنا، میزپوش پر گرائے بغیر اپنا شوربہ کھانا، حتی کہ برف‌گاڑی میں بیٹھ کر پہاڑی سے نیچے پھسلنا تک سیکھ لیا۔

لیکن وہ کبھی انسان میں نہیں تبدیل ہو سکتا تھا۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ انسان اور بوزنے کے طور و طریقے لاکھوں سال پہلے الگ الگ ہو گئے تھے۔ تاریخ سے پہلے کے دور میں انسان کے اجداد درختوں سے زمین پر اترے اور انھوں نے دو پیروں پر سیدھے کھڑے ہو کر چلنا سیکھا اور اس طرح انھوں نے اپنے ہاتھوں کو کام کے لئے آزاد کیا۔ لیکن چمپانزی
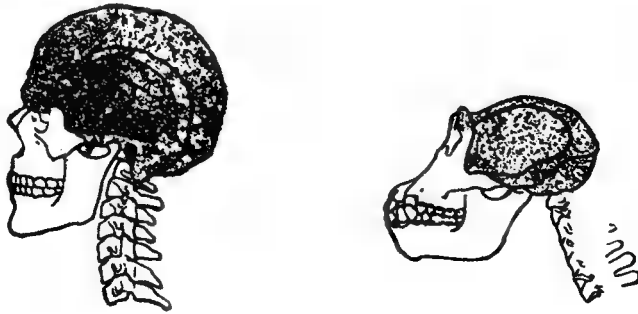
آدمی کا دماغ چمپانزی کے دماغ سے کہیں بڑا ہوتا ہے

کے اجداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے درختوں پر ھی رہے اور وہ پہلے سے زیادہ درختوں پر رہنے کے عادی بنتے گئے۔

اسی لئے چمپانزی کی بناوٹ آدمی جیسی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ، پیر، زبان اور دماغ سب مختلف ھیں۔ کسی چمپانزی کا ھاتھ غور سے دیکھو۔ وہ بالکل انسانی ھاتھ کی طرح نہیں ھوتا ہے۔ چمپانزی کا انگوٹھا اس کی چھنگلیا سے چھوٹا ھوتا ہے، ھماری طرح اس کا انگوٹھا دوسری انگلیوں کے ساتھ زاویہ نہیں بناتا۔ لیکن انگوٹھا ھماری انگلیوں میں سب سے زیادہ اھمیت رکھتا ہے یعنی ان پانچ مزدوروں کی ٹیم میں جس کو ھم ھاتھ کہتے ھیں سب سے ضروری۔ انگوٹھا دوسری چار انگلیوں میں کسی ایک کے ساتھ یا سب کے ساتھ ملکر کام کر سکتا ہے۔ اسی لئے انسانی ھاتھ سب سے زیادہ پیچیدہ آلات و اوزار کو بھی بڑی مہارت سے استعمال کر سکتا ہے۔

جب کوئی چمپانزی کسی درخت سے پھل توڑنا چاھتا ہے تو وہ اکثر شاخ کو اپنے ھاتھوں سے پکڑ لیتا ہے اور پھل کو پیر کے انگوٹھوں سے توڑتا ہے۔ جب چمپانزی زمین پر چلتا ہے تو وہ اپنے ھاتھ کی مڑی ھوئی انگلیوں پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ھوا کہ وہ اکثر اپنے ھاتھوں کو پیروں کی طرح اور پیروں کو ھاتھوں کی طرح استعمال کرتا ہے۔

جانوروں کو سدھانے والے جو چمپانزی کو انسانی حرکات و اطوار سکھانا چاھتے ھیں اکثر بھول جاتے ھیں کہ ھاتھوں اور پیروں کے علاوہ انسان اور چمپانزی میں ایک اور بھی بڑا فرق ہے۔ وہ بھول جاتے ھیں کہ انسان کے مقابلے میں چمپانزی کا دماغ بہت چھوٹا ھوتا ہے اور اسکی ساخت بھی اتنی پیچیدہ نہیں ھوتی جتنی انسان کی دماغ کی۔

ایوان پاولوف نے انسانی دماغ کے مطالعہ پر برسوں صرف کئے۔ ان کو روزا اور رافائل کے طور طریقوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ ”بندر گھر،، میں گھنٹوں رہتے تھے اور ان کا مطالعہ قریب سے کرتے تھے۔ یہ دونوں بندر بالکل ناسمجھی سے کام کرتے تھے۔ وہ کچھ کرنا شروع کرتے اور پھر کسی دوسری طرف متوجہ ھوکر اس کے بارے میں بھول جاتے اور کسی دوسری بات سے دلچسپی لینے لگتے۔

مثلاً رافائل اپنا مینار بنانے میں لگ جاتا اور بہت ھی مصروف لگتا۔ اچانک وہ کوئی گیند دیکھتا اور بلاکوں کے بارے میں بالکل بھول کر اپنے لمبے اور بالدار ھاتھ سے گیند اچھالنے لگتا۔ ایک لمحہ بعد جب اس کو کوئی مکھی فرش پر رینگتی نظر آ جاتی تو وہ گیند کو بھول جاتا۔

اس انتشار کو دیکھ کر پاولوف نے ایک بار کہا تھا:

”اوہ کتنا گڑبڑ ہے، کتنا گڑبڑ!،،

هاں، بوزنوں کی گڑبڑ حرکتیں ان کے دماغ کے پراتنشار فعل کی صحیح طور پر آئینہ‌دار ھیں جو انسانی دماغ کے باقاعدہ اور مرکوز فعل سے بالکل مختلف ھیں۔ پھر بھی چمپانزی میں سمجھ ہوتی ھے۔ وہ جنگل کی زندگی کا بخوبی عادی ھوتا ھے اور اپنی چھوٹی دنیا کی بہت سی نہ نظر آنےوالی زنجیروں کا پابند۔

ایک بار ایک کیمرہ مین اس فلیٹ میں آیا جس میں روزا اور رافائل رھتے تھے۔ وہ ان کی فلم بنانا چاھتا تھا۔ فلم کی کہانی کے مطابق بندروں کو تھوڑی دیر کے لئے باھر چھوڑنا تھا۔ وہ باھر نکلتے ھی قریب‌ترین درخت پر چڑھ گئے اور ان کی شاخوں میں بہت خوش خوش جھولنا شروع کر دیا۔ ان کو آرام‌دہ فلیٹ سے یہ درخت زیادہ گھریلو لگا۔

افریقہ میں چمپانزی جنگل میں سب سے ''اوپری منزل،، پر رھتا ھے۔ وہ اپنی رھائش‌گاہ درخت پر بناتا ھے۔ وہ اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے درخت پر چڑھ جاتا ھے اور درختوں سے وہ اخروٹ اور پھل بھی حاصل کرتا ھے جو اس کی غذا ھیں۔

وہ درخت کی زندگی کا اتنا عادی ھو چکا ھے کہ مسطح زمین پر چلنے کے مقابلے میں درخت کے تنوں پر کہیں زیادہ آسانی سے چڑھ اتر سکتا ھے۔ تم کو چمپانزی ایسی جگہوں پر کہیں نہ ملینگے جہاں جنگل نہیں ھوتے۔

ایک بار ایک سائنس داں افریقہ میں یہ دیکھنے کے لئے کیمرون گیا کہ چمپانزی اپنے قدرتی ماحول میں کیسے رھتے ھیں۔

اس نے تقریباً ایک درجن چمپانزی پکڑ کر اپنے فارم کے قریب جنگل میں چھوڑے تاکہ وہ گھر کی طرح محسوس کریں۔ لیکن پہلے اس نے ایک نہ نظر آنےوالا پنجرا بنوایا تھا، تاکہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ یہ نظر نہ آنےوالا پنجرا دو معمولی اوزاروں یعنی کلہاڑی اور آرے کے ذریعہ بنایا گیا تھا۔

پہلے لکڑھاروں نے جنگل کے ایک چھوٹے سے رقبے کے گرد تمام درخت کاٹ دئے۔ بس میدان کے بیچ میں درختوں کا ایک جھنڈ رہ گیا۔ سائنس داں نے اپنے بوزنوں کو اس جھنڈ میں آزاد چھوڑ دیا۔

اس کا منصوبہ کامیاب رہا کیونکہ بندر تو جنگل کے رھنےوالے ھیں یعنی وہ اپنی مرضی سے جنگل کبھی نہیں چھوڑتے۔ بندر اپنا گھر کھلے میدانوں میں نہیں بنا سکتا جیسے کہ قطبی ریچھ اپنا گھر ریگستان میں نہیں بناتا۔

لیکن اگر چمپانزی جنگل نہیں چھوڑ سکتا تو اس کا دور کا رشتےدار آدمی جنگل کو کیسے چھوڑ سکا۔

ہمارے ہیرو نے چلنا سیکھا

ہمارے زمانۂ تاریخ کے قبل‌والے جنگلی جد کو اپنا پنجرہ توڑنے، آزادی کے ساتھ جنگل چھوڑنے اور استیپی اور بےدرختوں‌والے میدانوں میں اپنا گھر بنانے میں لاکھوں سال لگ گئے۔

درخت پر رہنےوالے جانور کو، اگر وہ ان زنجیروں کو توڑنا چاہتا تھا جو اس کو جنگل کا پابند رکھتی تھیں، درخت سے اترکر زمین پر چلنا سیکھنا ہوتا تھا۔

انسان کے کسی بچے کے لئے ہمارے زمانے تک میں بھی چلنا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ جو کوئی بھی کسی بالک گھر گیا ہے وہ جانتا ہے کہ وہاں ایسی چھوٹی عمر کے بچے ہوتے ہیں جو ''رینگنےوالے،، کہلاتے ہیں۔ یہ ایسے بچے ہوتے ہیں جو ٹھہرنا نہیں چاہتے لیکن چلنا بھی نہیں جانتے۔ ان ''رینگنے والوں،، کو ''چلنےوالا،، بننے کے لئے کئی مہینے سخت کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ذرا سوچو تو انہیں بلاکسی سہارے کے، بلا ہاتھوں سے زمین کو چھوئے، سنبھلنے کے لئے کرسیوں یا بنچوں کا سہارا لئے بغیر چلنا سیکھنا ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنے کو سنبھالنا سائیکل‌سواری سیکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔

لیکن اگر بچے کو چلنا سیکھنے میں کئی مہینے لگتے ہیں تو ہمارے زمانۂ تاریخ سے قبل کے اجداد کو یہ ہنر سیکھنے میں ہزاروں برس لگ گئے تھے۔

اس دورافتادہ زمانے میں وہ مختصر مدت کے لئے درختوں سے اترتے تھے۔ شاید وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں پر نہیں جھکتے تھے بلکہ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہوکر دو تین قدم دوڑتے تھے جیسا کہ چمپانزی کبھی کبھی اب بھی کرتے ہیں۔

بہرحال، دو تین قدم تو پچاس یا سو قدم نہیں ہیں۔

انسان کے پیروں نے ہاتھوں کو کام کے لئے کیسے آزاد کیا

جب ہمارے زمانۂ تاریخ سے قبل کے اجداد درختوں پر رہتے تھے تبھی انھوں‌نے اپنے ہاتھوں کو پیروں سے مختلف کاموں کے لئے استعمال کرنا رفتہ رفتہ سیکھا تھا۔

ہمارے ہیرو نے اپنا پہلا اوزار اٹھایا

وہ پھلوں اور اخروٹوں کو توڑنے اور درختوں کے دو شاخوں میں اپنے گھونسلے بنانے کے لئے ہاتھوں کو استعمال کرنے لگے۔

لیکن جو ہاتھ اخروٹ پکڑ سکتا تھا وہ کوئی ڈنڈا یا پتھر بھی پکڑ سکتا تھا۔ اور ہاتھ میں کسی ڈنڈے یا پتھر کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتھ زیادہ لمبا اور مضبوط ہوگیا۔

پتھر کسی سخت اخروٹ کو توڑ سکتا تھا اور ڈنڈے سے کوئی مزیدار جڑ زمین کے اندر سے کھود کر نکالی جا سکتی تھی۔

اس طرح زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی ان اوزاروں کو اپنی غذا کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے لگا۔ ڈنڈے سے کھود کر وہ جڑیں اور آنڈیاں اوپر کھینچ لیتا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں سے درختوں کے ٹھنٹھ کو ٹھونک ٹھونک کر وہ کیڑوں کے انڈے باہر نکال لیتا تھا۔ پھر بھی اس کے لئے ہاتھوں سے کام لینے کی ایک ہی صورت تھی یعنی ان کو چلنے کے کام میں استعمال سے آزاد کرے۔ اس کے ہاتھ جتنے ہی مصروف ہوتے اتنا ہی زیادہ پیروں کو چلنے کا مسئلہ حل کرنا پڑتا۔

اس طرح اس کے ہاتھ اس کے پیروں کو چلنے پر مجبور کرتے اور اس کے پیر ہاتھوں کو کام کے لئے آزاد کر دیتے۔

اس طرح ایک نئی مخلوق کا دنیا میں وجود ہوا جو اپنے پچھلے پیروں پر چلتی تھی اور ہاتھوں سے کام کرتی تھی۔ صورت شکل میں یہ مخلوق ابھی تک بہت کچھ جانوروں جیسی تھی۔ لیکن اگر تم اس کو ڈنڈا یا پتھر لے کر چلتے دیکھتے تو فوراً کہتے کہ یہ جانور ابتدائی انسانی نسل کا ہے۔ دراصل صرف آدمی ہی اوزاروں کا استعمال جانتا ہے۔ جانوروں کے پاس تو آلات و اوزار نہیں ہوتے۔

جب کوئی پھدکنے والا چوہا یا چھچھوندر اپنی بھٹ کھودتے ہیں تو ان کو

صرف پنجوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ ان کے پاس پھاوڑے تو نہیں ہوتے۔ جب کوئی چوہا کسی لکڑی کو کاٹتا اور کریدتا ہے تو وہ چاقو سے نہیں بلکہ اپنے دانتوں سے ایسا کرتا ہے۔ اور جب کوئی ھدھد درخت کی چھال کو ٹھونگیں مارتا ہے تو وہ اپنی چونچ سے کام لیتا ہے نہ کہ کسی رکھانی سے۔

ہمارے زمانۂتاریخ سے قبل‌والے اجداد کے پاس نہ تو رکھانی جیسی چونچ تھی اور نہ پھاوڑوں جیسے پنجے اور نہ بلیڈ کی طرح تیز درخت۔

لیکن ان کے پاس ایسی چیز تھی جو انتہائی تیز دانتوں اور بہت مضبوط چونچوں سے کہیں بہتر تھی۔ ان کے پاس ہاتھ تھے جن کو وہ زمین‌سے کاٹنے‌والے پتھر اور لمبے چوبی پنجوں کو اٹھانے کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔

ہمارا ہیرو زمین پر اترتا ہے

جب یہ واقعات ہو رہے تھے تو آب و ہوا بھی رفتہ رفتہ بدل رہی تھی۔ ہمارے زمانۂتاریخ سے قبل والے اجداد کے جنگلوں میں راتیں زیادہ ٹھنڈی ہوتی جاتی تھیں اور جاڑوں میں بہت زیادہ سردی پڑنے لگی تھی۔ حالانکہ آب و ہوا اب بھی گرم تھی لیکن اس کو خوب گرم نہیں کہا جا سکتا ہے۔

پہاڑیوں اور پہاڑوں کی شمالی ڈھلوانوں پر رفتہ رفتہ سدا بہار پام، میگنولیا اور لارل کی جگہ بلوط اور لائم لے رہے تھے۔

دریاؤں کے کنارے گہرے پرتوں میں لوگوں کو اکثر بلوط یا لائم کی پتھرائی ہوئی پتیاں ملتی ہیں جو لاکھوں سال پہلے کسی سیلاب میں دریا کے ذریعہ یہاں پہنچی تھیں۔

جنوبی ڈھلوانوں اور نشیبوں میں انجیر کے درخت اور انگور کی بیلیں ٹھنڈی ہواؤں سے محفوظ رہیں۔ گرم خطوں کے جنگلوں کی سرحدیں اور جنوب کی طرف پیچھے ہٹتی گئیں۔ اور ان جنگلوں کے باسی ہاتھی اور خنجر جیسے تیز دانتوں‌والے چیتے بھی جو اب بہت نایاب ہوتے جاتے تھے، جنوب کی طرف پیچھے ہٹ رہے تھے۔

جہاں پہلے جنگلی جھاڑ جھنکاڑ تھے وہاں درختوں نے الگ ہوکر ایسے روشن میدان بنا دئے جہاں دیو قد ہرن اور گینڈے چرتے تھے۔ کچھ بندر بھی جنگل کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹے اور دوسری قسمیں ختم ہو گئیں۔

جنگل میں انگور کی بیلوں کی تعداد گھٹتی گئی، انجیر کے درختوں کو پانا مشکل ہو گیا۔ جنگلوں سے گذرنا اور زیادہ دشوار ہو گیا کیونکہ اب وہ چھدرے ہو گئے

تھے اور ان کے باسیوں کو درختوں کے ایک جھنڈ سے دوسرے جھنڈ تک پہنچنے کے لئے زمین پر چلنا پڑتا تھا۔ درخت پر رہنےوالوں کے لئے یہ آسان کام نہ تھا کیونکہ اس طرح درندوں کا شکار بننے کا زیادہ امکان تھا۔

لیکن وہ مجبور تھے۔ بھوک پیاس ان کو درختوں سے نیچے لاتی تھی۔

ہمارے زمانۂتاریخ سے پہلے کے اجداد غذا کی تلاش میں زمین پر اکثر آنے کے لئےمجبور ہوئے۔

جب انھوں نے اپنا مانوس پنجرہ یعنی جنگل کی دنیا چھوڑی جس کے وہ عادی تھے تو کیا ہوا؟

انھوں نے جنگل کے قوانین کو توڑ دیا۔ انھوں نے وہ زنجیریں توڑ دیں جن سے ہر جانور نظام قدرت میں ایک جگہ کا پابند ہوتا ہے۔

ہم جانتے ھیں کہ جانور اور پرندے بدلتے رہتے ھیں۔ قدرت میں کوئی بھی چیز یکساں نہیں رہتی۔ لیکن یہ تبدیلی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک چھوٹے جنگلی جانور کو جس کے تیز پنجے تھے آج کا گھوڑا بننے میں لاکھوں سال لگ گئے۔ ہر جانور بچپن میں اپنے والدین سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔ بلکہ کوئی فرق مشکل سے ہوتا ہے۔ جانور کی کسی نئی قسم کے ارتقا میں ہزاروں نسلیں گذر گئیں، ایسی قسم میں تبدیلی کے لئے جو اپنے اجداد سے بالکل مختلف تھی۔

اور ھمارے زمانۂتاریخ سے قبل کے اجداد کا کیا حال ہوا؟

اگر وہ اپنی عادات و اطوار نہ بدل سکتے تو ان کو بھی بندر کے ساتھ جنوب کی طرف ھٹنا پڑتا۔ لیکن وہ بندروں سے مختلف تھے کیونکہ اب وہ جان گئے تھے کہ پتھروں اور لکڑی کے دانتوں اور پنجوں سے کس طرح غذا حاصل کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے یہ سیکھ لیا تھا کہ رس دار جنوبی پھلوں کے بغیر، جو جنگلوں میں کمیاب ہوتے جاتے تھے، کیسے رہا جائے۔ ان کو اس بات سے پریشانی نہ تھی کہ جنگل چھدرے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ انھوں نے زمین پر چلنا سیکھ لیا تھا اور کھلی اور بے درخت جگہوں سے ڈرتے نہیں تھے۔ اور اگر کوئی دشمن ان کے راستے میں آتا تھا تو بندر مانس کا سارا غول ڈنڈوں اور پتھروں سے اپنی حفاظت کرتا تھا۔

جب سخت دور آیا تو اس نے بندر مانس کو نہ تو ختم کیا اور نہ ان کو جنوبی جنگلوں کے ساتھ پیچھے ھٹنے پر مجبور کر سکا۔ صرف اس نے بندرمانس کے آدمی بننے کی رفتار تیز کردی۔

اور ھمارے دور کے رشتےدار بندروں کا کیا حشر ہوا؟

وہ جنوبی جنگلوں کے ساتھ پیچھے ھٹے اور سدا کے لئے جنگل کے باسی بنے رہے۔ دراصل ان کے سامنے کوئی دوسرا راستہ ھی نہ تھا۔ وہ ھمارے اجداد سے ارتقائی

مدارج میں پیچھے رہ گئے تھے اور انھوں نے اوزاروں کا استعمال ہی نہیں سیکھا تھا۔ اس کے بجائے انتہائی چست و چالاک بندروں نے درختوں پر چڑھنا اور شاخوں سے جھولنا پہلے سے بہتر سیکھ لیا تھا۔
جو بندر درختوں پر چڑھنے میں کم مہارت رکھتے تھے اور درختوں کی زندگی کے عادی نہیں بن سکے تھے ان میں سے صرف سب سے بڑے اور طاقتور بندر بچ گئے۔ مگر بندر جتنا ہی زیادہ بھاری اور بڑا ہوتا اتنا ہی زیادہ اس کو درخت پر کی زندگی مشکل معلوم ہوتی۔ اس لئے ان بڑے بڑے بندروں کو مجبوراً درختوں سے اترنا پڑا۔ گوریلا اب بھی جنگل میں زمین والی منزل پر رہتے ہیں۔ ان کے ہتیار نہ تو ڈنڈے ہیں اور نہ پتھر بلکہ وہ بڑے دانت ہیں جو ان کے طاقتور جبڑوں سے باھر نکلے ہوتے ہیں۔
اس طرح آدمی اور اس کے دور کے رشتےداروں میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہو گئی۔

گمشدہ کڑی

آدمی نے دونوں پیروں پر چلنا یکدم نہیں سیکھ لیا۔ پہلے تو وہ لڑکھڑا کر چلتا تھا۔
پہلا آدمی یا یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ بندر مانس کیسا لگتا تھا؟
کرۂ ارض پر بندر مانس کہیں نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن کیا اس کی ھڈیاں بھی کہیں نہیں ملتی ہیں ؟
اگر یہ ھڈیاں مل جائیں تو یہ اس کا حتمی ثبوت ہوگا کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ کیونکہ بندر مانس قدیم‌ترین آدمی تھا، اس زنجیر کی اہم کڑی جو بندروں سے شروع ہوتی ہے اور جدید انسان پر ختم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ اہم کڑی کہیں دریا کے کناروں کی پرتوں میں، مٹی اور ریت کی تہوں میں لاپتہ ہو گئی ہے۔
ماھرین آثار قدیمہ زمین کی کھدائی میں ماھر ہوتے ہیں۔ کھدائی شروع کرنے سے پہلے ان کو وہ جگہ طے کرنا چاہئے جہاں اہم کڑی کی تلاش کرنی ہے۔ کسی چیز کی کھوج ساری دنیا میں کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور قدیم آدمی کی ھڈیاں زمین میں اس طرح چھپی ہیں جیسے کسی گھاس کے ڈھیر میں سوئی۔
انیسویں صدی کے آخر میں ایک جرمن ماھر حیاتیات ایرنسٹ ہیکل نے یہ مفروضہ پیش کیا کہ بندر مانس (جیسا کہ سائنس‌داں اس کو کہتے pithecanthropus

دریائے بینگاوان کے کنارے pithecanthropus کی ہڈیاں پائی گئیں

ہیں) کی ہڈیاں کہیں جنوبی ایشیا میں مل سکتی ہیں۔ اس نے دراصل وہ ٹھیک ٹھیک جگہ بھی بتا دی جہاں اس کے خیال میں یہ ہڈیاں محفوظ ہیں۔ یہ سنڈا کے جزیرے تھے۔

بہت سے لوگ اس سے متفق نہیں تھے لیکن اس کے نظرئیے کو بھلایا نہیں گیا۔ خاص طور سے ایک آدمی تو اس سے اتنا متاثر تھا کہ وہ اپنا سارا کام کاج ترک کرکے جزائر سنڈا کو روانہ ہو گیا تاکہ وہ مفروضہ pithecanthropus کی مفروضہ باقیات تلاش کرے۔

یہ آدمی ایمسٹرڈم یونیورسٹی میں تشریح اعضا کے علم کا لکچرر تھا اور اس کا نام ڈاکٹر ایوگینی ڈیوبؤا تھا۔

ان کے بہت سے ساتھی اور پروفیسر حیرت سے سر ہلاتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی معقول آدمی اس بےمقصد تگ‌ودو میں نہیں پڑ سکتا۔ ان انتہائی معزز ہستیوں کا آنا جانا صرف ایمسٹرڈم کی خاموش سڑکوں سے یونیورسٹی تک محدود تھا۔

اپنے جرأت آمیز منصوبے کے لئے کام کرنے کی غرض سے ڈاکٹر ڈیوبؤا کو یونیورسٹی کی ملازمت ترک کرنی پڑی۔ یہ فوج میں بھرتی ہوکر سماترا روانہ ہو گئے جہاں ان کو ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔

جزیرۂسماترا میں قیام کے دوران انھوں نے اپنا سارا وقت اس تلاش کے لئے وقف کر دیا۔ ان کی زیر نگرانی مزدوروں نے کھدائی کرکے مٹی کے پہاڑ بنا دئے۔ ایک، دو اور تین مہینے گذر گئے لیکن pithecanthropus کی ھڈیوں سے مشابہ کوئی چیز نہ ملی۔

اگر آدمی کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کرتا ہے تو وہ کم از کم یہ جانتا ہے کہ وہ وھیں کہیں ہے اور اگر وہ اس کی تلاش توجہ سے کرے تو مل جائے گی۔ لیکن ڈیوبؤا کی صورت حال اس سے کہیں بری تھی۔ یہ محض قیاس تھا اور وہ قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ایسی باقیات کا واقعی وجود ہے۔ پھر بھی انھوں نے استقلال کے ساتھ تلاش جاری رکھی۔ ایک، دو، تین سال گذر گئے لیکن ''گم شدہ کڑی،، کہیں نہ ملی۔

ان کی جگہ پر کوئی اور ہوتا تو سارے خیال کو حماقت جان کر ترک کر دیتا لیکن ڈاکٹر ڈیوبؤا کسی چیز کو ادھورا چھوڑنےوالے نہیں تھے۔

جب ان کو یقین ہو گیا کہ بندر مانس کی باقیات ان کو سماترا میں نہیں مل سکتیں تو انھوں نے جزیرۂ جاوا میں ان کو کھوجنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہاں ان کو آخرکار کامیابی ہوئی۔
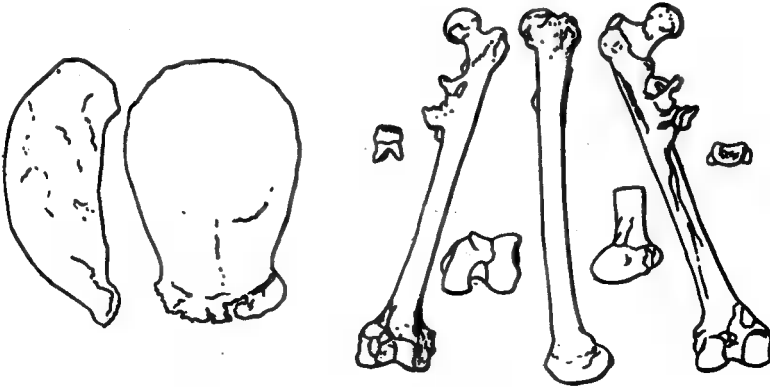
pithecanthropus کی ھڈیاں

ڈیوبؤا کو یہاں دریائے سولو کے کنارے ترینیل گاؤں کے قریب pithecanthropus کی ہڈیاں ملیں۔ ان میں ایک ران کی ہڈی، کھوپڑی کا اوپری حصہ اور کئی دانت تھے۔ بعد کو ران کی ہڈیوں کے کئی اور ٹکڑے بھی یہیں قریب ملے۔

ڈیوبؤا نے اپنے زمانۂ تاریخ سے پہلے کے جد کی کھوپڑی کو غور سے دیکھتے ہوئے یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ وہ کیسا ہوگا۔ بندر مانس کی پیشانی نیچی اور چپٹی تھی جس میں آنکھوں کے اوپر ایک موٹی ہڈی ابھری تھی۔ چہرہ انسان سے زیادہ بندر سے مشابہ تھا۔ لیکن کھوپڑی کے گہرے مطالعہ نے ڈیوبؤا کو یہ یقین دلا دیا کہ pithecanthropus بندر سے کہیں زیادہ ذہین تھا کیونکہ اس کا دماغ بندر سے کہیں بڑا تھا۔

دراصل کھوپڑی کا اوپری حصہ، دانت اور ایک ران کی ہڈی ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے آگے بڑھا جا سکے۔ پھر بھی گہرے مطالعہ کے ذریعہ ڈیوبؤا نے بندر مانس کی زندگی کے بہت سے واقعات کا جوڑ توڑ کر لیا۔ اس طرح ران کی ہڈی نے یہ دکھایا کہ وہ اپنے خمیدہ پیروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر چل لیتا تھا۔

ڈیوبؤا نے تصور کیا کہ جیسے وہ بندر مانس کو جنگل کی ایک کھلی جگہ سے گذرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اس کا بدن جھک کر دوہرا ہو رہا ہے، اس کے شانے بھی جھکے ہیں اور اس کے لمبے ہاتھ زمین کو چھو رہے ہیں۔ بھوؤں کی بھاری ابھری ہڈی کے نیچے آنکھیں زمین پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ سے کوئی کھانے والی چیز چوک جائے۔

غالباً pithecanthropus اس طرح کا ہوتا تھا۔ وہ آدمی تو نہیں تھا لیکن بندر بھی نہیں رہا تھا

وہ اب بندر نہیں تھا لیکن فی الحال آدمی بھی نہیں ہوا تھا۔ ڈیوبؤا نے اس بندر مانس کا نام pithecanthropus erectus رکھا کیونکہ دوسرے بندروں کے مقابلے میں وہ زیادہ سیدھا چلتا تھا۔

تم شاید یہ سمجھ لو کہ ڈیوبؤا اپنی آخری منزل تک پہنچ گئے؟ آخرکار پراسرار pithecanthropus کو دریافت کر لیا گیا! لیکن اس کے بعد ڈیوبؤا کی زندگی کے انتہائی سخت دن و سال آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ زمین کی موٹی تہوں کو کھودنا انسانی تعصبات کی گہرائیوں کو چاک کرنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔

ایوگینی ڈیوبؤا کی دریافت پر ہر طرف سے غصے اور مضحکے کا اظہار کیا گیا کیونکہ بہت سے لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے کہ انسان اور بندر میں زمانۂ تاریخ سے قبل کے اجداد مشترک ہیں۔ چرچ اور اس کے پیروؤں کا کہنا تھا کہ ڈیوبؤا نے جو کھوپڑی پائی ہے وہ کسی لنگور کی ہے اور ران کی ہڈی آدمی کی ہے۔ ڈیوبؤا کے دشمنوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ وہ جاوا کے بندر مانس کو بندر اور آدمی کا مرکب ثابت کرتے بلکہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ڈھانچے کی جو ہڈیاں ڈیوبؤا کو ملی ہیں وہ حال کی ہیں اور صرف چند سال ہوئے زمین میں دفن ہوئی تھیں اور ڈیوبؤا کے اس دعوے کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ ہزارہا سال پرانی ہیں۔ انھوں نے pithecanthropus کو پھر دفن کرنے، اس کو مٹی میں پھر دبانے اور اس کو بھلانے کی کوشش کی۔

ڈیوبؤا نے اپنی دریافت کی ہمت کے ساتھ تصدیق کی اور وہ سب لوگ جو سائنس کے لئے اس کی اہمیت کو سمجھتے تھے ان کی طرف تھے۔

اپنے مخالفین سے بحث میں ڈیوبؤا نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ کھوپڑی کسی طرح بھی gibbon کی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے پیشانی نہیں ہوتی اور pithecantropus کے ہوتی ہے۔

زمانہ گذر گیا لیکن pithecanthropus پھر بھی انسانی خاندان سے الگ ہی رکھا گیا۔

اچانک سائنس‌دانوں نے ایک نیا بندرمانس دریافت کیا جو pithecanthropus سے بہت مشابہہ تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایک یورپی سائنس‌داں چین کے شہر پیکنگ میں ایک دیسی دواخانے میں پہنچ گیا۔ وہاں جو انوکھی چیزیں رکھی تھیں ان میں ژین شین کی شفابخش جڑ، مختلف تعویذ، جانوروں کی ہڈیاں اور دانت تھے۔ جانوروں کے دانتوں میں اس نے ایک دانت ایسا بھی دیکھا جو وہاں بالکل بے جوڑ تھا کیونکہ وہ کسی معروف جانور کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی اس میں انسانی دانت کا شائبہ تھا۔

سائنس‌داں نے یہ دانت خرید کر یورپ کے ایک میوزیم کو بھیج دیا۔ اس کو وہاں ''چینی دانت'' کا عام سا نام دے دیا گیا۔
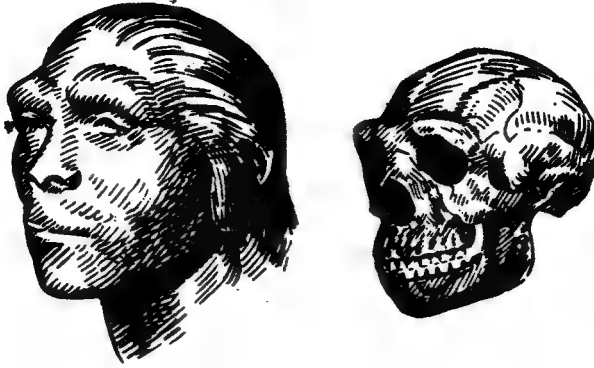
علم الانسان کے ماہروں نے ایک پتھرائی ہوئی کھوپڑی سے
sinanthropus کی شکل و صورت بحال کی

اس کو ۲۰ سال سے زیادہ گذر گئے۔ پھر پیکنگ کے قریب چوکوتیان کے غار میں اسی طرح کے دو دانت اور پائے گئے اور پھر وہ بھی جس کے یہ دانت تھے۔ سائنس‌دانوں نے اس کو sinanthropus کا نام دیا۔

اس کا مکمل ڈھانچہ کبھی نہیں ملا۔ نئی دریافتوں میں تقریباً پچاس دانت، تین کھوپڑیاں ، گیارہ جبڑوں کے ٹکڑے، ران کی ہڈی کا ایک حصہ، ایک ریڑھ کی ہڈی، ایک ہنسلی، ایک کلائی اور پیر کا ایک ٹکڑا پائے گئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غاروں میں رہنےوالوں کے تین سر اور ایک پیر ہوا کرتا تھا۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ چوکوتیان کے غار میں بندر نما آدمیوں کا ایک بڑا گروہ رہتا تھا۔ لاکھوں سال کے دوران بہت سی ہڈیاں غائب ہو گئی ہیں۔ لیکن جو ٹکڑے ملے ہیں وہ ان غار کے رہنےوالوں کی تشکیل کے لئے کافی ہیں۔ سائنس‌داں کو اگر ایک انگلی مل جائے تو وہ پورے جسم کو دریافت کرلیگا۔

ہمارا یہ دوردراز دور کا ہیرو دیکھنے میں کیسا تھا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ذرا بھی خوبصورت نہ تھا ۔ اگر تم اس کو اچانک دیکھ لیتے تو سہم جاتے کیونکہ اس آدمی کی چپٹی پیشانی، باہر کی طرف نکلا ہوا لمبوترا چہرہ اور بالدار بازو تھے اور وہ اب بھی بہت کچھ بندر کی طرح تھا۔ دوسری طرف ایک منٹ یہ تصور کرنے کے بعد کہ وہ بندر تھا تم فوراً اپنا خیال بدل دیتے کیونکہ کوئی بندر آدمی کی طرح سیدھا نہیں چلتا اور کسی بندر کا چہرہ آدمی سے اتنا مشابہہ نہیں ہے۔

اگر تم بندر نما آدمی کا تعاقب اس کے غار تک کرو تو سارے شبہات دور ہو جائینگے۔

وہ اپنے مڑے ہوئے پیروں پر لڑکھڑاتا دریا کے کنارے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اچانک وہ بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو ایک بڑے پتھر سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس کو اٹھاتا ہے، غور سے دیکھتا ہے اور دوسرے پتھر پر زور سے مارتا ہے۔ اب وہ اٹھکر اپنی نئی دریافت کے ساتھ پھر لڑکھڑاتا ہوا روانہ ہو جاتا ہے۔ آخرکار وہ دریا کے کنارے ایک ڈھلوان اونچائی پر پہنچتا ہے۔ وہاں ایک غار کے دھانے پر اس کا قبیلہ جمع ہے۔ وہ سب ایک جھبرے، داڑھی‌والے بڈھے کے چاروں طرف جمع ھیں جو اپنے پتھر کے اوزار سے ایک ھرن کو کاٹ رہا ہے۔ عورتیں کچے گوشت
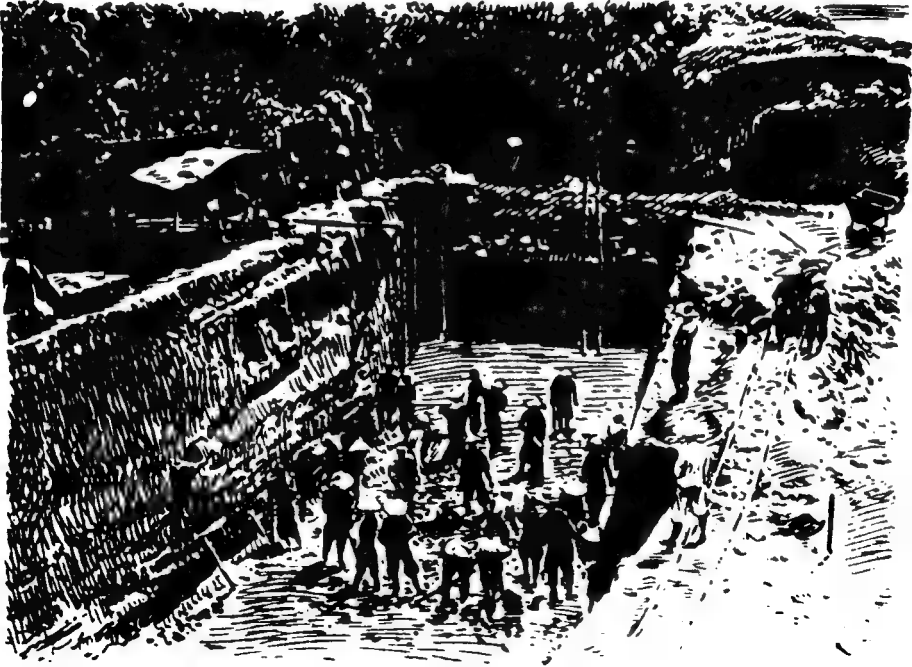
جاوا میں ماہرین آثار قدیمہ کھدائی کر کے pithecanthropus کی ھڈیاں تلاش کر رہے ھیں

چوکوتیان کا غار

تو اپنے ہاتھوں سے پھاڑ رہی ہیں۔ بچے دوڑ دوڑ کر گوشت کے ٹکڑے مانگ رہے ہیں۔ غار کی گہرائیوں میں جلتی ہوئی آگ کی روشنی آ رہی ہے۔

آخری شبہات بھی دور ہو جاتے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا بھی بندر ہے جو آگ جلا سکے اور پتھروں سے اوزار تیار کر سکے۔ لیکن تم پوچھ سکتے ہو کہ ہمیں کیسے معلوم ہوا کہ بندر نما آدمی پتھروں سے اوزار بناتا تھا اور آگ کا استعمال جانتا تھا؟

چوکوتیان کے غار نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ ان قدیم آدمیوں کی باقیات کا جو ذخیرہ برآمد ہوا ہے اس میں دو ہزار سے زیادہ پتھر کے اوزار اور کوئی سات میٹر موٹی مٹی میں ملی راکھ کی تہہ بھی پائی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ بندر نما آدمی اس غار میں برسہا برس تک رہے اور وہاں آگ دن رات جلتی تھی۔ وہ آگ بنانا نہیں جانتے تھے لیکن وہ اس کو بھی اسی طرح ''اکٹھا'' کر لیتے تھے جیسے کھانے کے لئے جڑی بوٹیاں اور اوزاروں کے لئے پتھر جمع کرتے تھے۔

کسی جنگل میں آگ لگنے کے بعد آگ مل جاتی تھی۔ تاریخ سے قبل کا انسان کوئی جلتا کوئلہ اٹھا لیتا اور اس کو بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی جائے رہائش تک لے جاتا۔ یہاں غار میں بارش اور ہوا سے محفوظ وہ اس آگ کی حفاظت ایک بیش بہا خزانے کی طرح کرتا۔

تیسرا باب

انسان قواعد کو توڑتا ہے

ہمارے ہیرو نے ڈنڈوں اور پتھروں کا استعمال سیکھ لیا۔ اب وہ زیادہ مضبوط اور آزاد ہو گیا۔ اب اگر قریب میں کوئی پھل یا میوے کا درخت نہ ہوتا تو اس کو پریشانی نہ ہوتی۔ وہ اپنی جائے رہائش سے غذا کی تلاش میں اور زیادہ دور تک جاتا، جنگل کی ایک چھوٹی دنیا سے دوسری کو، زیادہ طویل وقت تک کھلے میدانوں میں رہتا، تمام قواعد کو توڑتا اور وہ چیزیں کھاتا جو اس نے پہلے کھانے کی ہمت نہیں کی تھی۔

اس طرح انسان نے ابتدا سے ہی قوانین قدرت کو توڑنا شروع کیا۔ درختوں کا باسی اتر کر زمین پر گھومنے لگا۔ اس نے دو پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر چلنا شروع کیا، ایسی چیزیں کھانا شروع کیں جو اس کے لئے نہیں تھیں، ایسے ذرائع سے غذا حاصل کرنے لگا جو قدرتی نہیں تھے۔

دنیا میں تمام جانور اور پودے ایک دوسرے پر منحصر ہیں کیونکہ وہ آپس میں ''غذائی سلسلوں'' کے ذریعہ منسلک ہیں۔ جنگلوں میں گلہریاں صنوبر کے پھل کھاتی ہیں اور مارٹین (martens) گلہریوں کو کھا جاتے ہیں۔ اس طرح ایک سلسلہ ہے۔ صنوبر کے پھل — گلہریاں — مارٹین۔ لیکن گلہریاں صرف صنوبر کے پھل ہی نہیں کھاتیں۔ وہ سانپ چھتریاں اور دوسرے گری‌دار پھل بھی کھاتی ہیں۔ اور مارٹین بھی ایسا جانور نہیں ہے جو صرف گلہریوں کا شکار کرتا ہو۔ دوسرے جانور اور پرندے بھی ایسے ہیں مثلاً شکرہ جو گلہری کا شکار کرتے ہیں۔ اس طرح دوسرا سلسلہ بنتا ہے: سانپ چھتریاں اور گری‌دار پھل — گلہریاں — شکرہ۔ جنگل کے سارے باسی ان سلسلوں کی کڑیاں ہیں۔

اپنی جنگل کی دنیا میں ہمارا ہیرو بھی ایک ''غذائی سلسلے'' کی کڑی تھا۔ وہ پھل اور میوے کھاتا تھا اور ساتھ ہی تیز دانتوں والا چیتا اس کا شکار بھی کرتا تھا۔

پھر اچانک ہمارے ہیرو نے ان زنجیروں کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس نے ایسی چیزیں کھانا شروع کر دیں جو پہلے کبھی نہیں کھائی تھیں۔ اس نے تیز دانت‌والے

چیتے اور ایسے دوسرے جنگلی درندوں سے بچنا شروع کر دیا جو ہزاروں لاکھوں سال سے اس کے اجداد کا شکار کر رہے تھے۔

وہ اتنا بہادر کیسے بن گیا؟ اس کو زمین پر اترنے کی ہمت کیسے ہوئی جہاں تیز دانتوں والے خونخوار درندے اس کی گھات میں رہتے تھے؟ یہ تو بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی چڑیا درخت سے اتر کر اس وقت زمین پر پھدکنے لگے جب بلی اس کے انتظار میں نیچے بیٹھی ہو۔

انسان کی یہ نئی ہمت اس کے ہاتھ تھے۔ جو پتھر وہ اپنے ہاتھ میں پکڑتا تھا اور جو لکڑی وہ جڑیں کھودنے کے لئے استعمال کرتا تھا اس کے ہتیار تھے۔ آدمی کے اولیں اوزار ہی اس کے ہتیار بن گئے۔

پھر آدمی جنگلوں میں تنہا کبھی نہیں پھرتا تھا۔

آدمیوں کا پورا کا پورا گلہ اس جانور پر پل پڑتا جو ان پر حملہ کرتا اور اپنے نئے ہتھیاروں سے اس کو مار بھگاتا۔

ہمیں آگ کے بارے میں بھی نہ بھولنا چاہئے۔ آگ کو اپنا معاون بنا کر انسان انتہائی خوفناک جانوروں کو بھی بھگا دیتا تھا۔

انسانی ہاتھوں کے چھوڑے ہوئے نشان

درخت سے زمین پر، جنگل سے دریائی وادیوں تک، اس طرح زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی سفر کرنے لگا جب اس نے اپنی وہ زنجیر قطعی طور پر توڑ دی جس نے اس کو درخت کا پابند کر رکھا تھا۔

ہمیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس نے دریائی وادیوں کا رخ کیا؟ ایسے نشانات ہیں جو ہم کو اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں۔

لیکن یہ نشانات محفوظ کیسے رہ سکے؟

یہ عام قسم کے نشانات نہیں ہیں جن کو ''نشان قدم،، کہتے ہیں۔ یہ انسانی ہاتھوں کے چھوڑے ہوئے نشان ہیں۔

کوئی ایک صدی ہوئے فرانس کے دریا سوما کی وادی میں مزدور ریت اور کنکر کھود رہے تھے۔

بہت زمانہ گزرے جب یہ دریا بالکل نوخیز تھا اور اپنا راستہ زمین پر بنا رہا تھا۔ اس وقت یہ ایسا طوفانی تھا کہ اپنے ساتھ بڑی بڑی چٹانیں بہالاتا تھا۔ بہاؤ کے دوران چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور ایک دوسرے کو گھس دیتیں اور

اس عمل میں وہ گول، چکنی اور چھوٹی ھوجاتیں۔ بعد کی منزل میں جب دریا زیادہ پرسکون اور سست‌رفتار ھوگیا تو اس نے ان پتھروں کو ریت اور مٹی کی تہہ سے ڈھک دیا۔

یہی ریت اور مٹی کھودکر مزدور نیچے کے پتھر نکال رہے تھے۔ اچانک انھوں نے ایک انوکھی بات دیکھی۔ سارے کے سارے پتھر چکنے اور گول نہیں تھے۔ وہ ناھموار تھے اور ایسا معلوم ھوتا تھا جیسے دونوں طرف سے ان کو تراشا گیا ھے۔ ان کو اس شکل کا کس نے بنایا؟ دریا سے تو ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ تو پتھروں کو چکنا اور گول ھی بنا سکتا ھے۔

ان انوکھے پتھروں کو ایک مقامی سائنس‌داں بوشے دی پیرت نے دیکھا۔ بوشے کے پاس ایسی دلچسپ چیزوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو انھوں نے وادیٔ سوما کی مٹی میں پائی تھیں۔ انمیں قدیم‌ھاتھی (mammoth) کے بڑے بڑے دانت، گینڈے کی سینگیں اور غار میں رہنےوالے ریچھوں کی کھوپڑیاں تھیں۔ کسی زمانے میں یہ تمام دھشتناک جانور اسی طرح دریائے سوما میں پانی پینے آتے تھے جس طرح آجکل گائیں اور بھیڑیں آتی ھیں۔

لیکن زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی کہاں تھا؟ بوشے دی پیرت کو اس کی ھڈیوں کا کوئی نشان نہیں ملا۔

صرف آدمی ھی کے ھاتھ ان پتھروں کو کاٹ چھانٹ کر شکل و صورت دے سکتے ھیں۔ یہاں شکاری برچھے کا اوپری نوکیلا حصہ، رندا اور بسولی ھیں

پھر انھوں نے وہ کٹے ہوئے عجیب پتھر دیکھے جو ریت میں پائے گئے تھے۔ ان کو دونوں طرف کون کاٹ سکتا تھا؟ انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ صرف انسانی ہاتھوں کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

آثارقدیمہ کے اس شوقین ماہر نے ان دریافتوں کا بڑے جوش سے جائزہ لیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کی پتھرائی ہوئی باقیات نہ تھیں۔ لیکن یہ ایسے نشانات ضرور تھے جو اس نے چھوڑے تھے، یہ اس کی محنت کے نشانات تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ دریا کا کام نہیں ہے بلکہ انسان کا کام ہے۔

بوشے دی پیرت نے اپنی دریافتوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ ان کی کتاب کا نام تھا ''جانداروں کی ابتدا اور ارتقا''۔

اور پھر کشمکش شروع ہوگئی۔ ان کے اوپر ہر طرف سے حملہ شروع ہوگیا جیسا کہ بعد میں ڈیوبؤا کے ساتھ ہوا تھا۔

اس زمانے کے بڑے بڑے ماہرین آثار قدیمہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پرانی چیزوں کا یہ صوبائی ماہر سائنس سے ذرا بھی واقف نہیں ہے، کہ اس کی پتھر کی ''کلہاڑیاں'' جعلی ہیں اور اس کتاب کو ممنوع قرار دینا چاہئے کیونکہ یہ انسان کی تخلیق کے بارے میں کلیسائی تعلیم کے خلاف ہے۔

پندرہ سال تک یہ لڑائی جاری رہی۔

بوشےدی‌پیرت سفید بالوں‌والے بڈھے ہوگئے لیکن وہ اپنے نظریات کے لئے لڑتے رہے اور نسل انسانی کی بڑی قدامت کو ثابت کرتے رہے۔ اپنی پہلی کتاب کی اشاعت کے بعد جلد ہی انھوں نے دوسری اور تیسری کتابیں لکھیں۔

اگرچہ طاقتیں نابرابر تھیں پھربھی بوشے دی پیرت کی جیت ہوئی۔ برطانیہ کے ممتازترین ماہرین ارضیات چارلس لائل اور جوزیف پریستوِیچ نے بوشےدی پیرت کے نظرئے کی علانیہ حمایت کی۔ دونوں وادیٔ سوما گئے اور انھوں نے وہاں کھدائی کی جگہ کو دیکھا۔ انھوں نے بوشےدی پیرت کے مجموعے کا گہرا جائزہ لینے کے بعد اعلان کیا کہ بوشےدی پیرت نے جو اوزار پائے ہیں وہ واقعی زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کے تھے۔ یہ آدمی ان بہت بڑے بڑے ہاتھیوں اور گینڈوں کا ہم‌عصر تھا جو اب فرانس اور یورپ سے معدوم ہو چکے ہیں۔

چارلس لائل نے اپنی کتاب ''انسان کی قدامت'' ''The Antiquity of Man'' میں جو ۱۸۶۳ء میں شایع ہوئی بوشےدی پیرت کے مخالفین کی تمام دلیلوں کا فیصلہ‌کن جواب دیا۔ تب ان لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ بوشےدی پیرت نے دراصل کوئی نئی دریافت نہیں کی ہے کیونکہ زمانۂ تاریخ سے قبل کے اوزار اس سے پہلے بھی کئی جگہ دریافت کئے جا چکے ہیں۔

لائل نے اس کا بڑا کھرا جواب دیا - انھوں نے کہا کہ جب بھی سائنس کی کوئی اہم دریافت ہوتی ہے، اس کو لامذہبی کہنے کےلئے آوازیں بلند ہوتی ہیں، حالانکہ بعد کو یہی آوازیں یہ دعوی کرتی ہیں کہ یہ بات تو سبھی لوگ مدتوں سے جانتے تھے -
بوشے دی پیرت نے جیسے پتھر وادیٔ سوما میں پائے تھے اب دنیا کے مختلف حصوں میں پائے گئے ہیں - عام طور پر یہ دریافتیں دریا کی ان پرانی تہوں میں ہوئی ہیں جہاں کنکر اور پتھر وغیرہ کی کھدائی ہوتی ہے -
اس طرح جدید دور کے آدمی کا پھاوڑا زمین سے زمانۂتاریخ سے قبل کے اوزار نکالتا ہے جب کہ انسان نے ابھی کام کرنا سیکھنا شروع کیا تھا -
سب سے پرانا پتھر کا اوزار وہ پتھر ہے جو دونوں طرف سے کسی دوسرے پتھر سے کاٹا گیا تھا - قریب ہی میں ایسے چھوٹے پتھر ملتے ہیں جو بڑے پتھر سے کاٹے گئے تھے -
پتھر کے یہ اوزار انسانی ہاتھوں کے وہ نشانات ہیں جو دریاؤں کی وادیوں اور ریت کے ٹیلوں تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں - یہاں زمین کے اندر اور اتھلے پانی میں آدمی ان چیزوں کی تلاش کرتا تھا جن سے وہ اپنے پتھریلے پنجے اور دانت بناتا تھا -
یہ انسان کا کام تھا - کوئی جانور یا پرندہ اپنی غذا کی تلاش کر سکتا ہے یا اپنا گھونسلا بنانے کےلئے ضروری چیزیں تلاش کر سکتا ہے - لیکن وہ ایسی چیزوں کی کبھی تلاش نہیں کر سکتا جن سے اپنے لئے اضافی پنجے یا دانت بنا سکے -

زندہ پھاوڑا اور زندہ ٹوکری

تم نے شاید پرندوں، جانوروں اور کیڑوں وغیرہ کی تعمیری صلاحیتوں کے بارے میں پڑھا یا سنا ہو- ہم جانتے ہیں کہ ان کے درمیان ایسے بھی ہوتے ہیں جو بڑھئی، پتھر کا کام کرنےوالے، بنکر اور حتی کہ درزی کا بھی کام کرتے ہیں - اودبلاؤ کے تیز دانت درخت کو گرا سکتے ہیں - پھر اودبلاؤ گرے ہوئے درختوں کے تنوں اور شاخوں سے سچ مچ کے بند بنا لیتے ہیں - ان بندوں کی وجہ سے دریا اپنے کناروں کے اوپر بہہ نکلتا ہے اور ان پرسکون تالابوں کو سیراب کرتا ہے جن سے اودبلاؤ بڑی محبت کرتے ہیں -
پھر جنگل کی عام سرخ چیونٹیوں کو لیجئے جو صنوبر کی خشک سوئیوں سے اپنے ٹیلے بناتی ہیں - اگر ہم کسی چیونٹیوں کے ٹیلے کو چھڑی سے توڑیں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ ''فلک‌بوس عمارت،، کس ہوشیاری سے بنائی گئی تھی -

سوال یه پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان اودبلاؤں اور چیونٹیوں کے گھر اور بند تباہ کرنا چھوڑ دے تو کیا کبھی یہ اودبلاؤ اور چیونٹیاں انسان کے برابر پہنچ سکیں گی؟ کیا اب سے دس لاکھ سال بعد چیونٹیوں کے اپنے اخبار ہوں گے، وہ چیونٹیوں کی فیکٹریوں میں کام کرینگی، چیونٹیوں کے ہوائی جہازوں میں اڑینگی اور ریڈیو پر چیونٹیوں کی موسیقی سنیں گی؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ آدمی اور چیونٹیوں کے درمیان ایک بہت اہم فرق ہے ۔ یہ فرق کیا ہے؟

کیا فرق یہ ہے کہ انسان چیونٹی سے بڑا ہے؟

نہیں۔

کیا فرق یہ ہے کہ انسان کے دو پیر ہوتے ہیں اور چیونٹی کے چھ؟

نہیں ۔

ہم اس سے بالکل مختلف چیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں ۔

ذرا سوچو تو انسان کیسے کام کرتا ہے ۔ وہ صرف اپنے ہاتھ اور دانت نہیں

زندہ پیپوں والا گودام

یہ چار پیروں والے معمار بند بنا رہے ہیں

استعمال کرتا۔ وہ کلہاڑی، پھاوڑا یا ہتھوڑا استعمال کرتا ہے۔ لیکن تم چاہے جتنی دیر تک چیونٹیوں کے ٹیلے کا جائزہ لو اس میں کوئی چیونٹیوں کی کلہاڑی یا ہتھوڑا نظر نہ آئے گا۔

جب چیونٹی کو کوئی چیز دو حصوں میں کاٹنی ہوتی ہے تو وہ زندہ قینچی استعمال کرتی ہے جو اس کے سر کا ایک جز ہوتی ہے۔ جب اس کو کوئی گڈھا کھودنا ہوتا ہے تو اپنے چار زندہ پھاوڑے استعمال کرتی ہے۔ یہ پھاوڑے اس کے چھ پیروں میں سے چار پیر ہوتے ہیں۔ اگلے دو پیر کھودتے ہیں، پچھلے دو پیر مٹی ہٹاتے ہیں اور بیچ والے دونوں پیروں پر چیونٹی کام کے وقت سہارا لیتی ہے۔

چیونٹیوں کے پاس زندہ ٹوکریاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کو کبھی کبھی "چیونٹیوں کی گائیں" بھی کہتے ہیں۔ تاریک، نیچے تہہ خانوں میں ان ٹوکریوں کی قطاروں کی قطاریں برآمدے کی چھت سے ٹنگی رہتی ہیں۔ یہ ٹوکریاں بےحس و حرکت ہوتی ہیں۔ اچانک کوئی مزدور چیونٹی تہہ‌خانے میں آتی ہے۔ اس کی مونچھیں ٹوکری کو کئی بار چھوتی ہیں اور وہ زندہ ہوکر حرکت کرنے لگتی ہے۔ تب ہم دیکھتے ہیں کہ اس ٹوکری کے سر، پیٹ اور پیر ہیں اور دراصل یہ چیونٹی کا بہت پھولا ہوا پیٹ ہے جو اس کو ٹوکری کی شکل دے‌دیتا ہے۔ ٹوکری کے جبڑے کھل جاتے ہیں اور اس کے لب پر رس کا ایک قطرہ آجاتا ہے اور مزدور چیونٹی جو کچھ نہانے آئی تھی اس کو چاٹ لیتی ہے اور پھر کام پر چلی جاتی ہے اور "گائے چیونٹی" چھت کے نیچے پھر سوجاتی ہے۔

یہ ھیں چیونٹی کے ''زندہ،، اوزار ۔ یہ ھمارے اوزاروں کی طرح مصنوعی نہیں قدرتی اوزار ھوتے ھیں جن کو چیونٹی اپنے سے کبھی جدا نہیں کر سکتی۔

اودبلاؤ کے اوزار بھی اس کے جسم کا حصہ ھوتے ھیں۔ اس کے پاس پیڑ کاٹنے کےلئے کلہاڑی تو نہیں ھوتی۔ وہ اپنے دانت استعمال کرتا ھے۔ چیونٹیاں اور اودبلاؤ اپنے اوزار نہیں بناتے۔ وہ تو ان کے ساتھ ھی پیدا ھوتے ھیں۔

سرسری نظر سے ایسے اوزار قابل رشک ھیں جو تمہارے جسم کا حصہ ھوں کیونکہ ان کے کھونے کا کوئی اندیشہ نہیں ھوتا۔ لیکن سوچنے پر یہ معلوم ھوگا کہ یہ اوزار دراصل زیادہ اچھے نہیں ھیں۔ ان کو نہ تو بحال کیا جا سکتا ھے اور نہ بدلا جا سکتا ھے۔

اودبلاؤ اپنے دانت کسی چھری و چاقو تیز کرنےوالے کے پاس نہیں لےجاسکتا جب وہ کبیرسنی کی وجہ سے کند ھوجاتے ھیں۔ اور چیونٹی کسی ایسے اچھے پاؤں کا آرڈر نہیں دے سکتی جو زیادہ گہرا اور تیز کھود سکتا ھو ۔

اگر انسان کے ھاتھ کے بجائے پھاؤڑا ھوتا ؟

آؤ تھوڑی دیر کےلئے مان لیں کہ آدمی کے پاس دوسرے جانوروں کی طرح صرف ''زندہ،، اوزار ھیں اور وہ لکڑی، لوھے یا فولاد کے اوزار نہیں رکھتا۔

نہ تو وہ کوئی نیا اوزار بنا سکتا ھے اور نہ پرانا تبدیل کر سکتا ھے جو اس کے ساتھ ھی پیدا ھوا تھا۔ اگر اس کے پاس کوئی پھاؤڑا ھونا ضروری ھے تو وہ پھاؤڑے جیسے ھاتھ لیکر پیدا ھوتا ھے۔ یہ سچ ھے کہ ھم محض یہ فرض کر رھے ھیں کیونکہ حقیقت میں ایسا کبھی نہیں ھوسکتا۔ لیکن مان لو کہ ایسی عجیب مخلوق کا وجود تھا۔ وہ بہت اچھا کھودنےوالا ھونے پر بھی کسی اور کو کھودنا نہیں سکھا سکتا جیسے کوئی بہت اچھی بصارت رکھنےوالا اپنی نگاہ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا۔

ایسی مخلوق کو اپنا پھاؤڑانما ھاتھ ھروقت اپنے ساتھ رکھنا پڑتا لیکن یہ ھاتھ اور کسی طرح کا کام نہ کر سکتا اور جب یہ مخلوق مرجاتی تو پھاؤڑا نما ھاتھ بھی ختم ھوجاتا۔ یہ پیدائشی کھودنےوالا اپنا پھاؤڑا صرف اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کرسکتا بشرطیکہ اس کے پوتے اور پرپوتے اس کے پھاؤڑے نما ھاتھ کو وراثت میں پاتے۔

بهرحال، یه قطعی بات نہیں ہے۔ ''زندہ'' اوزار اسی وقت آئندہ نسلوں کا زندہ حصہ بنتا ہے اگر وہ ان کے لئے مفید ہو، نقصان‌دہ نہ ہو۔
اگر لوگ زمین کے اندر والے جانوروں کی طرح رہتے ہوتے تو ان کو پھاوڑے‌نما ہاتھ کی ضرورت ہوتی۔
لیکن ایسا ہاتھ ایک ایسی ہستی کےلئے غیرضروری چیز ہے جو زمین کے اوپر رہتی ہو۔
زندہ اور قدرتی اوزار کی تخلیق کے لئے بعض شرائط ضروری ہیں۔ بہرحال خوشی کی بات یہ ہے کہ انسان نے اپنے ارتقا کے دوران دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے قدرت کا انتظار نہیں کیا کہ وہ اس کو پھاوڑانما ہاتھ دے۔ اس نے خود پھاوڑا بنالیا۔ اور صرف پھاوڑا ہی نہیں بلکہ چاقو، کلہاڑی اور بہت سے دوسرے اوزار بھی۔
ان دس انگلیوں، دس انگوٹھوں اور ۳۲ دانتوں میں جو اس کو اجداد سے وراثت میں ملے تھے اس نے طرح طرح کے ہزاروں لمبی اور چھوٹی، پتلی اور موٹی، تیز اور کند، برمانے، کاٹنے اور مارنے والی انگلیوں، دانتوں، پنجوں اور مکوں کا اضافہ کیا۔
اور اسی لئے وہ حیوانات کی باقی دنیا سے دوڑ میں اتنا آگے ہوگیا کہ اب دوسروں کو اسے پکڑنا بالکل ناممکن ہوگیا ہے۔

ماہر انسان اور ماہر دریا

جب ابتدائی دور کا آدمی رفتہ رفتہ انسان بن رہا تھا تو وہ پتھر کے پنجے اور دانت نہیں بناتا تھا بلکہ ان کو اسی طرح جمع کرتا تھا جیسے ہم سانپ‌چھتریاں یا جنگلی بیریاں اکٹھا کرتے ہیں۔ اتھلے دریا میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے وہ ان تیز دھاروالے پتھروں کی تلاش کرتا جو قدرت نے اس کےلئے تیز کئے اور چمکائے تھے۔
یہ قدرتی تیز پتھر ایسی جگہوں پر عام طور سے پائے جاتے تھے جہاں بھنور کسی زمانے میں دریا کی تہہ کی چٹانوں کو متھ کر اوپر لاتا تھا اور ان کو ادھر ادھر پھینکتا تھا۔ بڑی بڑی چٹانیں اس طرح ایک دوسرے سے زوروں میں ٹکراتی تھیں۔ دریا جو بھنور میں بہت زوروں سے کام کرتا تھا اپنی محنت کے نتائج کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا اور اسی وجہ سے ان سیکڑوں پتھروں میں سے جن پر قدرت اپنی محنت لگاتی تھی چند ہی انسان کے استعمال کے قابل ہوتے تھے۔
رفتہ رفتہ آدمی نے اپنی ضرورت کے مطابق پتھروں کو شکل و صورت دینا شروع کیا اور پتھروں کے پہلے اوزار بنائے۔

جو کچھ اس وقت ہوا اس کا اعادہ انسان کی تاریخ میں متعدد بار ہوا۔ انسان نے قدرتی چیزوں کی جگہ اپنی بنائی ہوئی مصنوعی چیزیں لانا شروع کیں۔ انسان نے قدرت کے وسیع ورکشاپ کے ایک کونے میں اپنا ورکشاپ قائم کیا اور وہاں نئی چیزیں بنانا شروع کیں، ایسی چیزیں جو اس کو قدرتی طور پر نہیں ملیں۔

یہ ہے پتھروں کے اوزاروں کی کہانی اور ہزاروں سال بعد دھات کی بھی یہی کہانی ہے۔ صاف دھات استعمال کرنے کے بجائے جس کا ملنا بہت مشکل تھا آدمی نے خام دھات پگھلا کر دھات حاصل کرنی شروع کی۔ اور ہر مرتبہ جب وہ کوئی چیز ایسی چیز سے بنانے میں کامیاب ہوتا جو اس کو پڑی ملتی تو وہ آزادی کی طرف ایک قدم اور اٹھاتا، قدرت کی سخت حکومت سے اپنی آزادی کی طرف۔

پہلے پہل تو آدمی وہ چیزیں نہیں پیدا کرسکتا تھا جو اس کے اوزاروں کے لئے ضروری تھیں۔ لیکن جو چیزیں اس کو ملتیں ان کو اپنی ضروریات کے مطابق نئی شکل دینے کی کوشش کرتا۔

اس طرح اگر اس کو کوئی اچھا پتھر مل جاتا تو وہ دوسرے پتھر سے اس کے کنارے کاٹ کر اوزار بنانے کی کوشش کرتا۔

اس طرح ایک بھاری اوزار تیار ہوجاتا جس کا ایک سرا تیز ہوتا۔ اس کو کلھاڑی کہا جا سکتا ہے۔ اس پتھر سے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی کام آجاتے۔ ان سے کاٹنے، چھیلنے اور تراشنے کا کام لیا جاتا۔

زمانۂ تاریخ سے قبل کے جو انتہائی قدیم اوزار پائے گئے ہیں وہ قدرتی پتھروں سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان پر کس نے کام کیا ہے — آدمی نے یا دریا نے۔ یا صرف درجۂ حرارت کی تبدیلی کا اثر ہے، گرمی یا سردی کا جو بارش اور پانی کے ساتھ مل کر پتھروں کو توڑ دیتی ہیں۔

بہرحال، ایسے بھی اوزار ہیں جن کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں۔ قدیم دریاؤں کے بہاؤ کے اتھلے حصے اور کناروں کے اندر سے جو اب مٹی اور ریت کی موٹی تہوں میں دفن ہیں سائنس دانوں نے زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کے سچ مچ کے ورکشاپ کھود کر نکالے ہیں۔ ان کھدائیوں میں پوری کی پوری کلھاڑیاں اور ایسی چٹانیں ملی ہیں جن کی کلھاڑیاں بنائی جانےوالی تھیں۔

روس میں یہ کلھاڑیاں جنوبی علاقے میں ملی ہیں، سوخومی کے قریب ساحلوں پر اور کرائمیا میں کیئک کوبا غار میں۔

اگر ہم پتھر کی کسی تیار کلھاڑی کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں صاف پتہ چل جائےگا کہ آدمی نے اس کی دھار کو تیز کرنے کےلئے کہاں چوٹ لگا کر کاٹنے کی کوشش کی۔ ہم اس کو چکنا کرنے کے نشانات بھی دیکھ سکتے ہیں۔

قدرت یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ صرف انسان ہی اس کو کرسکتا تھا۔ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کیوں کہ قدرت میں ہر چیز اٹکل پچو ہوتی ہے۔ اس کا کوئی منصوبہ یا مقصد نہیں ہوتا۔ مثلاً بلا سمجھے بوجھے، کسی مقصد کے بغیر دریا کا بھنور پتھروں کو ٹکراتا رہتا ہے۔ آدمی بھی یہی کرتا ہے لیکن باشعور طریقے پر۔ جو کچھ کرتا ہے اس کا سبب ہوتا ہے۔ اس حقیر ابتدا سے کہ جو پتھر اس کو ملا اسے وہ اپنی ضرورت کے مطابق بنائے آدمی نے رفتہ رفتہ قدرت کو بھی اپنی ضروریات کے مطابق بدلنا اور نئی شکل دینا شروع کیا۔

اس بات نے آدمی کو دوسرے جانوروں سے ایک درجہ اور بلند کیا، اس نے اس کو اور آزادی دی کیونکہ اب وہ اس کا منتظر نہیں رہا کہ قدرت اس کو ایک تیز دھاروالا پتھر عطا کرے۔

اب وہ خود اپنے اوزار بنا سکتا تھا۔

انسان کی سوانح کی ابتدا

عموماً کسی شخص کی سوانح حیات کی ابتدا پیدائش کی تاریخ اور جگہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ''ایوان ایوانوف ۲۳ نومبر ۱۸۹۷ء کو شہر تامبوف میں پیدا ہوئے،،۔

یہ اطلاع ذرا زیادہ پرتکلف انداز میں یوں بھی دی جا سکتی ہے ''نومبر ۱۸۹۷ء کو بارش والا دن تھا جب ایوان ایوانوف، جنھوں نے بڑے ہوکر اپنے خاندان اور اپنے شہر کے نام کو چمکایا، تامبوف کے مضافات میں ایک چھوٹے سے گھر میں پیدا ہوئے۔،،

لیکن یہاں تو ہم اپنی کتاب کے تیسرے باب تک پہنچ چکے ہیں اور ابھی تک ہم نے اس کا ذکر تک نہیں کیا کہ ہمارا ہیرو کہاں اور کب پیدا ہوا تھا۔ دراصل، ہم نے آپ کو اس کا ٹھیک نام تک نہیں بتایا۔ ایک جگہ ہم اس کو ''بندر مانس،، کہتے ہیں تو دوسری جگہ ''قدیم آدمی،، اور تیسری جگہ ''ہمارے جنگلی جد،، کہتے ہیں۔

ہم اپنی بات کی صفائی کے لئے کچھ کہیں گے۔

اگر ہم چاہیں بھی تو آپ کو اپنے ہیرو کا ٹھیک نام نہیں بتا سکتے کیونکہ اس کے بہت سے نام ہیں۔

اگر آپ کسی سوانحعمری کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ کتاب میں شروع سے آخر تک ہیرو کا نام ایک ہی رہتا ہے کبھی بدلتا نہیں۔ پہلے وہ بچہ ہوتا ہے،

پھر لڑکا، پھر داڑھی مونچھوں‌والا آدمی ۔ لیکن اس کا نام وھی رھتا ھے جو ابتدا میں تھا ۔ اگر اس کا نام ایوان رکھا گیا ھے تو آخر دم تک اس کا نام ایوان ھی رھےگا ۔

لیکن ھمارے ھیرو کے معاملے میں باتیں زیادہ پیچیدہ ھیں ۔

چونکہ وہ خود ایک باب سے دوسرے باب تک کافی بدلتا رھتا ھے اس لئے ھم بھی اس تبدیلی کے مطابق اس کا نام بدلنے پر مجبور ھیں ۔

اگر ھم زمانۂ تاریخ سے قبل کے بہت ھی قدیم آدمی کا ذکر کرتے ھیں جو اب بھی بندر سے بہت زیادہ مشابہہ ھے تو اس کو pithecanthropus, sinanthropus, اور Heidelberg کا آدمی کہتے ھیں ۔

ھیڈلبرگ کے آدمی کا صرف ایک حصہ رہ گیا ھے ۔ وہ اس کا جبڑا ھے جو جرمنی میں شہر ھیڈلبرگ کے قریب ملا ھے ۔

بہرحال یہ جبڑا اس کا کافی ثبوت فراھم کرتا ھے کہ اس کا مالک آدمی تھا ۔ یہ دانت انسانی دانت ھیں اور بندر کی طرح اوپر کے لمبے اور تیز دانت نیچے کے دانتوں کے اوپر نہیں نکلے ھوئے ھیں ۔

لیکن ھیڈلبرگ کا آدمی اصلی آدمی نہ تھا ۔ اس کی بندر جیسی اندر گھسی ھوئی ٹھوڑی یہ بتاتی ھے ۔

∴ Pithecanthropus, sinanthropus, Heidelberg man!

زندگی کے ایک ھی دور میں، ارتقا کی ایک ھی منزل میں ھمارے ھیرو کے یہ تین لمبے چوڑے نام ھیں ۔

لیکن ھمارے ھیرو میں تبدیلیاں ھوئیں ۔ وہ زیادہ سے زیادہ جدید انسان بنتا گیا ۔ جس طرح ایک بچہ، لڑکا بنتا ھے اور پھر نوجوان ۔ اسی طرح زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی neanderthal بن گیا اور پھر neanderthal آدمی cro-magnon آدمی ھوگیا ۔

تو دیکھو نا! ھمارے ھیرو کے ابھی کئی اور نام ھیں!

لیکن ھمیں عجلت نہ کرنا چاھئے ۔ اس باب میں اس کو — pithecanthropus Heidelberg man — sinanthropus کہا گیا ھے ۔

وہ دریاؤں کے کنارے گھومتا رھتا تھا اور اپنے اوزار بنانےوالی چیزوں کی تلاش کرتا تھا ۔ وہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ پتھر کاٹتا تھا اور اپنی بھونڈی اور بھاری کلہاڑی بناتا تھا جس کو سائنس‌داں اب بھی قدیم دریاؤں کی تہوں میں دفن پاتے ھیں ۔

اسی‌لئے اس کا نام بتانا بہت ھی مشکل ھے ۔

اور اس سے زیادہ یہ بتانا مشکل ھے کہ وہ کب پیدا ھوا تھا ۔ ھم یہ نہیں کہہ سکتے ھیں کہ ”ھمارا ھیرو اس سن میں پیدا ھوا تھا“ ۔ کیونکہ آدمی ایک سال میں تو آدمی نہیں بنا ۔ اس کو لاکھوں سال چلنا اور اپنے بھونڈے اوزار بنانا سیکھنے

میں لگ گئے۔ اس لئے اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ انسان کی عمر کیا ہے تو ہم صرف یہی جواب دے سکتے ہیں کہ تقریباً دس لاکھ سال۔

اور یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے کہ آدمی کہاں پیدا ہوا تھا۔

ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے ہیرو کی جدہ کہاں رہتی تھیں، قدیم بندر جدہ جن کی نسل میں آدمی، چمپانزی اور گوریلا شامل ہیں۔ سائنس‌دانوں نے اس بندر کو dryopithecus کا نام دیا ہے اور جب ہم نے اس کا پتہ ڈھونڈھنا شروع کیا تو ہمیں پتہ چلا کہ وہاں تو بہت سے dryopithecinae تھے۔ بعض نشانات ہمیں وسط یورپ لے گئے، کچھ مشرقی افریقہ اور کچھ جنوبی ایشیا۔

معلومات رکھنےوالے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ جنوبی افریقہ میں بہت سی دلچسپ دریافتیں ہوئی ہیں۔ ایسے بندروں کی باقیات وہاں پائی گئی ہیں جو اپنے پچھلے پیروں پر چلنا جانتے تھے اور جنگلوں میں نہیں رہتے تھے بلکہ ان کی رہائش کھلے میں تھی۔

زمانۂ تاریخ سے قبل کے بندر کی کھوپڑی کے ٹکڑے جو آدمی کی کھوپڑی سے بہت ملتے جلتے تھے جنوبی افریقہ میں پائے گئے۔ اس ڈرائنگ میں australopithecus کے خدوخال بحال کئے گئے ہیں

تب ہم کو یاد آیا کہ sinanthropus اور pithecanthropus کی باقیات ایشیا میں دریافت کی گئی ہیں اور ہیڈلبرگ آدمی کا جبڑا یورپ میں۔ تو پھر آدمی کی جائے پیدائش کہاں ہے؟ اور ہمیں اس کا احساس ہوا کہ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ آدمی کس براعظم یا ملک میں پیدا ہوا تھا۔

ہم نے سوچا کہ ہمیں ہر اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہئے جہاں پتھر کے اوزار پائے گئے ہیں۔ بہرحال آدمی اسی وقت سچے معنی میں انسان بنا جب اس نے اپنے اوزار بنانا شروع کئے۔ شاید ان اوزاروں کی جگہ ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں مدد دے سکے کہ آدمی کا ظہور کہاں ہوا۔

ہم نے ایک دنیا کا نقشہ لیا اور ہر اس جگہ پر نشان لگادیا جہاں پتھر کی کلہاڑیاں ملی تھیں۔ جلد ہی نقشے پر نشانات پھیل گئے۔ ان میں سے زیادہ‌تر یورپ میں تھے۔ لیکن افریقہ اور ایشیا میں بھی کچھ تھے۔

اب جواب واضح تھا : آدمی کا ظہور پہلے پرانی دنیا میں، بہت سی مختلف جگہوں پر ہوا، کسی واحد جگہ پر نہیں۔
اور غالباً یہی ہوا کیونکہ ہم ایک لمحے کےلئے بھی یہ تصور نہیں کر سکتے کہ پوری نسل انسانی بندروں کے ایک جوڑے سے مثلاً ''آدم بندر،، اور ''حوا بندر،، سے پیدا ہوئی۔ بندر سے آدمی میں یہ تبدیلی بندروں کے کسی ایک غول کے اندر یا کسی واحد علاقے تک محدود نہ تھی۔ یہ بہت سے علاقوں میں ایک ہی زمانے میں ہوئی، ہر ایسی جگہ جہاں ایسے بندر تھے جنھوں نے دو پیروں پر چلنا اور کام کےلئے اپنے ہاتھ استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ اور جیسے ہی انھوں نے کام کرنا شروع کیا ایک نئی طاقت وجود میں آئی، ایسی طاقت جس نے آخرکار ان بندروں کو آدمیوں میں تبدیل کردیا۔ یہ طاقت انسانی محنت کی طاقت تھی۔

آدمی نے وقت کا تعین کیا

ہر ایک جانتا ہے کہ خام لوہا اور کوئلہ کانوں سے کیسے نکالا جاتا ہے اور آگ کیسے بنائی جاتی ہے۔ لیکن وقت کیسے بنایا گیا ؟
حالانکہ آدمی نے مدتوں ہوئے وقت بنانا سیکھا تھا لیکن بہت کم لوگ اس سوال کا جواب جانتے ہیں۔ جب آدمی نے پہلےپہل اوزار بنانا شروع کئے تو اس کی زندگی واقعی نئی مصروفیت سے بھرگئی اور یہ واقعی انسانی مصروفیت تھی۔ یہ تھی محنت۔ لیکن محنت میں وقت لگتا تھا۔ پتھر سے اوزار بنانے کےلئے آدمی کو اچھا پتھر ڈھونڈھنا پڑتا تھا کیونکہ ہر ایک پتھر کی کلہاڑی نہیں بنائی جا سکتی تھی۔
اوزار کےلئے سب سے اچھا پتھر وہ تھا جو بھاری اور سخت ہوتا تھا۔ لیکن ہر جگہ تو نہیں ملتے تھے۔ ان کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔ آدمی کو اس کی تلاش میں بڑا وقت لگانا پڑتا تھا اور اکثر اس کی تلاش بےسود ہوتی تھی۔ تب اس کو کم سخت پتھر کا یا ریت اور چونے کے پتھروں کا جو زیادہ نرم ہوتے تھے استعمال کرنا پڑتا تھا۔
جب اس کو ٹھیک پتھر مل جاتا تو اس کو ضروری شکل دینے کے لئے دوسرے پتھر سے کاٹ کر بنانا پڑتا جس کو چوٹ لگانےوالا کہتے تھے۔ اس میں وقت لگتا تھا۔ آدمی کی انگلیاں اتنی تیز اور ہنرمند نہیں تھیں جتنی اب ہیں۔ وہ تو ابھی کام کرنا سیکھ رہی تھیں۔ اسی‌لئے اس کو اپنی بھونڈی کلہاڑیاں بنانے میں اتنا وقت لگتا تھا جتنا آجکل فولادی کلہاڑیاں بنانے میں نہیں لگتا۔
لیکن اس کام میں جو وقت لگتا تھا وہ کہاں سے آئے؟

زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کے پاس فاضل وقت بہت کم تھا - وہ آج کے انتہائی مصروف آدمی سے بھی کم وقت رکھتا تھا - صبح سے شام تک وہ جنگلوں میں گھوم کر غذا جمع کرتا تھا، اپنے لئے اور اپنے بچوں کےلئے - کوئی بھی کھانے والی چیز سیدھی اس کے منہ میں جاتی تھی - سونے کے علاوہ سارا وقت غذا جمع کرنے اور کھانے میں لگ جاتا تھا کیونکہ زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کو جو غذا ملتی تھی وہ کافی مقوی نہیں ہوتی تھی اور اس کو بہت زیادہ غذا کی ضرورت تھی -

پتھر کی بسولی

ذرا سوچو تو کہ اس کو کتنا کھانا پڑتا ہوگا کیونکہ اس کے کھانے میں بیر، اخروٹ، گھونگے، چوہے، نئی کونپلیں، جڑیں، کیڑے مکوڑوں کے انڈے اور اسی قسم کی چیزیں ہوتی تھیں -

آدمیوں کے گلے جنگلوں میں ان ہرنوں کے گلوں کی طرح چرتے تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ گھاس چرتے اور کائی چباتے ہوئے جاتے رہتے ھیں - تو پھر وہ کام کب کرتا؟

اور پھر اس نے دریافت کیا کہ کام کی ایک حیرت انگیز خوبی یہ ھے کہ کام صرف اس کا وقت لیتاھی نہیں بلکہ اس کو وقت دیتا بھی ھے -

دراصل اگر تم کوئی کام چار گھنٹے میں کرو جو دوسرا آٹھ گھنٹے میں کرتا ھے تو تم نے چار گھنٹے بچالئے - اگر تم نے ایسا اوزار ایجاد کرلیا جو اس سے دگنی تیزی سے کام کرتا ھے جتنا پہلے تم کرتے تھے تو تم نے اپنا آدھا وقت بچالیا -

زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی نے یہ دریافت کی -

اس کو ایک پتھر تیز کرنے میں بہت سے گھنٹے لگتے تھے لیکن پھر وہ تیز اوزار کو درخت کی چھال کے اندر سے کیڑوں کے انڈے کھوجنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا -

کسی لکڑی کو پتھر سے تیز کرنے میں کافی وقت لگتا تھا لیکن اس تیز لکڑی سے مزیدار جڑیں کھودنا یا کسی چھوٹے جانور کو مارنا کہیں زیادہ آسان ہوتا تھا -

اس طرح زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کےلئے اپنے اور اپنے بچوں کےلئے غذا جمع کرنا زیادہ آسان ہوگیا - اب وہ اس کو زیادہ تیزی سے اکٹھا کرنے لگا اور اس کو کام کے لئے زیادہ وقت ملنے لگا - اپنے فاضل وقت میں وہ اوزار بناتا، ان کو زیادہ تیز اور بہتر کرتا - لیکن چونکہ ہر نئے اوزار کا مطلب زیادہ غذا ہوتا اسلئے بالآخر اس سے زیادہ وقت بھی بچتا -

شکار نے انسان کو سب سے زیادہ فاضل وقت مہیا کیا۔ کیونکہ گوشت بہت مقوی تھا۔ آدھہ گھنٹہ گوشت کھانے سے آدمی دن بھر کےلئے شکم سیر ہوجاتا۔ لیکن ابتدا میں اس کے پاس بہت کم گوشت تھا۔ کسی لکڑی یا پتھر سے بڑے جانور کو مارنا مشکل تھا اور چوھے وغیرہ میں زیادہ گوشت نہیں ہوتا ہے۔

آدمی ابھی پوری طرح شکاری نہیں بنا تھا۔

وہ جمع کرنے والا تھا۔

جمع کرنےوالا آدمی

ہمارے زمانے میں کچھ جمع کرنا آسان ہے۔ تم نے جنگل میں بیریاں اور سانپ‌چھتریاں اکٹھا کی ہونگی۔ کائی سے کسی بادامی چھتری‌والی سانپ‌چھتری کو جھانکتے ہوئے پانا یا گھاس میں سرخ ٹوپی‌والی سانپ چھتری کو دیکھنا کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ کائی کی گہرائی میں ہاتھ ڈال کر سانپ‌چھتری کے مضبوط تنے کو پکڑ کر احتیاط کے ساتھ اوپر کھینچنے میں کتنا مزا آتا ہے!

لیکن ایک لمحے کےلئے یہ سوچو کہ اگر سانپ‌چھتریاں یا بیریاں جمع کرنا تمہارا خاص پیشہ ہوتا۔ کیا تم ہمیشہ اچھی طرح کھا سکتے؟ جب تم سانپ‌چھتریاں جمع کرنے جاتے ہو تو کبھی کبھی تمہاری ٹوکری لبالب بھری ہوتی ہے اور باقی سانپ‌چھتریاں ٹوپی میں ہوتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ تم جنگل میں سارا دن تھک‌کر ایک یا دو سانپ‌چھتریاں اپنی ٹوکری میں ڈالے لوٹتے ہو۔

جب ہماری ایک دس‌سالہ دوست سانپ‌چھتریاں جمع کرنے روانہ ہوتی تو وہ زوروں کے ساتھ کہتی:

"مجھے سیکڑوں اچھی سانپ‌چھتریاں ملیں گی!"

لیکن زیادہ‌تر وہ گھر خالی ہاتھ لوٹتی۔ وہ بھوکوں مرجاتی اگر گھر میں سانپ‌چھتریوں کے علاوہ اور کچھ کھانے کو نہ ہوتا۔

جمع کرنےوالے، زمانۂ‌تاریخ سے قبل کے آدمی کےلئے زندگی اس سے بھی کہیں زیادہ سخت تھی۔ وہ بھوکوں محض اس‌لئے نہیں مرتا تھا کیونکہ وہ جو کچھ بھی پاتا تھا کھا لیتا تھا اور کھانے کی تلاش میں اپنے دن گزارتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے ان اجداد سے زیادہ مضبوط اور آزاد ہوگیا تھا جو درختوں پر رہتے تھے پھر بھی اس کی حالت زیادہ اچھی نہ تھی۔ دراصل وہ نیم بھوکی مخلوق تھا۔

اسی دوران میں ایک زبردست آفت دنیا کے چہرے کو بدلنےوالی تھی۔

چوتھا باب

آفت قریب ہوتی جاتی ہے

پتہ نہیں کیوں شمالی برفانی ٹوپیاں ٹوٹ کر جنوب کی طرف منتقل ہونے لگیں۔ برف کے بڑے بڑے دریا پہاڑوں اور میدانوں کے اوپر بہنے لگے۔ وہ ڈھلانوں اور پہاڑی چوٹیوں کو کاٹ دیتے، چٹانوں کو توڑکر پیس ڈالتے اور ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے پہاڑ کے پہاڑ اپنے ساتھ لےجاتے۔ گلیشیروں کے آگے پگھلتا ہوا برف طوفانی دریاؤں کو جنم دیتا جو زمین میں گہری خندقیں کھود کر اپنے لئے بہاؤ کا راستہ بنالیتے۔

شمال سے برف فاتحوں کی ایک بڑی فوج کی طرح بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پہاڑوں کی بلندیوں اور گھاٹیوں کے گلیشیر بھی مل جاتے تھے۔

سوویت یونین اور پڑوسی ملکوں کے میدانوں میں جو بڑی بڑی چٹانیں پائی جاتی ہیں ان میں پانچ مختلف برفانی دوروں کے نشانات ملتے ہیں۔ کبھی کبھی کریلیا کے صنوبر کے گھنے جنگلوں میں تم کو اچانک کائی سے ڈھکی ہوئی کوئی چٹان نظر آجائے گی۔ یہ وہاں کیسے پہنچی؟ گلیشیر اس کو چھوڑ گیا۔

شمال کے گلیشیر پہلے بھی جنوب کی طرف منتقل ہوئے تھے لیکن وہ اتنے جنوب تک کبھی نہیں پہنچے تھے۔ روس میں گلیشیر اس جگہ تک پہنچ گئے تھے جہاں اب شہر والگاگراد اور دنیپروپیتروفسک واقع ہیں۔ مغربی یورپ میں وہ جرمنی کے پہاڑی علاقے تک درآئے اور پورے جزائر برطانیہ کو ڈھک لیا۔ شمالی امریکہ میں وہ گریٹ لیکس کے آگے تک چلے گئے۔

گلیشیر سست رفتاری سے آگے بڑھتے تھے اور ان کو اپنی سردی وہاں تک پہنچانے میں کافی عرصہ لگا جہاں زمانۂتاریخ سے قبل کا انسان رہتا تھا۔ لیکن سمندری مخلوقات نے ان کی سرد ہواؤں کو سب سے پہلے محسوس کیا۔

سمندری ساحلوں پر اب بھی گرمی تھی۔ جنگلوں میں گرم خطے کے درخت تھے۔ زبردست قد و قامت‌والے جنوبی ہاتھی اور گینڈے میدانوں کی لمبی لمبی گھاس میں پھرتے تھے۔ لیکن سمندر کا پانی اور ٹھنڈا ہوتا جاتا تھا۔ دھارائیں جو سمندر میں

اسطرح بہتی تھیں جیسے دریا زمین پر بہتا ہے گلیشیر کی سردی شمال سے لےجاتی تھیں اور کبھی کبھی برف کی بڑی چٹانیں بھی۔

ساحل سمندر کی پرتیں ہمیں یہ کہانی بتاتی ہیں کہ کس طرح گرم سمندر ٹھنڈے سمندر بن گئے۔ ایسے زمانے میں جبکہ خشکی پر گرمی پسند کرنےوالے جانور اور پودے موجود تھے سمندر کی آبادی میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اگر ہم اس زمانے کے ارضیاتی ذخیروں کا مطالعہ کریں تو ہمیں گھونگھوں کے خول ملیں گے جو صرف ٹھنڈے پانی میں ہی رہ سکتے تھے۔

جنگلوں کی جنگ

گلیشیروں کی آمد آمد سے زمین بھی متاثر ہونے لگی۔

اور اس میں کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی کیونکہ آرکٹک اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اور آہستہ آہستہ جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹنڈرا اور شمال کے جنگلوں میں انتشار پیدا کردیا اور ان کو جنوب کی طرف ڈھکیل دیا۔

ٹنڈرا نے تائیگا پر علانیہ دھاوا بول دیا۔ تائیگا کو پیچھے ہٹنا پڑا اور اس طرح پتےوالے جنگل بھی پیچھے ہٹے۔

جنگلوں کی عظیم جنگ شروع ہو گئی۔

اب بھی جنگلوں میں آپس میں جنگ ہوتی رہتی ہے۔ صنوبر اور چنار لرزاں (asp) ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں۔ چنار لرزاں کو سائے سے نفرت ہے اور صنوبر کو اس کی کوئی پروا نہیں۔

اگر تم کسی صنوبر کے جنگل میں چنار لرزاں دیکھو تو وہ تم کو پتلی پتلی شاخوں سے زیادہ بڑے نہیں ملیں گے کیونکہ سایہدار صنوبر کے درختوں نے انھیں پنپنے نہیں دیا ہے۔ لیکن جب لکڑھارے صنوبر کے درخت کاٹ دیتے ہیں تو ان چناروں میں کھلی دھوپ کی وجہ سے نئی جان پڑجاتی ہے اور وہ بڑھنے لگتے ہیں۔

پھر سب کچھ بدلنے لگتا ہے۔ سائے سے محبت کرنےوالی کائی جو صنوبر کے درختوں کے نیچے اگی تھی مرجھاکر مرنے لگتی ہے۔ صنوبر کے وہ درخت جو چھوٹے تھے اور کاٹے نہیں جا سکتے تھے صبح کے پالے سے بیمار سے لگنے لگتے ہیں۔ جب بڑے صنوبر کے درخت جو ان چھوٹے پیڑوں کی ماؤں کی طرح تھے زندہ تھے تو یہ ان کے ہرے بھرے چھتنارے سائے میں تندرست محسوس کرتے تھے۔ لیکن جب وہ کھلے میں تنہا رہ گئے تو وہ بیمار لگنے لگے اور ان کی نشوونما بند ہوگئی۔

اب لرزاں چناروں کی جیت ہوگئی۔ پہلے تو ان کو سورج کی وہی کرنیں ملتی

تھیں جو ان کے دشمن صنوبر کے درختوں کی شاخوں سے ہوکر نیچے آجاتی تھیں ۔ اب صنوبر کاٹ ڈالے گئے تو چنار ھی جنگل کے راجہ ہوگئے۔

چند سال بعد جہاں ایک گھنا سیاہ صنوبر کا جنگل تھا اب وھاں چنار کا روشن جنگل نظر آنے لگتا ھے۔

لیکن وقت تو آگے بڑھتا رھتا ھے اور وقت بڑا کام کاجو ھے ۔ رفتہ رفتہ وہ اس طرح جنگلی گھر کو بحال کرتا رھتا ھے کہ پہلے تو یہ بات نظر میں بھی نہیں آتی ۔ چنار لرزاں اونچے ہوتے جاتے ھیں، ان کی جھاڑیدار چوٹیاں ایک دوسرے کے قریب آتی جاتی ھیں ۔ اب ان کے تنوں پر سایہ جو پہلے کم اور تھوڑی دیر کےلئے ھوتا تھا زیادہ گھنا اور تاریک ھوتا جاتا ھے ۔ چناروں نے صنوبروں سے لڑائی جیت لی تھی لیکن یہ جیت ھی ان کی موت کا باعث بن گئی ۔

کسی آدمی کی موت اپنے سائے سے نہیں ھوتی لیکن یہ بات اکثر درخت کی زندگی میں نظر آتی ھے ۔ چھتنارے چنار لرزاں کے درختوں کے سائے میں چھوٹے اور مرجھائے ہوئے صنوبر کے درخت تھے ۔ وقت آنے پر ان ننھے دشمنوں میں پھر جان پڑ گئی ۔ بیس سال میں صنوبر کے درختوں کی چوٹیاں بھی چنار لرزاں کی چوٹیوں کے برابر پہنچ گئیں ۔ اب جنگل رنگ‌برنگا اور ملاجلا نظر آنے لگا ۔ چنار لرزاں کا ھلکا سبز رنگ صنوبر کی گہری سبز رنگ کی چوٹیوں میں ملاجلا نظر آنے لگا ۔ صنوبر کے درخت اونچے ھوتے گئے اور وقت آنے پر ان کی گھنی سبز سوئیاں چنار لرزاں پر سایہ ڈالنے لگیں ۔ چنار لرزاں کے خاتمے کے دن آگئے ۔ وہ صنوبر کے سائے میں مرجھانے اور مرنے لگے ۔ اب صنوبر جنگل کے راجہ بن گئے ۔ انھوں نے اپنی پچھلی طاقت واپس حاصل کرلی ۔

اس طرح جنگلوں کے درمیان جنگ جاری رھتی ھے جبکہ آدمی اور اس کی کلھاڑی ان کی زندگی میں مداخلت کرتی ھے ۔

لیکن جنگلوں کی جنگ اس وقت اس سے بھی گھمسان کی تھی جب برفانی دور کی سردی ان کی زندگی میں در آئی ۔

سردی نے گرمی سے محبت کرنے والے پیڑوں کو ختم کردیا اور شمالی جنگلوں کے لئے راستہ ھموار کردیا ۔ صنوبروں اور برچوں نے بلوط اور لائم کے درختوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا ۔ بلوطوں اور لائموں کو پسپا ھونا پڑا اور ایسا کرنے میں انھوں نے آخری سدابہار درختوں مثلاً لارل، میگنولیا اور انجیر کے درختوں کو بالکل ختم کردیا ۔

نازک اور گرمی پسند کرنےوالے درخت ایسی کھلی جگھوں پر نہیں زندہ رہ سکے جہاں ھوا اور سردی سے کوئی پناہ نہ تھی ۔ وہ مرگئے اور انھوں نے فاتحوں کو جگہ دے دی ۔

صرف پہاڑوں میں ان کو پناہ ملی۔ وہاں ہر محفوظ وادی میں گرمی سے محبت کرنےوالے درختوں نے اپنے کو چھپالیا۔ لیکن پھر دوسرے گلیشیر پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے کی طرف بہہ نکلے اور ان تمام پہاڑی ٹنڈرا کے درختوں، پہاڑی صنوبروں اور برچوں کو اپنے ساتھ لے گئے جو ان کے سامنے پڑے۔

جنگلوں کی یہ جنگ ہزارہا سال تک چلتی رہی اور گرمی سے محبت کرنے والے درختوں کی آخری شکست خوردہ فوج جنوب کی طرف زیادہ سے زیادہ پسپا ہوتی گئی۔

لیکن ان جنگلوں میں رہنےوالے جانوروں کا کیا حشر ہوا جب فاتحوں کے خلاف جد و جہد میں یہ جنگل تباہ ہوئے؟

موجودہ زمانے میں جب کوئی جنگل آتش‌زدگی سے تباہ ہوجاتا ہے یا کاٹ ڈالا جاتا ہے تو اس کے کچھ رہنےوالے اس کے ساتھ ہی مرجاتے ہیں اور دوسرے اس سے کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلتے ہیں۔ جب کوئی صنوبر کا جنگل کاٹا جاتا ہے تو اس کی پرندوں کی آبادی غائب ہوجاتی ہے۔

سایہ‌دار صنوبر کے جنگل کی جگہ چنار لرزاں کا ایک نیا جنگل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نئے جنگل میں دوسری چڑیاں اور دوسرے جانور اپنے گھر بناتے ہیں۔

جب بہت برسوں بعد صنوبر کے درخت پھر چنار لرزاں کے درختوں کو شکست دیتے ہیں تو نیا صنوبر کا جنگل خالی نہیں ہوتا۔ اس میں پھر پرانے پرندے بس جاتے ہیں۔

تو جنگل مرجاتا ہے اور پھر جنم لیتا ہے، پودوں اور جانوروں کے ایک انوکھے مجموعے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک متحد اور آپس میں بہت ہی گھنے رشتوں سے مربوط دنیا کی حیثیت سے۔

یہی صورت برفانی دور میں بھی ہوئی۔ جب گرم خطے کے جنگل غائب ہوئے تو ان کے باسی جانور بھی غائب ہوگئے۔ دیوقامت ہاتھی غائب ہوگیا۔ گینڈے اور دریائی گھوڑے جنوب کی طرف چلے گئے اور زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کا انتہائی زبردست دشمن تیز دانتوں‌والا چیتا بھی آخرکار مرگیا۔

چھوٹے جانوروں اور پرندوں کی بڑی تعداد یا تو مرگئی یا جنوب کی طرف بھاگ گئی۔ اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر جانور اپنی چھوٹی سی دنیا سے منسلک ہے، اپنے جنگل سے۔ جب یہ جنگلی دنیا تباہ ہونے لگی تو اس کے بہت سے باسی بھی تباہ ہوگئے۔

جب درخت، جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاسیں سوکھ گئیں تو وہ جانور جو ان کے اندر چھپتے تھے اور ان سے غذا حاصل کرتے تھے غذا اور پناہ سے محروم ہوگئے۔ لیکن جب یہ پرامن گھاس کھانےوالے مرگئے تو وہ گوشت‌خور درندے بھی جو ان کو کھاتے تھے بھوکوں مرگئے۔

”غذا کے سلسلوں،، کی کڑیوں میں منسلک جانور اور پودے اپنے جنگل کی تباہی پر خود بھی تباہ ہوگئے۔

یہ اسی طرح تھا جیسے قدیم زمانے میں جہازوں کے چلانےوالے غلام بھی اپنے جہازوں کے ساتھ ڈوب جاتے تھے کیونکہ وہ پتواروں سے زنجیروں کے ذریعہ بندھے ہوتے تھے۔

قدیم دور کے فن‌کار نے ایک غار کی دیوار پر میموتھ کی یہ تصویر بنائی
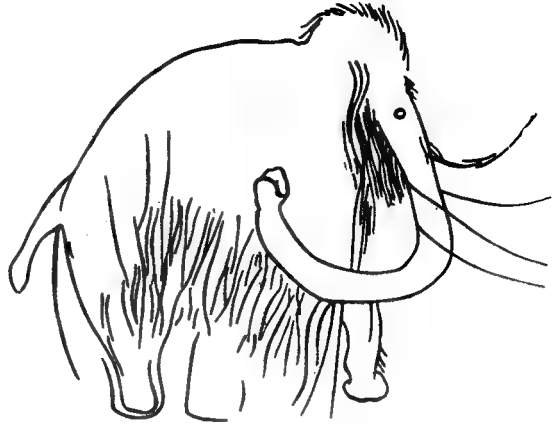
کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے کےلئے جانور کو اپنی زنجیریں توڑنا ہوتی تھیں۔ وہ اپنی عادت سے مختلف غذا کھانا شروع کر دیتا، اس کو اپنے پنجے اور دانت بدلنا پڑتے اور سردی سے بچنے کےلئے اسے لمبے لمبے بال یا سمور پیدا کرنے ہوتے۔

ہم جانتے ہیں کہ کسی جانور کےلئے بدلنا کتنا مشکل ہے۔ گھوڑے کی تاریخ یاد کرو۔ اس کو کتنے لاکھ سال ایسا جانور بننے میں لگے جس کا ایک انگوٹھا کھر کی شکل میں ہے۔

کسی جنوبی جانور کےلئے شمالی جنگل میں زندہ رہنا بہت مشکل تھا۔

یہی مصیبت کیا کم تھی اور اس میں اضافہ یہ ہوا کہ شمالی جنگلوں کے بالوں‌والے باسی بھی جنوب کی طرف آنے لگے۔ یہ تھے اون‌والے گینڈے، قدیم زمانے کے میموتھ، غاروالے شیر اور ریچھ۔ یہ سب کے سب شمالی جنگلوں کے عادی تھے۔

ان کی موٹی، بالدار کھال ان کا سب سے بڑا خزانہ تھی۔ میموتھ اور اون‌والے گینڈے جاڑے سے نہیں ڈرتے تھے۔ ان کے پاس گرم اور بالدار کوٹ تھے اور ننگی کھال‌والے جنوبی ہاتھیوں، گینڈوں اور دریائی گھوڑوں سے بالکل مختلف تھے۔

بعض شمالی جانوروں نے سردی سے بچنے کا ایک اور راستہ نکالا۔ وہ غاروں میں رہنے لگے۔ شمالی جانوروں کو نئے جنگل میں غذا کی کھوج میں مشکل نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہ ان کا اپنا جنگل، اپنی دنیا تھی۔

شکست‌خوردہ جنگلوں کے جانوروں کو اب شمالی جنگلوں کے نئے راجاؤں سے مورچہ لینا پڑا۔

اب غالباً تم کو حیرت نہ رہی ہوگی کہ ان میں سے اتنے کم کیوں بچے۔
لیکن زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کا کیا حشر ہوا؟
ظاہر ہے کہ وہ بچ گیا کیونکہ اگر وہ بھی تباہ ہوگیا ہوتا تو تم کو یہ کتاب پڑھنے کا موقع نہ ملتا۔
جو لوگ گرم ملکوں میں رہتے تھے ان کو سردی کے خلاف جان کی بازی لگا کر لڑنا نہیں پڑا حالانکہ وہاں کی آب و ہوا بھی کچھ سرد ہوگئی۔
ان آدمیوں کےلئے حالات بہت ہی خراب تھے جن کو بڑھتے ہوئے گلیشیروں کی دہشت کا سامنا کرنا پڑا۔
ہر سال ایک نیا جاڑا آتا جو اور زیادہ سخت ہوتا۔ وہ کانپتے اور ٹھٹھر جاتے۔ وہ اپنے اور اپنے بچوں کو گرم رکھنے کےلئے ایک دوسرے سے جٹ کر بیٹھ جاتے۔
بھوک، شدید سردی اور جنگلی جانور ان کو بالکل ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اگر یہ ابتدائی آدمی یہ سمجھ سکتے کہ ان کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے تو غالباً وہ یہی طے کرتے کہ دنیا کے خاتمے کا وقت آگیا ہے۔

دنیا کا خاتمہ

دنیا کے خاتمے کی پیشین گوئیاں بارہا کی جا چکی ہیں۔
ازمنۂ وسطی میں جب کوئی شہاب ثاقب اپنی شعلہ‌ور دم پھیلاتا آسمان کے پار جاتا ہوا دکھائی دیتا تو لوگ اپنے اوپر صلیب مقدس کا نشان بنا کر کہتے:
''دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔''
جب شدید طاعون کی بیماری پھیلتی جس کو لوگ ''سیاہ موت'' کہتے تھے اور جو پورے پورے شہروں اور گاؤں کے لوگوں کو ختم کرکے قبرستانوں کو بھر دیتی تھی تب بھی لوگ کہتے تھے:
''دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔''
جنگ اور قحط کے کٹھن زمانوں میں بھی وہمی لوگ سہم کر کہتے تھے:
''دنیا کا خاتمہ قریب ہے...''
بہرحال، دنیا ختم نہیں ہوئی۔
اب ہم جانتے ہیں کہ آسمان پر کسی شہاب‌ثاقب کا ظہور کوئی مافوق الفطرت علامت نہیں ہے۔ شہاب‌ثاقب سورج کے گرد اپنے راستے پر چلتا رہتا ہے اور وہ اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا کہ زمین پر وہمی لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔
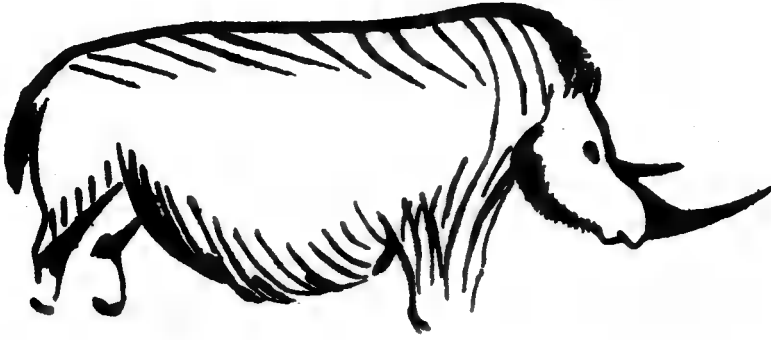
ایک گینڈے کی ڈرائنگ غار کی دیوار پر — ہمارے زمانے کے گینڈے
کی طرح نہیں کیونکہ اس کے لمبے جھبرے بال تھے

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قحط اور بیماریوں اور حتی کہ جنگوں کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ کسی آفت کا سبب جاننا سب سے اہم بات ہے۔ اگر تم کو اس کا سبب معلوم ہو تو آفت پر قابو پانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

بہرنوع صرف جاہل اور بیوقوف لوگ ہی دنیا کے خاتمے کی پیش گوئی نہیں کرتے۔ ایسے سائنس‌داں بھی ہیں جو دنیا اور بنی‌نوع انسان کے خاتمے کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ بنی‌نوع انسان آخر میں ایندھن کی کمی سے تباہ ہوجائے گی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کوئلے کے ذخیرے برابر کم ہوتے جا رہے ہیں، جنگل بھی چھدرے ہو رہے ہیں اور غالباً اتنا تیل نہ ہوگا کہ وہ آئندہ چند صدیوں تک کام دے سکے۔ جب دنیا میں ایندھن نہ رہجائے گا تو فیکٹریوں میں مشینیں رک جائیں گی، ٹرینیں نہ چل سکیں گی، سڑکوں پر اور گھروں میں روشنی نہ رہے گی۔ ان سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ زیادہ‌تر لوگ سردی اور بھوک سے مرجائیں گے اور جو بچ رہیں گے وہ پھر جنگلی اور وحشی ہو جائیں گے۔

یہ یقیناً بہت ہی خراب مستقبل ہے!

لیکن کیا ایسے ہی حالات واقعی ہوں گے؟

زمین کے ایندھن کے ذخیرے بہت ہی زبردست ہیں۔ کوئلے اور تیل کے نئے نئے ذخیرے دریافت کئے جا رہے ہیں اور دریافت کئے جائیں گے۔ جنگل صرف کاٹے ہی نہیں جاتے بلکہ ہر سال نئے بھی لگائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی دن ایندھن کے یہ ذخیرے ختم بھی ہوجائیں تو کیا اس دنیا کا واقعی خاتمہ ہو جائے گا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔

کیونکہ دنیا میں ایندھن ہی روشنی اور حرارت کا وسیلہ نہیں ہے۔ حرارت کا سب سے بڑا مخزن سورج ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہ ہونا چاہئے کہ اس وقت تک جبکہ ہمارے ایندھن کے ذخیرے ختم ہوں گے سائنس‌داں رات کو سڑکوں پر اور گھروں میں روشنی کےلئے، ٹرینیں اور مشینیں چلانے کےلئے حتی کہ کھانا پکانے کےلئے سورج کی گرمی کے استعمال کا طریقہ معلوم کرلیں گے۔ شمسی حرارت سے چلنےوالے پہلے تجرباتی بجلی گھر اور شمسی حرارت سے کام کرنے والے پہلے باورچی‌خانے وجود میں آچکے ہیں۔

''اچھا، ایک منٹ رکئیے!،، وہ لوگ کہتے ہیں جن کو دنیا کے خاتمے کی عجلت ہے ''بہرحال، سورج بھی ایک دن ٹھنڈا پڑجائےگا۔ وہ اتنا گرم اور روشن نہیں ہے جتنے کہ بعض نئے ستارے ہیں۔ کروڑوں سال گزرنے پر سورج کی حرارت کم ہو جائے گی اور اس سے زمین پر زیادہ ٹھنڈک ہو جائے گی۔

''بڑے بڑے گلیشیر انسان کی کمزور عمارتوں کو دنیا سے مٹا دیں گے۔ قطبی ریچھ منطقۂ حارہ میں گھومیں گے۔ لوگ بالکل نہیں بچیں گے۔،،

اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی نیا برفانی دور شروع ہوا تو زندگی بہت ہی خوفناک ہوجائے گی۔ لیکن زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی بھی کسی نہ کسی طرح اس برف سے بچ گیا تھا۔ ہم ایسی بات کیوں سوچیں کہ مستقبل کے لوگ جبکہ سائنس آج سے کہیں زیادہ ترقی پر ہوگی، برف میں تباہ ہوجائیں گے؟

ہم یہ تک پیش‌گوئی کر سکتے ہیں کہ وہ سردی پر قابو پانے کےلئے کیا کریں گے۔ وہ سورج کی حرارت کے علاوہ ایٹمی حرارت استعمال کریں گے۔

اور مادے کے نواتوں میں ایٹمی توانائی کی جو مقدار ہے وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ صرف سوال یہ ہے کہ اس کو حاصل کیا جائے۔

بہرحال اب ہمیں مستقبل بعید کو چھوڑکر ماضی‌بعید یعنی زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کی طرف واپس جانا چاہئے۔

دنیا کی ابتدا

اگر آدمی ان زنجیروں کو نہ توڑ دیتا جن سے وہ اپنے جنگل کا پابند ہوتا تھا تو جنگلی دنیا کی موت کے ساتھ آدمی کا بھی خاتمہ ہوجاتا۔

لیکن دنیا ختم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صرف تبدیل ہو رہی تھی۔ پرانی دنیا کا خاتمہ ہو رہا تھا اور نئی کی ابتدا۔ اس نئی دنیا میں، تبدیل شدہ دنیا میں اپنا وجود

برقرار رکھنے کےلئے آدمی کو بھی بدلنا تھا۔ جس غذا کا وہ عادی تھا وہ غائب ہو چکی تھی، اس کو نئی غذا کی تلاش کرنا سیکھنا تھا۔ صنوبر اور چیڑ کے پھل اس کے دانتوں کےلئے بہت سخت تھے۔ وہ جنوبی جنگلوں کے نرم اور رس‌دار پھلوں کی طرح بالکل نہیں تھے۔

گرم دن ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج زمین کو فراموش کر بیٹھا ہے اور لوگوں کو اس کی گرم روشنی کے بغیر زندگی بسر کرنا سیکھنا تھا۔

ان کو تیزی کے ساتھ بدلنا تھا۔

تمام جانداروں میں صرف زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی میں ہی تیزی کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے اپنے کو اس طرح تبدیل کرنا سیکھ لیا تھا جیسا کہ کوئی اور جانور نہیں کر سکتا تھا۔

آدمی کا سب سے بڑا دشمن، تیز دانتوں‌والا چیتا، یکدم لمبے بالوں‌والا اونی کوٹ نہیں پیدا کرسکا لیکن آدمی نے ایسا کرلیا۔ اس کےلئے اسے صرف ریچھ کو مارکر اس کی کھال نکالنی پڑی۔

تیز دانت‌والا چیتا آگ نہیں بنا سکتا تھا لیکن آدمی ایسا کر سکتا تھا۔ اس نے آگ کا استعمال جان لیا تھا۔ زمانۂ‌تاریخ سے قبل کا آدمی اپنے کو اور کچھ حد تک قدرت کو تبدیل کرنے کےلئے کافی آگے بڑھ چکا تھا۔

اور حالانکہ اس بات کو ہزارہا سال گزر چکے ہیں ہم دیکھ‌سکتے کہ زمانۂ‌تاریخ سے قبل کے آدمی نے قدرت میں کیا تبدیلیاں کیں اور وہ خود کیسا بدل گیا۔

پتھر کے صفحات کی کتاب

ہمارے قدموں کے نیچے کی زمین ایک ضخیم کتاب کی طرح ہے۔

زمین کی اوپری سطح کا ایک ایک پرت، تہوں کا ہر ایک پرت کسی کتاب کے صفحہ کی طرح ہے۔

ہم ان صفحوں کے اوپر اور سب سے آخری صفحے پر رہتے ہیں۔ سب سے پہلے صفحے سمندروں کی تہہ میں ہیں۔ وہ سمندر کی تہہ کی گہرائیوں اور براعظموں کی بنیادوں کے اندر ہیں۔

جدید انسان ابھی تک ان صفحات تک نہیں پہنچا ہے، کتاب کے پہلے ابواب تک۔ ابھی تک ہم صرف یہ قیاس ہی کر سکے ہیں کہ ان میں کیا لکھا ہوگا۔

لیکن اوپر کے حصے سے صفحات جتنے قریب ھیں اتنا ھی ھمارے لئے کتاب کا پڑھنا آسان ھے۔ بعض صفحات جو لاوا کے گرم دھاروں سے جھلس کر بدشکل ھو گئے ھیں ھمیں بتاتے ھیں کہ کس طرح زمین کی سطح کے اوپر پہاڑی سلسلوں کی محراب تھی۔ دوسرے صفحات ھمیں بتاتے ھیں کہ کس طرح زمین کی اوپری سطح ابھری اور پھر بیٹھ گئی، اس نے سمندروں کو پھیلایا اور پھر ان کو پرانے ساحلوں پر واپس لائی۔

ایسی پرتیں بھی ھیں جو سمندری گھونگھوں کی طرح سفید ھیں اور انھیں سے بنی بھی ھیں۔ اس کتاب میں کوئلے کی طرح کالے صفحات بھی ھیں۔ اور وہ سچ مچ کوئلے سے بنے ھیں اور ھم کو ان زبردست جنگلوں کے بارے میں بتاتے ھیں جو کسی زمانے میں ھماری زمین پر تھے۔

یہاں وھاں کسی کتاب کی تصویر کی طرح ھمیں کسی پتے پر چھاپے یا جانوروں کے ڈھانچے ملتے ھیں جو ایسی جھاڑیوں میں رھتے تھے جو بعد کو کوئلے میں تبدیل ھو گئیں۔
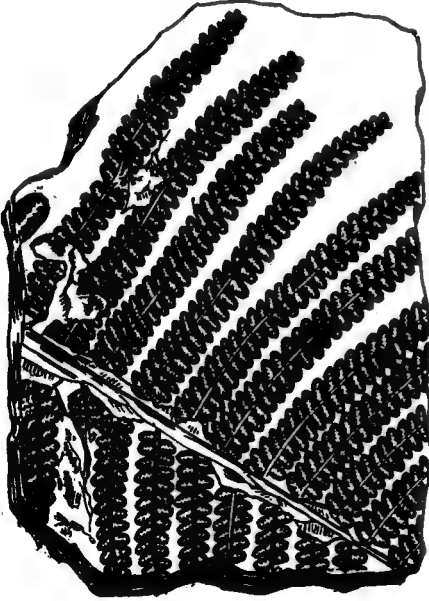
اس طرح صفحہ بصفحہ ھم زمین کی تاریخ پڑھ سکتے ھیں۔ صرف سب سے آخری صفحوں پر، کتاب میں سب سے اوپر ھمیں آخرکار نیا ھیرو یعنی آدمی ملتا ھے۔ ابتدا میں یہ خیال کیا جا سکتا ھے کہ یہ آدمی اس بڑی کتاب کا مرکزی کردار نہیں ھے کیونکہ وہ زمانۂ تاریخ سے قبل کے دیوپیکر ھاتھی اور گینڈے کے سامنے بہت چھوٹا معلوم ھوتا ھے لیکن جوں جوں ھم آگے پڑھتے جاتے ھیں ھم دیکھتے ھیں کہ نیا ھیرو زیادہ باھمت ھوتا جاتا ھے اور اول مقام پر آتا جاتا ھے۔

اور پھر وقت آتا ھے جب آدمی صرف اس بڑی کتاب کا مرکزی کردار ھی نہیں ھوتا ھے بلکہ اس کے مصنفوں میں سے ھوجاتا ھے۔

دریائی پرتوں میں، برفانی دور کی تہوں کے درمیان ایک واضح سیاہ خط ملتا

فرن کی پتیوں کے یہ چھاپے کوئلے کی پرتوں میں پھیلے ھوئے ھیں

ہے ۔ یہ خط لکڑی کے کوئلے نے بنایا ہے ۔ بھلا ریت اور مٹی کے درمیان کوئلے کی یہ پرت اچانک کیسے نمودار ہوئی؟ شاید اس کی وجہ جنگل کی آگ تھی؟

لیکن جنگل کی آگ ایک بڑے علاقے میں جلی ہوئی لکڑی چھوڑ جاتی ہے اور کوئلے کی یہ لائن بہت مختصر ہے ۔ صرف ایک کیمپ فائر ہی سے کوئلے کی یہ مختصر لائن بن سکتی ہے ۔ اور صرف انسان ہی الاؤ جلا سکتا ہے ۔

اس کے علاوہ الاؤ کے قریب ہی ہمیں انسانی ہاتھ کے کام کے دوسرے نشانات بھی ملتے ہیں یعنی پتھر کے اوزار اور شکار کئے ہوئے جانوروں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ۔

آگ اور شکار یہ تھیں دو چیزیں جنھوں نے برفانی دھاوے سے زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کو بچالیا ۔

آدمی جنگل چھوڑتا ہے

زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کو شدید موسم والے شمالی جنگلوں میں غذا بہت مشکل سے ملتی تھی ۔ اسلئے اس نے جنگلوں میں ایسے شکار کی تلاش شروع کی جو ایک جگہ پڑا نہیں رہتا، اس کا منتظر نہیں رہتا کہ کوئی اس کو اٹھائے بلکہ بھاگتا، چھپتا اور مدافعت بھی کرتا ہے ۔

گرم ملکوں تک میں بھی آدمی نے دن بدن زیادہ گوشت کھانا شروع کردیا ۔ گوشت زیادہ شکم سیر تھا، آدمی کو زیادہ طاقتور بناتا تھا اور اس کو کام کے لئے زیادہ وقت دیتا تھا ۔ آدمی کے نشوونما پاتے ہوئے دماغ کے لئے بھی زیادہ مقوی غذا کی ضرورت تھی ۔

آدمی کے اوزار جتنے بہتر ہوتے گئے شکار اتنا ہی اہم ہوتا گیا ۔ شمال میں تو شکار کے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا ۔

اب آدمی چوہے ایسے چھوٹے جانوروں سے اپنی بھوک نہیں مٹا سکتا تھا، اس کو بڑے شکار کی ضرورت تھی ۔ برفانی طوفان اور آندھیاں اور شدید پالا شمالی جنگلوں میں شکار کو مشکل بنا دیتے تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آدمی گوشت کا ذخیرہ کرے ۔

زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی کیسے جانور شکار کرتا تھا؟

اس زمانے میں جنگلوں میں بڑے بڑے جانور ہوتے تھے ۔ ہرن جنگل کے کھلے حصوں میں چرتے تھے ۔ جنگلی سور جنگلوں میں زمین کھود کر غذا تلاش کرتے تھے ۔ لیکن میدانوں میں بڑے جانوروں کی تعداد جنگلوں سے کہیں زیادہ تھی ۔ بڑے

بڑے کھلے میدانوں میں جھبرے بالوں والے وحشی گھوڑوں کے غول کے غول چرتے تھے۔ کوھانوں والے جانور ارنے بھینسے کے گلے گلے دھاڑتے ہوئے اس تیز رفتاری سے گزر جاتے تھے کہ زمین کانپ جاتی تھی۔ بڑے بڑے بالوں والے عظیم الجثہ جانور میموتھ چلتے پھرتے پہاڑوں کی طرح نکل جاتے تھے۔

جہاں تک آدمی کا سوال تھا یہ سب اس کےلئے متحرک اور فرار کرنےوالے گوشت کی طرح تھا جو اس کو پیچھا کرنے کا لالچ دلاتا تھا۔

اس طرح شکار کی تلاش میں زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی نے جنگل چھوڑا۔ آدمی رفتہ رفتہ میدانوں میں آگے پھیلتا گیا۔ ہم کو ان کے الاؤں اور شکاری کیمپوں کی جگہیں جنگلوں سے دور ایسے مقامات پر ملتی ہیں جہاں یہ ذخیرہ کرنےوالے نہ پہلے کبھی رہتے تھے اور نہ رہ سکتے تھے۔

الفاظ کو ٹھیک سے پڑھنا چاہئے

شکار کئے ہوئے جانوروں کی ھڈیاں زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کے پڑاؤں کے قریب پائی جا سکتی ہیں۔ ان میں گھوڑے کی زردی‌مائل ھڈیاں، بیلوں کی سینگ‌دار کھوپڑیاں اور جنگلی سوروں کے ٹیڑھے دانت ملتے ہیں۔ کبھی کبھی ھڈیوں کے بڑے بڑے ڈھیر بھی ملتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس ایک جگہ پر کافی مدت تک رہا تھا۔

یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ارنے بھینسوں، جنگلی سوروں اور گھوڑے کی ھڈیوں کے درمیان کبھی کبھی میموتھ کی دیوقامت ھڈیاں بھی ملتی ہیں: بڑی بڑی کھوپڑیاں، بڑے ٹیڑھے ھاتھی جیسے دانت، تیز کترنے والے دانت اور جسموں سے کاٹی ہوئی ٹانگوں کی ھڈیاں وغیرہ۔

واقعی ایسے دیوزاد کو مارنے کےلئے بڑی طاقت اور ہمت کی ضرورت تھی! لیکن اس سے زیادہ طاقت اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹنے اور ان کو پڑاؤ تک گھسیٹ کر لے جانے میں پڑتی تھی۔ ایک ایک ٹانگ کا وزن ایک ٹن کے برابر ہوتا تھا اور کھوپڑی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ پورا آدمی اس کے اندر آسانی سے کھڑا ہو سکتا تھا۔

آج کے شکاریوں تک کےلئے جو ھاتھیوں کے شکار کی خاص رائفلوں سے مسلح ہوتے ہیں قدیم میموتھ کو مارنا آسان نہ ہوتا۔ لیکن زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کے پاس تو رائفل نہ تھی۔ اس کے پاس بس کوئی پتھر کا چاقو یا کوئی پتھریلی نوک کا بھالا ہوتا تھا۔

ہزارہا سال کے دوران ان پتھروں کے اوزاروں میں تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ زیادہ بہتر اور نوع بنوع ہو گئے ہیں۔ آدمی پتھر کا چاقو یا تیر اس طرح بناتا تھا۔ پہلے وہ پتھر کی اوپری سطح کاٹ لیتا تھا پھر ناہموار حصے برابر کرتا تھا اور اس کو ٹکڑوں میں کاٹ لیتا تھا۔ ان ٹکڑوں سے وہ ضرورت کے مطابق کاٹ کرنے والے اوزار بناتا تھا۔

چقماق پتھر جیسی نامناسب اور سخت چیز سے چاقو بنانا بڑی مہارت کی بات تھی۔ اسی‌لئے زمانۂ‌تاریخ سے قبل کا آدمی اپنا پتھر کا اوزار استعمال کرنے کے بعد پھینکتا نہیں تھا بلکہ اس کی قدر کرتا تھا اور جب وہ کند پڑجاتا تھا تو اس کو تیز کرلیتا تھا۔ آدمی اپنے اوزاروں کو بہت عزیز رکھتا تھا کیونکہ وہ اپنی محنت اور وقت کی قدر کرتا تھا۔

بہرحال، وہ چاہے جتنی بھی کوشش کرتا اس کا پتھر تو پتھر ہی تھا۔ اس کا پتھر کی نوک‌والا بھالا کسی میموتھ سے سامنا ہونے پر بیکار ہوجاتا تھا۔ جانور کی موٹی کھال اسے اسی طرح محفوظ رکھتی تھی جیسے فولاد کی چادر ٹینک کو محفوظ رکھتی ہے۔

روبنسن کروسو ویران جزیرے پر
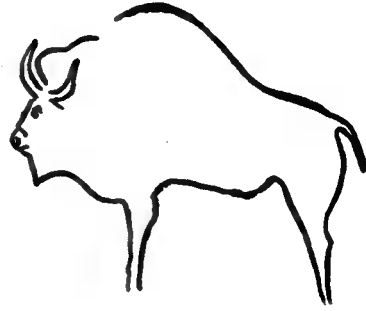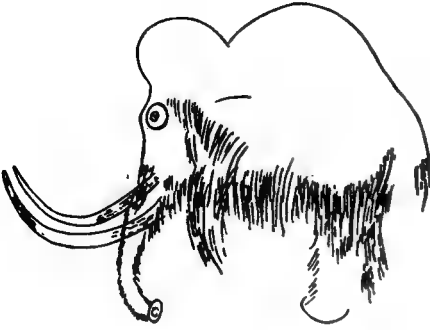
میموتھ، ارنا بھینسا اور گھوڑا جو کسی قدیم زمانے کے فن‌کار نے بنائے ہیں

پھربھی زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی میموتھ کو مارتا تھا۔ اس کا ثبوت ہمیں میموتھ کی ان کھوپڑیوں اور بڑے دانتوں سے ملتا ہے جو مختلف پڑاؤں پر ملے ہیں۔

آدمی میموتھ کا شکار کیسے کرتا تھا؟ یہ صرف وہ سمجھ سکتا ہے جو لفظ ''آدمی'' کو سمجھ سکتا ہے جو کہتا ہے ''آدمی'' اور سوچتا ہے ''لوگوں'' کے بارے میں۔ ایک آدمی اکیلا نہیں بلکہ لوگ اپنی متحدہ کوششوں سے اوزار بنانا، شکار کھیلنا، آگ جلانا، پناہ گاہیں بنانا اور زمین گوڑنا جوتنا سیکھتے تھے۔ صرف تنہا آدمی نے نہیں بلکہ پوری انسانی سوسائٹی نے کروڑوں آدمیوں کی محنت کے ذریعہ کلچر اور سائنس کی تخلیق کی ہے۔

اکیلا آدمی تن‌تنہا ہمیشہ جنگلی جانور ہی رہتا لیکن انسانی سوسائٹی کے اندر کام نے جانور کو آدمی بنا دیا۔

ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں زمانۂ تاریخ سے قبل کے شکاری کو قدیم زمانے کے روبنسن کروسو کی طرح دکھایا گیا ہے جو استقلال کے ساتھ محنت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ بڑی ترقی کے درجات تک پہنچ گیا۔

لیکن اگر زمانہ تاریخ سے قبل کا آدمی واقعی ایسا ہی گوشہ نشین ہوتا اور اگر پہلے آدمی بڑے بڑے غولوں کی صورت میں نہیں بلکہ صرف خاندانوں میں رہتے تو وہ کبھی ''لوگ،، نہ بنتے اور نہ کوئی مشترک تہذیب پیدا کر سکتے۔

اور روبنسن کروسو کا بھی انجام ویسا نہ تھا جیسا ڈینیل ڈیفو نے پیش کیا ہے۔ ڈیفو کی کتاب کی بنیاد ایک ملاح کی سچی کہانی ہے جس نے اپنے جہاز پر بغاوت اکسائی تھی۔ اس کو سمندر کے بیچوں‌بیچ ایک جزیرے میں چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ موت کا شکار ہوجائے۔ بہت برسوں بعد کچھ بحری مسافر اس جزیرے پر آئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ آدمی بالکل جنگلی ہوگیا ہے۔ بڈھا ملاح بات‌چیت کرنا بالکل بھول گیا تھا اور وہ انسان سے زیادہ جنگلی جانور معلوم ہوتا تھا۔

اگر موجودہ دور کا آدمی تنہائی میں آسانی سے آدمی نہیں رہ سکتا تو بھلا زمانہ تاریخ سے قبل کے لوگوں کے بارے میں سوچو!

ان کو صرف یہی ایک چیز آدمی بناتی تھی کہ وہ ایک ساتھ رہتے تھے، ایک ساتھ شکار کھیلتے تھے اور اپنے اوزار ساتھ مل کر بناتے تھے۔

آدمیوں کا پورا غول کسی عظیم الجثہ قدیم جانور کی گھات لگاکر شکار کرنے میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے پہلوؤں پر ایک نہیں بلکہ درجنوں بھالے پڑتے تھے انسانی غول اس جانور کا اس طرح پیچھا کرتا تھا جیسے یہ غول خود کوئی بہت سے پیروں اور بازوؤں‌والا جانور ہو۔ صرف درجنوں ہاتھ ہی نہیں بلکہ درجنوں دماغ بھی ساتھ ملکر کام کرتے تھے۔

حالانکہ میموتھ آدمیوں سے کہیں زیادہ بڑا اور طاقتور ہوتا تھا پھربھی آدمی زیادہ ہوشیار تھے۔

میموتھ تو اتنا بڑا ہوتا تھا کہ وہ آسانی سے آدمی کو روندکر ختم کر سکتا تھا لیکن زمانہ تاریخ سے قبل کے آدمی نے میموتھ کا زبردست وزن اس کے خلاف استعمال کیا اور اس دیوپیکر کو جیت لیا جس کے قدموں تلے زمین کانپتی تھی۔

میموتھ کو گھیرنے کے بعد شکاری چاروں طرف کی خشک جھاڑیوں کو آگ لگا دیتے تھے۔ جانور شعلوں سے بہت ہی دہشت‌زدہ ہوجاتا تھا۔ اس کی جھبری کھال سلگنے اور دھواں دینے لگتی تھی اور وہ بھاگ نکلتا تھا اور آگ اس کا پیچھا کرتی تھی، اس کو سیدھا کسی دلدل کی طرف لےجاتی تھی جیسا کہ شکاری ہوشیاری سے منصوبہ بناتے تھے۔ وہاں وہ اس طرح مٹی اور کیچڑ میں دھنس جاتا جیسے پتھر کا مکان دلدل میں دھنس جاتا ہے۔ وہ دلدل سے نکلنے کےلئے پیر مارتا لیکن اس سے وہ اور گہرا دھنس جاتا۔

اس وقت شکاری اس کو مارنے کےلئے گھیرلیتے۔ کسی میموتھ کو پھنساکر مارنا آسان نہ تھا۔ لیکن اس کو پڑاؤ تک گھسیٹ کر لےجانا اس سے بھی مشکل تھا

جو عموماً دریا کے اونچے اور خشک کنارے پر ہوتا تھا کیونکہ دریا لوگوں کو پینے کا پانی مہیا کرتا تھا اور اتھلے پانی اور کناروں پر پتھر ملتا تھا جو ان کے اوزاروں کے لئے خاص چیز تھا ۔ اب اس کا مطلب یہ تھا کہ میموتھ کو دلدل کے نشیب سے اوپر کی طرف گھسیٹنا ہوتا تھا ۔

یہاں بھی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں ھاتھ کام کرتے تھے ۔ لوگ اپنے تیز دھاروں والے پتھر جانور کی موٹی کھال، سخت جوڑوں اور بڑے بڑے پٹھوں کو کاٹنے اور چیرنے کے لئے استعمال کرتے تھے ۔ جو زیادہ تجربےکار پرانے شکاری تھے وہ کمسن لوگوں کو سکھاتے تھے کہ کھوپڑی اور پیروں کو جسم سے الگ کرنے کے لئے کہاں کاٹنا چاھئے ۔ آخرکار جب پوری راس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے تو واپس جانے کے لئے طویل سفر شروع ہوتا ۔

کام کو تیز بنانے کے لئے وہ ھانک پکار کرتے تھے اور کسی بڑے پیر یا سر کو جس کی سونڈ راستے پر لوٹتی چلتی گھسیٹنے کے لئے وہ اپنے کو بڑے بڑے غولوں میں تقسیم کرلیتے ۔

تھکن سے چور وہ آخرکار پڑاؤ پر پہنچ جاتے ۔ کیسا جشن ہوتا! وہ جانتے تھے کہ میموتھ کے شکار کا مطلب واقعی زوردار دعوت ہے، ایسی دعوت جس کے لئے ان کو مدتوں انتظار کرنا پڑتا تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا مطلب بہت دنوں کے لئے کھانے کا ذخیرہ ہے ۔

مقابلے کا خاتمہ

دوسرے جانوروں سے آدمی کا مقابلہ ختم ہوگیا تھا ۔ وہ دوڑ میں سب سے آگے تھا کیونکہ اس نے سب سے بڑے جانور پر فتح پائی تھی ۔

دنیا میں آدمیوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی ۔ ہر دور اور ہر صدی کے ساتھ آدمیوں میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ دنیا کے ہر حصے میں آدمی ہوگئے ۔

آدمی کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ کسی دوسرے جانور کے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا ۔ مثال کے طور پر کیا خرگوشوں کی تعداد بھی اتنی ہی کثیر ہو سکتی تھی جتنی آدمیوں کی؟

نہیں ۔ کیونکہ اگر خرگوشوں کی تعداد بڑھتی تو بھیڑیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا اور وہ خرگوشوں کی تعداد کم ہی رکھتے ۔

اس کا مطلب ہے کہ جنگلی جانوروں کی تعداد لامتناہی نہیں بڑھ سکتی ۔ ایک حد ہے جس کے آگے ان کا بڑھنا مشکل ہے ۔ آدمی نے مدتوں ہوئے ان سرحدوں اور

پابندیوں کو ختم کر دیا ہے جو قدرت نے اس کے ایسے جانوروں پر عائد کی تھیں۔ جب اس نے اوزار بنانا سیکھا تو ایسی چیزیں کھانے لگا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھیں۔ اس طرح اس نے قدرت کو مجبور کیا کہ اس سے زیادہ مہربانی کا برتاؤ کرے۔ جہاں آدمیوں کا ایک ھی غول غذا کی تلاش کرتا تھا وھاں اب دو تین غول رہ سکتے تھے۔

اور جب اس نے بڑے بڑے جانوروں کا شکار شروع کیا تو اس کی سرحدوں میں اور وسعت پیدا ہوگئی۔

اب آدمی کو سارے دن نہیں چرنا پڑتا تھا، اس کو پودوں کی تلاش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اس کے لئے ارنے بھینسے ، گھوڑے اور میموتھ چرتے تھے۔ ان چوپایوں کے گلے میدانوں میں پھرتے تھے، گھاس کے میدان کے میدان چرجاتے تھے۔ دن بدن، سال بسال ان کا وزن بڑھتا جاتا تھا۔ ٹنوں گھاس کو وہ منوں گوشت میں تبدیل کر دیتے تھے۔ اور جب آدمی کسی ارنے بھینسے یا میموتھ کو مارتا تھا تو وہ توانائی کے ایک بڑے ذخیرے کا مالک بن‌جاتا تھا جو کئی برسوں کے دوران جمع کیا گیا تھا۔

اس کو ان توانائی کے ذخیروں کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ وہ طوفان، آندھی اور سخت سردی میں شکار کے‌لئے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ زمانہ گزر چکا تھا جب جاڑے اور گرمی دونوں میں خوشگوار گرمی ھوتی تھی۔

بہرحال ایک تبدیلی کی وجہ سے دوسری تبدیلی ھوتی رھی۔

اگر آدمی نے ذخیرہ کرنا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ ھوا کہ اسے ایک جگہ پر زیادہ مدت کے‌لئے رھنا تھا یعنی اس کے‌لئے پڑاؤ کو اکھاڑنا زیادہ دشوار ھوگیا۔ بہرحال وہ شکار کئے ھوئے دیوپیکر جانور کی راس کو اپنے ساتھ گھسیٹتا کہاں پھر، سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کے بسنے کے دوسرے اسباب بھی تھے۔ اگلے زمانے میں ایک رات کے‌لئے ہر درخت اس کا گھر بن‌جاتا تھا جو اس کو جنگلی جانوروں سے پناہ دیتا تھا۔ اب اس کو ان جانوروں سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس کا ایک نیا دشمن جاڑا تھا۔

آدمی کو سردی اور برفانی طوفانوں سے بچنے کے‌لئے معتبر پناہ‌گاہ کی ضرورت تھی۔

آدمی اپنی دنیا بناتا ہے

آخرکار وہ وقت بھی آیا جب آدمی نے اپنے چاروں طرف کی بڑی اور سرد دنیا کے درمیان اپنی چھوٹی سی گرم دنیا کی تعمیر شروع کی۔ کسی غار کے داخلے پر، یا کسی پہاڑی کی کگر کے نیچے اس نے بارش، برفباری اور ھوا سے بچنے کے‌لئے جانوروں کی

کھالوں اور شاخوں کی چھت بنائی۔ اپنی چھوٹی سی دنیا کے بیچ میں اس نے وہ سورج روشن کیا جو رات میں روشنی دیتا تھا اور جاڑوں میں اسے گرم رکھتا تھا۔

زمانۂ تاریخ سے قبل کے شکاری پڑاؤں کے خیموں کی میخوں کے گڈھے ابھی تک بعض جگہ پائے جاتے ہیں۔ ان میخوں کے حلقے کے بیچ میں وہ جلے ہوئے پتھر ہیں جو چولھے کے گرد ہوتے تھے۔ یہی چولھا زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کا سورج تھا۔

دیواریں مدت ہوئی گر کر خاک میں مل گئی ہیں لیکن ہمیں بالکل ٹھیک معلوم ہے کہ وہ کہاں تھیں۔ چھوٹی سی دنیا کی ساری سطح ان آدمیوں کی کہانی بتاتی ہے جنھوں نے اس دنیا کو بنایا تھا۔

پتھر کے چاقو اور کرچھنی، پتھر کے تیز دھاروالے ٹکڑے، جانوروں کی کٹی ہوئی ہڈیاں، چولھے کا کوئلہ اور راکھ — یہ سب چیزیں ریت اور مٹی میں اس طرح ملی ہوئی پائی جاتی ہیں جو قدرتی حالات میں کبھی نہیں ملتیں۔

ہم جیسے ہی ان معدوم پڑاؤں کی نظر نہ آنےوالی دیواروں کے پیچھے قدم رکھتے ہیں وہ تمام چیزیں غائب ہوجاتی ہیں جو ہمیں آدمی کے کام کے بارے میں یاد دلاتی ہیں۔ نہ تو زمین میں اوزار دفن نظر آتے ہیں، نہ چولھے سے کوئلہ، راکھ یا جانوروں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں نکلتی ہیں۔

اس طرح ابھی‌تک آدمی کی بنائی ہوئی دنیا اس کے چاروں طرف کی ہر چیز سے ایک نظر نہ آنےوالی لائن کے ذریعہ الگ ہوتی ہے۔

جب ہم آدمی کی دستکاری کے نشانات ڈھونڈھنے کےلئے زمین کو کھودتے ہیں، جب ہم پتھر کے چاقو اور چھینیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور چولھے کے اس کوئلے کو چھانتے ہیں جو ہزارہا برس سے ٹھنڈا پڑا ہے تو ہمیں صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ پہلی دنیا کا خاتمہ نسل انسانی کا خاتمہ نہیں تھا کیونکہ انسان خود اپنے لئے ایک چھوٹی سی نئی دنیا بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

پانچواں باب

ماضی میں پہلا سفر

ارنے بھینسوں اور میموتھ کا شکار کرنےوالوں کے پڑاؤں پر جو اوزار پائے گئے ہیں ان میں دو پتھر کے اوزار بہت عام ہیں۔ ایک بڑا اور مثلث کی شکل کا ہے اور اس کو دو طرف سے تیز کیا گیا ہے، دوسرا چھوٹا، هلکا اور لمبا ہے جس کی دھار تیز کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر اوزار کسی خاص کام کےلئے بنایا گیا ہے ورنہ ان کی شکلیں مختلف نہ ہوتیں۔ ہمیں کیسے پتہ چلے کہ انمیں سے ہر ایک کا استعمال کیا تھا؟

ان اوزاروں کی شکلیں اس کا کچھ پتہ بتاتی ہیں۔

وہ دونوں تیز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سے چاقو یا کلہاڑی کی طرح کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا۔ ان میں ایک زیادہ بڑا اور بھاری تھا۔ اس لئے اس کا استعمال زیادہ سخت کام میں ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے استعمال کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت تھی۔

بھلا یہ کون سا کام تھا؟

آؤ پتھر کے زمانے کو واپس چلیں اور دیکھیں کہ زمانۂتاریخ سے قبل کا آدمی اپنے اوزاروں کو کیسے استعمال کرتا تھا۔

اکثر ہم کو اس طرح کا جملہ کسی ناول میں ملتا ہے ”آؤ، دس سال پیچھے واپس جائیں۔“ ایسی کتاب کے مصنف کےلئے یہ آسان بات ہے کیونکہ وہ جہاں چاہے اور جب چاہے واپس جا سکتا ہے۔ اور وہ اپنے کرداروں کے بارے میں انتہائی ناقابل یقین باتیں کہہ سکتا ہے۔

لیکن ہم اپنی سچی کہانی میں کیا کریں؟ ہمیں کسی بات کو اپنی طرف سے لکھنے کا حق نہیں ہے۔ اور پھر جب ہمیں واپس جانا ہوتا ہے تو ہم ہزارہا سال پیچھے واپس جاتے ہیں!

بہرنوع، ہم پتھر کے زمانے تک واپس جا سکتے ہیں۔

اگر تم یہ چاہتے ہو تو تمہارے پاس ایسے طویل سفر کےلئے سارا سازوسامان ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے تو تمہارے پاس ایک کنویس کا خیمہ ہونا چاہئے جس کا فرش بھی کنویس کا ہو اور جو کسی سفری تھیلے میں تہہ کرکے رکھا جا سکے۔ پھر خیمے کے ستون اور رسیاں باندھنے کےلئے میخیں چاہئیں اور ایک ہتھوڑی بھی جس سے میخیں زمین میں ٹھونک کر گاڑی جا سکیں۔ اس کے علاوہ کئی اور چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ سورج کی تپش سے محفوظ رہنے کےلئے کارک کا ایک خود، کلہاڑی، کڑاہی، کھانا پکانے کا چولہا، کٹورہ، چھری اور چمچہ، ایک قطب‌نما اور نقشہ۔ جب تم یہ سب چیزیں اچھی طرح باندھلو اور اپنی رائفل لےلو (کیونکہ اگر تم پتھر کے زمانے میں اپنی غذا کےلئے شکار نہیں کر سکتے تو تمہاری زندگی ناممکن ہے) تو کسی بندرگاہ جاؤ اور اسٹیمر کا ٹکٹ خرید لو۔

لیکن ٹکٹ بابو سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم پتھر کے زمانے کو جا رہے ہو کیونکہ اگر تم اس سے یہ کہوگے تو وہ تم کو پاگل سمجھ کر ڈاکٹر بلائے گا۔

تمہارے ٹکٹ پر یہ نہیں لکھا ہوگا کہ "پتھر کے زمانے کو واپسی ٹکٹ"۔ ٹکٹ بالکل معمولی ہوگا۔ اس پر "میلبورن" لکھا ہوگا جو تمہاری منزل ہے۔

جب ٹکٹ تمہاری جیب میں پہنچ جائے تو تم آسٹریلیا جانےوالے مسافر جہاز پر بیٹھ سکتے ہو۔ چند ہفتوں میں تم میلبورن پہنچ جاؤگے۔

یہ جاننا بہت دلچسپ ہے کہ ابھی دنیا میں ایسی جگہیں باقی ہیں جہاں لوگ پتھر کے اوزاروں سے کام کرتے ہیں۔ آسٹریلیا میں بھی ایسی جگہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ پچھلے دوروں میں سفر کی جگہ فاصلوں کا سفر لے سکتا ہے۔ اور جب سائنسداں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ [illegible] ماضی میں لوگ کس طرح رہتے تھے تو وہ بھی کرتے ہیں۔

سوویت یونین میں زیادہ ترقی یافتہ قوموں نے پسماندہ قوموں کی تعلیم و تہذیب کی ترقی میں مدد دی ہے۔ ان کا اپنا جدید کلچر بن گیا ہے۔

لیکن ایسے ملک بھی ہیں جہاں فلک‌بوس عمارتوں‌والے بڑے بڑے شہروں سے سفر کی تمام سہولتوں کے ذریعہ تم ایسی ابتدائی زمانے کی بستیوں تک پہنچ سکتے ہیں جن میں خیموں یا بھٹوں میں گھر ہیں۔

آسٹریلیا میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو پتھر کے اوزار استعمال کرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے یہاں جا رہے ہیں یہ دیکھنے کہ وہ اپنے اوزار کیسے استعمال کرتے ہیں۔
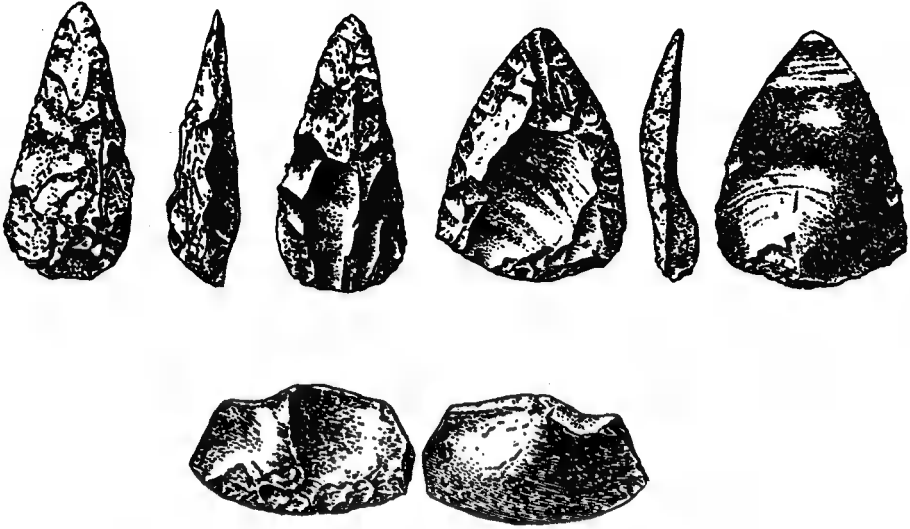
یہ اوزار بہت سارے گھنٹوں کی محنت کا نتیجہ ھیں

ہم آسٹریلیائی شکاریوں کے پڑاؤ تک جانے کےلئے ایسے خشک اور ویران میدانوں سے گزریں گے جہاں جابجا کانٹےدار جھاڑیوں کے قطعے نظر آتے ھیں۔ ہم ان کے خیموں تک پہنچ جاتے ھیں جو درختوں کی چھال اور شاخوں سے بنے ھیں اور دریا کے کنارے درختوں کی ایک گپھا میں ھیں۔ بچے خیموں کے ادھر ادھر دوڑ رہے ھیں۔ مرد اور عورتیں کام میں مصروف ھیں۔ وہ قریب ھی زمین پر بیٹھے ھیں۔ ایک بڈھا آدمی جس کی لمبی سی داڑھی ہے اور بال جھبرے ھیں ایک کنگرو کی کھال کھینچ رہا ہے۔ یہ بڈھا ایک مثلث کی شکل کا پتھر کا اوزار کاٹنے کےلئے استعمال کر رہا ہے۔ ارے، یہ تو وھی پتھر کا اوزار ہے جس کے متعلق ہم معلومات حاصل کرنے نکلے تھے!

ظاھر ہے کہ آسٹریلیا کے موجودہ زمانے کے لوگ زمانۂتاریخ سے قبل کے لوگ تو نہیں ھیں۔ ھزارھا نسلیں ان کو اپنے زمانۂتاریخ سے قبل کے اجداد سے الگ کرتی ھیں۔ ان کے پتھر کے اوزار ماضی کی معمولی سی باقیات میں سے ھیں۔ لیکن ماضی کی یہ باقیات ھمارے بہت سے معمے حل کر سکتی ھیں۔ آسٹریلیائی آدمی کو کام کرتے دیکھ کر ھمیں پتہ چلتا ہے کہ پتھر کا بڑا مثلث اوزار آدمی کا ھی اوزار ہے، ایک

شکاری کا اوزار جس سے پھندے میں آئے ہوئے یا زخمی جانور کو مارتا ہے، اس کو کاٹتا ہے اور اس کی کھال کھینچتا ہے۔

دوسرے قدیم اوزار یعنی نیم حلقےوالے دھاردار اوزار کو استعمال کے وقت دیکھنے کےلئے ہمیں اور آگے سفر کرنا ہوگا۔ ہمیں جزیرۂ تسمانیا جانا ہوگا جو آسٹریلیا کے جنوب میں ہے۔ ابھی حال تک وہاں عورتیں یہ پتھر کا اوزار کپڑا اور چمڑا کاٹنے اور چمڑے کو چھیلنے کےلئے استعمال کرتی تھیں۔

اوزاروں کے درمیان کام کی تقسیم کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کے درمیان بھی کام کی تقسیم تھی جو پتھر کے زمانے کے شکاریوں کے وقت سے شروع ہوئی تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا طرح طرح کے کام نکلتے گئے۔ ان سب کو کرنے کےلئے کچھ لوگ ایک طرح کا کام کرتے تو دوسرے دوسری طرح کا۔ جب مرد شکار کھیلنے جاتے تو عورتیں چولھے کے پاس بیکار نہیں بیٹھتیں۔ وہ نئے خیمے بناتیں، جانوروں کی کھالوں کو کاٹ کر کپڑے بناتیں، کھانےوالی جڑیں جمع کرتیں اور غذا کا ذخیرہ کرتیں۔

لیکن اس کے علاوہ محنت کی ایک اور تقسیم تھی — جوانوں اور بڈھوں کے درمیان۔

ہزار سالہ اسکول

ہر کام کو کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے اور اس کو کرنے کا علم آسمان سے نہیں نازل ہوتا۔ علم تو ایسی چیز ہے جو دوسروں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اگر ہر بڑھئی اپنا بسولا، آری اور رندہ ایجاد کرنے سے ابتدا کرے اور پھر یہ دریافت کرے کہ اس کو یہ اوزار کیسے استعمال کرنا ہیں تو زمین پر ایک بھی بڑھئی کا وجود نہ رہے۔

اگر جغرافیہ سیکھنے کےلئے ہم میں سے ہر ایک کو ساری دنیا کا سفر کرنا پڑے، امریکہ کو پھر سے دریافت کرنا پڑے، افریقہ کو تلاش کرنا ہو، کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنا پڑے، ہر خلیج اور آبنائے کا شمار کرنا پڑے تو ہم چاہے ایک ہزار سال بھی زندہ رہیں لیکن ہمارے پاس اس کےلئے کافی وقت نہ ہوگا۔

ہم جتنے ترقی کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ ہمیں مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہر نئی نسل اپنی پچھلی نسل سے زیادہ علم، معلومات اور دریافتیں حاصل کرتی ہے۔

دو سو سال پہلے ١٦ سالہ لڑکے پروفیسر بن سکتے تھے لیکن آجکل تو سولہ سالہ لڑکا آپ کو پروفیسر نہیں ملےگا!
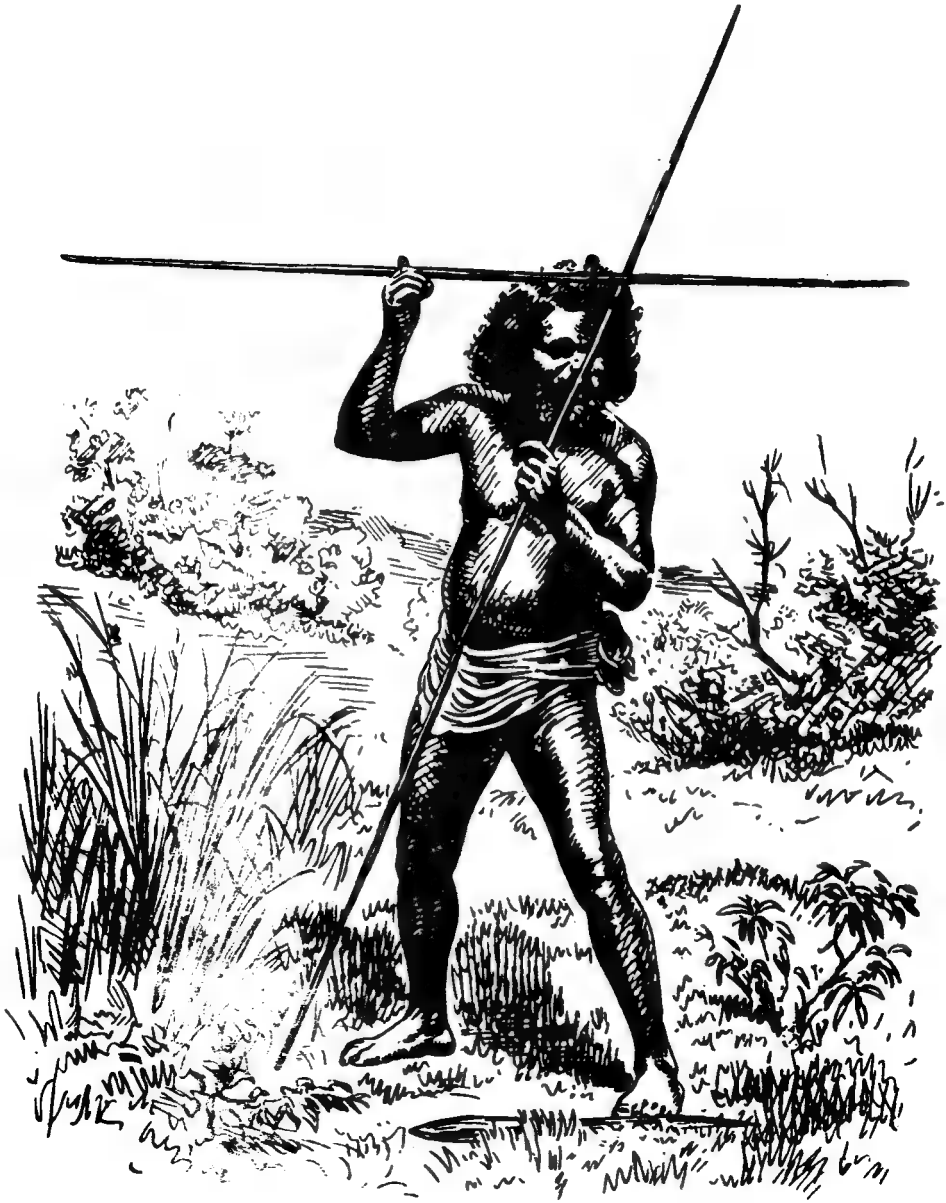
آسٹریلیا کا شکاری

هم پرائمری اور سکنڈری اسکول میں دس سال پڑھتے ھیں۔ آئندہ لوگ اس سے بھی زیادہ مدت تک پڑھیں گے کیونکہ ہر سال سائنس کے ہر شعبے میں دریافتوں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ سائنسوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ کسی زمانے میں صرف طبیعیات تھی۔ اب ارضیاتی طبیعیات اور فلکیاتی طبیعیات بھی ھیں۔ پہلے صرف کیمسٹری تھی۔ اب جیوکیمسٹری، بایوکیمسٹری اور ایگروکیمسٹری بھی ہوگئی ھیں۔ نئے علم کے دباؤ سے سائنسیں بڑھتی ھیں، تقسیم ہوتی ھیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جیسے وہ کوئی زندہ خلئے ہوں۔

ظاہر ہے کہ پتھر کے زمانے میں کوئی سائنسیں نہیں تھیں۔ آدمی کے تجربے کا ذخیرہ ابھی شروع ہوا تھا۔ آدمی کی محنت بھی اتنی پیچیدہ نہیں تھی جتنی اب ہے۔ اسی لئے آدمی کو اپنی تعلیم کی تکمیل میں زیادہ مدت نہیں لگتی تھی۔ پھربھی اس کو بہت سی باتیں سیکھنا پڑتی تھیں۔

اس کو جانوروں کا کھوج لگانے، ان کی کھال کھینچنے، خیمہ بنانے، پتھر کا دھاردار اوزار بنانے وغیرہ کے لئے علم اور مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

اور علم کہاں سے آتا ہے؟

آدمی کوئی ہنر لیکر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کو حاصل کرتا ہے۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آدمی جانوروں کی دنیا کو کتنا پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

جانور کو اپنے تمام ''زندہ اوزار،، اور ان کے استعمال کی معلومات اس کے ماں‌باپ سے وراثت میں بالکل اسی طرح ملتی ھیں جیسے اس کے سمور کا رنگ یا جسم کی ساخت۔ سور کے بچے کو یہ نہیں سیکھنا پڑتا کہ وہ کیچڑ کو کس طرح کھودے کیونکہ خاص طور سے اس مقصد کےلئے اس کو پیدائش کے دن سے ھی مضبوط تھوتھن دیا گیا ہے۔ اودبلاؤ کو یہ سکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ لکڑی کیسے چبائے کیونکہ اس کے تیز دانت قدرتی طور پر اگتے ھیں۔ اسی وجہ سے جانوروں کے یہاں نہ تو ورکشاپ ہوتے ھیں اور نہ اسکول۔

وہ ننھا سا بطخ کا چوزہ جو ابھی انڈے سے نکلا ہے مکھیاں اور مچھر پکڑنا شروع کر دیتا ہے حالانکہ کسی نے اس کو یہ نہیں سکھایا ہے۔ کوئل کا بچہ دوسروں کے گھونسلوں میں پلتا بڑھتا ہے۔ اس کے اصلی ماں‌باپ اس کی دیکھ بھال نہیں کرتے۔ لیکن جب خزاں آتی ہے تو وہ خود روانہ ہوجاتا ہے اور افریقہ کا راستہ پا لیتا ہے حالانکہ اس کو یہ راستہ کسی نے نہیں دکھایا۔

جانور یقیناً بہت کچھ اپنے والدین سے سیکھتے ھیں لیکن وہاں اسکول کی طرح کی کسی چیز کا سوال ھی نہیں اٹھتا۔

آدمیوں کے بارے میں بات بالکل مختلف ہے۔

آدمی اپنے اوزار خود بناتا ہے کیونکہ وہ ان کو لیکر نہیں پیدا ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان اوزاروں کا استعمال یا ہنر اپنے والدین سے وراثت میں نہیں پاتا۔ وہ ان کو اپنے بزرگوں اور استادوں سے سیکھتا ہے۔

ہر کاھل طالب‌علم کو بڑی خوشی ہوتی اگر لوگ قواعد اور ریاضی کی معلومات لیکر پیدا ہوا کرتے۔ پھر اسکولوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن اس سے طالب‌علم کو زیادہ فائدہ نہ ہوتا۔ اگر اسکول نہ ہوتے تو لوگ کوئی نئی بات نہ سیکھتے۔ تمام انسانی ہنر اور معلومات ایک ہی معیار پر قائم رہتے جیسے گلہری کا ہنر یا مشاقی۔

یہ آدمی کی خوش قسمتی ہے کہ وہ بنے بنائے ہنر کے ساتھ نہیں پیدا ہوتا۔ وہ سیکھتا اور سکھاتا ہے اور ہر نسل انسانی تجربات کے ذخیرے میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی ہے۔ یہ تجربات برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ بنی‌نوع انسان نامعلوم کی سرحدوں کو اور دور ڈھکیلتا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں ہر سات سال کا بچہ اسکول جاتا ہے اور ہمارا سارا ملک بھی مجموعی طور پر ایک طرح کے اسکول سے گزر رہا ہے، زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر رہا ہے۔

ہزار سالہ اسکول، انسانی محنت کے اسکول نے آدمی کو وہ کچھ بنایا ہے جو آج وہ ہے۔ اس نے آدمی کو سائنس، انجنیرنگ اور آرٹ عطا کیا ہے، اس نے اس کو تہذیبی ورثہ دیا ہے۔

آدمی سب سے پہلے پتھر کے زمانے میں اس ہزار سالہ اسکول میں داخل ہوا تھا۔ بڈھے، تجربےکار شکاری کمسن لڑکوں کو شکار کا مشکل فن سکھاتے تھے۔ جانور کو اس کے پیروں کے نشانات سے کیسے جانا جاتا ہے، جانور کے قریب بلا اس کو بھڑکائے ہوئے کیسے پہنچا جاتا ہے وغیرہ۔

آج بھی شکار کےلئے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ پھر بھی آج اس زمانے کے مقابلے میں شکاری ہونا کہیں زیادہ آسان ہے کیونکہ آج شکاری کو خود اپنے ہاتھوں سے ہتھیار نہیں بنانا پڑتے ہیں۔ پتھر کے زمانے میں شکاری اپنے ڈنڈے، کاٹنےوالے اوزار اور بھالوں کےلئے نوکیلی سینگیں خود بناتے تھے۔ بوڑھا شکاری اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو بہت کچھ سکھا سکتا تھا۔

عورتوں کے کام کےلئے بھی مہارت درکار تھی کیونکہ عورتیں تو گھرگرہستن، معمار، لکڑھارن اور درزن کا مجموعہ ہوتی تھیں۔

ہر قبیلے میں ایسے بڈھے اور تجربےکار مرد اور عورتیں ہوتی تھیں جو اپنی زندگی بھر کی معلومات اور تجربات اپنے قبیلے کے بڑے لڑکے لڑکیوں کو دیتی تھیں۔

لیکن یہ تجربات منتقل کیسے ہوتے تھے؟
اپنے تجربات کو دکھا کر اور ان کی وضاحت کر کے۔
آدمی کو اس کے لئے زبان کی ضرورت تھی۔
جانور کو اپنے بچوں کو یہ نہیں سکھانا ہے کہ اسے اپنے "زندہ اوزار" کس طرح استعمال کرنا چاہئے مثلاً پنجے اور دانت۔ جانوروں کے لئے گفتگو کرنا جاننا ضروری نہیں ہے۔
لیکن زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کو ایسا کرنا پڑتا تھا۔ اس کو ان کاموں کے لئے مشترکہ زبان کی ضرورت تھی جو وہ دوسروں کے ساتھ مل کر کرتا تھا۔ بزرگ نسل کے تجربات اور ہنر کو نوجوانوں تک پہنچانے کے لئے بھی الفاظ کی ضرورت تھی۔
تو پھر پتھر کے زمانے کے لوگ ایک دوسرے سے کس طرح بات‌چیت کرتے تھے؟

ماضی میں دوسرا سفر

آؤ، پھر ماضی کا سفر کریں۔ لیکن اس بار ہم کوشش کرینگے کہ یہ سفر پہلے والے کے مقابلے میں آسان ہو۔ کسی دوردراز ملک کا سفر کرنے کے لئے جہاز پر جانا ہی ضروری نہیں ہے۔ تم یہ سفر اپنا گھر چھوڑے بغیر بھی کر سکتے ہو۔
تم ریڈیو کو چالو کر کے اپنے کمرے کو چھوڑے بغیر ملک کے کسی حصے میں بھی پہنچ سکتے ہو۔ اگر تمہارے پاس ٹیلی‌ویژن‌سٹ ہے تو تم نہ صرف لوگوں کو سن سکتے ہو بلکہ ان کو سیکڑوں میل کی دوری پر دیکھ بھی سکتے ہو۔ ریڈیو اور ٹیلی‌ویژن نے ہمیں بڑے بڑے فاصلے طے کرنے میں مدد دی ہے۔
لیکن ہم ان لوگوں کو کیسے دیکھ اور سن سکتے ہیں جو سیکڑوں سال پہلے گزرے ہیں؟ کیا کوئی ایسی مشین یا آلہ ہے جو ہمیں وقت کے دوران سفر کرا سکتا ہے جس طرح ریڈیو اور ٹیلی‌ویژن فاصلوں کے درمیان کرا سکتے ہیں؟
ہاں، ایسی چیز ہے۔ یہ سینما ہے۔
ہم سینما کے پردے پر ساری دنیا دیکھ سکتے ہیں، صرف آج ہی کی دنیا نہیں بلکہ ماضی کے برسوں کی دنیا بھی۔
یہاں ہم ماسکو کے لال چوک پر اس جلوس کا منظر دیکھتے ہیں جو پہلی آرکٹک مہم کے ہیروؤں کے خیرمقدم کے لئے ہوا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ فضا میں ایک بہت بڑا غبارہ اڑ رہا ہے جو ایک نئے تابع‌زمین سیارہ (اسپوتنک) کی طرح معلوم ہو رہا ہے۔ یہ stratospheric غبارہ ہے۔

بہرحال، فلم کیمرہ بھی ایسا جہاز ہے جو ہم کو ماضی کے صرف ان برسوں تک لے جا سکتا ہے جن میں وہ ایجاد ہوا تھا۔ اور فلم کیمرہ کافی حال کی ایجاد ہے۔ پہلی بولتی ہوئی فلم ۱۹۲۷ء میں دکھائی گئی تھی۔

ماضی کی طرف زمانے کے دوران پیچھے سفر کرتے ہوئے ہمیں یکےبعد دیگرے جہاز بدلنا پڑیں گے اور وہ برابر خراب سے خراب تر ہوتے جائیں گے۔ مثلاً اسٹیمر سے ہم بادبانی جہاز میں جائیں گے اور بادبانی جہاز سے کسی معمولی کشتی میں۔

اب ہم ایک خاموش فلم کی اسکرین تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم ماضی کو دیکھ سکتے ہیں لیکن سن نہیں سکتے۔

فونوگراف ایجاد ہوا۔ ہم آواز سن سکتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھ سکتے کہ کون بول رہا ہے حالانکہ آواز صاف ہے۔ اور پھر ہمارے جہاز ہم کو وہاں سے آگے نہ لےجائیں گے جہاں سے وہ چلے تھے۔

کوئی فلم نہیں دکھا سکتی کہ ۱۸۹۵ء سے پہلے کیا ہوا تھا اور کوئی فونوگراف ان الفاظ کو نہیں سنا سکتا جو ۱۸۷۷ء سے پہلے ادا ہوئے تھے کیونکہ ۱۸۷۷ء میں اس کی ایجاد ہوئی۔

آوازیں مرجاتی ہیں اور صرف خطوط کی صورت میں باقی رہتی ہیں، کتابوں کی یکساں اور سیدھی سطروں میں۔

پرانے زمانے کے فوٹوؤں وغیرہ میں منجمد مسکراہٹیں اور نگاہیں ملتی ہیں۔

کسی پرانے خاندانی البم کو دیکھو۔ اس میں سبز مخمل کے گردپوش اور کانسے کے آنکڑوں کے درمیان تم کو کئی نسلوں کی زندگی نظر آئے گی۔

ایک صفحہ پر ہمیں ایک چھوٹی سی لڑکی کا دھندلا سا فوٹو نظر آتا ہے۔ وہ ۱۸۷۰ء کی لڑکیوں جیسا لباس پہنے ہے۔ وہ ایک باغ کے پھاٹک کا سہارا لئے کھڑی ہے جو صرف کسی فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو میں ہی دکھائی دیتا ہے۔

اس صفحہ پر اس کے برابر ایک دلھن سفید گاؤن پہنے موٹے، گنجے دولھا کے پاس کھڑی ہے۔ دولھا کے ھاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں ہیں اور وہ ایک سنگ مرمر کے ستون پر ھاتھ رکھے کھڑا ہے جو اوپر سے کٹا ہوا ہے۔ دولھا دلھن سے کم ازکم تیس سال عمر میں زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ دلھن کی آنکھوں میں ایساھی بھولاپن اور خوف سا ہے جیسا پہلے فوٹووالی لڑکی کی آنکھوں میں تھا۔

اور اب یہاں یہ وہ دلھن چالیس یا پچاس سال بعد ہے۔ اس کو مشکل سے پہچانا جا سکتا ہے۔ سیاہ لیس والے رومال میں اس کی پیشانی جھریوں سے بھری ہے، اس کی آنکھوں میں تھکن ہے اور اس کے گال پچک گئے ہیں۔ فوٹو کے پیچھے اسٹوڈیو کا ٹریڈمارک ہے۔ ایک ننھا فرشتہ کیمرہ لئے ہے اور اس فرشتے پر کانپتے ہوئے بوڑھے
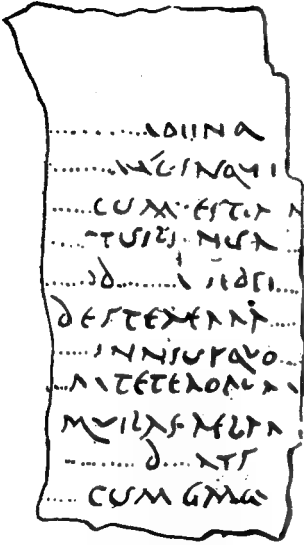
ماضی کے گواہ — چرمی کاغذ پر رومن تحریر،
مٹی کی لوح پر آشوری پیکانی تحریر اور
چٹان پر قدیم زمانے کی ڈرائنگ

ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ عبارت ہے : ’’میری عزیزترین پوتی کےلئے اس کو بہت پیار کرنےوالی دادی کی طرف سے۔‘‘

یہاں البم کے ایک صفحے پر آدمی کی پوری زندگی ہے۔

یہ فوٹو جتنے زیادہ پرانے ہیں اتنے ہی کم ان میں صاحب تصویر کے تاثر اور حرکات کی عکاسی ہوتی ہے۔ آج ہم بڑی آسانی سے کسی دوڑتے ہوئے گھوڑے یا غوطہ لگاتے ہوئے تیراک کا بہت اچھا فوٹو لے سکتے ہیں۔ لیکن ابتدائی زمانے کے فوٹوگرافر کے پاس ایک مخصوص آرام کرسی ہوتی تھی جس میں پیچ لگے ہوتے تھے۔ ان کے ذریعہ وہ فوٹو کھنچوانےوالے کا سر اور بازو ایک جگہ کس دیتا تھا تاکہ وہ خفیف سی حرکت نہ کر سکے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان فوٹوؤں کے لوگ اصلی نہیں بلکہ منجمد اور عجیب معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن ۱۸۳۸ء سے پہلے فوٹوگرافی نہیں تھی۔ اپنے سفر کے دوران ہمیں ماضی کے دوسرے مشاہدین پر پوراً بھروسہ کرنا پڑیگا حالانکہ وہ کیمرے کی طرح نہ تو مصدقہ ہیں اور نہ بالکل ٹھیک۔

اگر ہمیں ماضی کو بحال کرنا ہے تو ہمیں ان مشاہدات کا جائزہ لینا پڑیگا جو آرٹ گیلریوں، محافظخانوں اور کتب‌خانوں میں محفوظ ہیں۔

ہزارہا سال اس تیزی سے گزر جائیں گے جیسے سڑک پر سنگ‌میل کے نمبر گزرتے ہیں۔ اب ہم ۱۴۴۰ء تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے پہلے چھپی ہوئی کتابیں نہیں ہوتی تھیں۔ ٹائپ کے صاف سیاہ حروف کی جگہ کاتبوں کی لکھی ہوئی مرصع عبارت لے لیتی ہے۔ اس کا قلم رفتہ رفتہ چرمی کاغذ یا جھلی پر چلتا ہے اور ہم اس کے پیچھے آہستہ آہستہ، قدم بقدم، حرف بحرف ماضی کی طرف چلتے جاتے ہیں۔

ہم ماضی کی طرف اور زیادہ سفر کرتے جاتے ہیں اور چرمی کاغذ کی کتابوں سے، پتوں پر لکھی ہوئی تحریروں سے مندروں کی دیواروں کے پتھروں پر کندہ عبارتوں تک پہنچتے ہیں۔

اور جو تحریریں ماضی کے لوگوں سے ہم کو ملی ہیں وہ اور بھی عجیب اور پراسرار ہوتی جاتی ہیں۔ آخرکار، تحریریں بھی غائب ہوجاتی ہیں۔ ماضی کی آوازیں خاموش پڑ جاتی ہیں۔

اور اس سے پہلے کیا رہا ہوگا؟

اب ہم زمین کے اندر آدمی کے نشانات کی تلاش شروع کرتے ہیں۔ ہم بھولے بسرے قبرستانی ٹیلے کھودتے ہیں، قدیم اوزاروں، پرانی پناہ‌گاہوں کے پتھروں، مدتوں کے بجھے ہوئے چولھوں کے کوئلے کا جائزہ لیتے ہیں۔

ماضی کی یہ تمام باقیات ہمیں بتاتی ہیں کہ آدمی کیسے رہتا سہتا تھا اور کیسے کام کرتا تھا۔

لیکن کیا وہ ہمیں بتاسکتی‌ہیں کہ کیسے آدمی بولتا اور سوچتا تھا؟

اشاروں کی زبان

زمانۂ‌تاریخ سے قبل کے لوگوں کے غاروں کی گہرائیوں میں یا پڑاؤں کی جگہوں پر سائنس‌دانوں کو اس زمانے کے آدمی خود ملے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی باقیات ملی ہیں۔

۱۹۲۴ء میں سوویت ماہرین آثارقدیمہ نے سیمفیروپول کے قریب کیئک کوبا کے غار میں ایک پتھرائے ہوئے آدمی کی باقیات پائیں ۔ غار کے بیچوبیچ میں ایک چوکور گڈھا تھا جس میں آدمی کا یہ ڈھانچہ دفن تھا ۔ قریب ھی ایک بارہ سنگھے کی باقیات اور کچھ پتھر کے اوزار ملے ۔

پتھر کے ابتدائی زمانے کا ایک اور پڑاؤ ازبکستان میں تیشیک تاش کے غار میں ملا ھے ۔ زمانۂتاریخ سے قبل کے شکاری پہاڑی گھاٹی کی ڈھلوان پر رہتے تھے اور غالباً ان کے پیر بہت ھی سدھے ہوئے تھے کیونکہ ان کا خاص شکار پہاڑی بکری تھی جس کو پھنسانا اور مارنا کوئی آسان کام نہیں ھے ۔

اسی غار میں پتھر کے اوزاروں اور جانوروں کی ھڈیوں کے علاوہ ایک بچے کی کھوپڑی اور ھڈیاں پائی گئیں جو تقریباً آٹھ سال کا ہوگا ۔

پتھر کے ابتدائی زمانے کے آدمی کی پتھرائی ہوئی باقیات صرف روس ھی میں نہیں پائی گئی ھیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی ملی ھیں ۔ دراصل وہ امریکہ کے سوا تمام براعظموں پر پائی گئی ھیں ۔

چونکہ اس قسم کی پہلی دریافت جرمنی میں صوبۂرائن کی وادی کے نیان ڈیرتھال (neanderthal) نامی مقام پر ہوئی اس لئے ماہرین آثارقدیمہ نے ان باقیات کو نیان ڈیرتھال آدمی کی باقیات پکارا ۔

اب ھم اپنے ھیرو کو نیان ڈیرتھال آدمی کہیں گے ۔ ھم نے اس کو نیا نام دیا ھے کیونکہ اس کو لاکھوں سال کی مدت نے اپنے pithecanthropic اجداد سے بالکل الگ کردیا ھے ۔

اب اس کی پیٹھ زیادہ سیدھی ھے، اس کے ھاتھ زیادہ چست ھیں اور اس کے چہرے پر زیادہ آدمیت ھے ۔

عام طور پر مصنف اپنے ھیرو کے چہرے مہرے کو خیالات کی انتہائی ندرت اور بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ھے ۔ مثلاً وہ ایسی تشبیہات استعمال کرتا ھے جیسے ''اس کی شعلہ ور آنکھیں،، ''اس کی پرغرور رومن ناک،، ''اس کے بال کوے کے پروں کی طرح سیاہ تھے ۔ ،، لیکن وہ کبھی اس کے دماغ کے سائز کے بارے میں کچھ نہیں کہتا ۔

ھمارا معاملہ بالکل دوسرا ھے ۔ ھمارے لئے اپنے ھیرو کے دماغ کا سائز بہت اھمیت رکھتا ھے اور اس کی آنکھوں کے جذبات یا بالوں کے رنگ سے کہیں زیادہ ھمارے لئے دلچسپی کا باعث ھے ۔

نیان ڈیرتھال آدمی کی کھوپڑی کو احتیاط سے ناپنے کے بعد ھمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہوتی ھے کہ اس کا دماغ pithecanthropus کے دماغ سے زیادہ بڑا تھا ۔
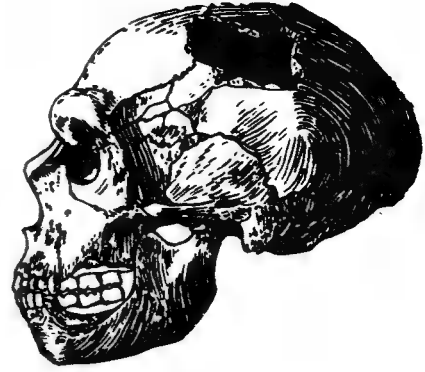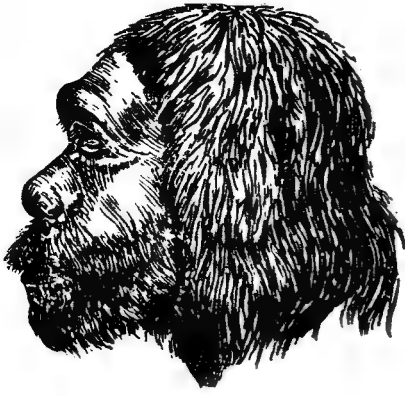
بائیں : ایک نیانڈیرتھال آدمی کا چہرہ جس کو اس کی موت کے لاکھوں سال بعد
بحال کیا گیا ہے۔ دائیں : نیانڈیرتھال آدمی کی کھوپڑی

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں سال کا کام رائگاں نہیں گیا۔ ان ہزارہا سال نے آدمی کو بالکل بدل دیا لیکن سب سے زیادہ اس کے ہاتھ اور سر بدلے کیونکہ اس کے ہاتھ کام کرتے تھے اور دماغ ہاتھوں کو ہدایت دیتا تھا۔ زمانۂتاریخ سے قبل کا آدمی پتھر کی بسولی سے کاٹ کاٹ کر پتھروں کو نئی شکل دیتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے کو اور اپنی انگلیوں کو بدل رہا تھا جو زیادہ چست اور مشاق ہوتی جاتی تھیں۔ اس کا دماغ بھی بدل رہا تھا اور زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا تھا۔

نیانڈیرتھال آدمی پر ایک نظر ڈالتے ہی تم کہ سکوگے کہ وہ بندر نہیں ہے۔ پھربھی وہ ابتک بندر سے کتنا مشابہہ ہے!

اس کی پیشانی اس کی آنکھوں کے اوپر نکلی ہوئی۔ اس کے گوشت‌خور دانت دوسروں دانتوں کے ساتھ زاویہ بناتے ہیں اور اس کے منہ سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

نیانڈیرتھال آدمی کے خدوخال میں دو چیزیں یعنی اس کی پیشانی اور ٹھوڑی اس کو ہم سے مختلف کر دیتی ہیں۔ اس کی پیشانی پیچھے کی طرف دبی ہوئی ہے اور دراصل ٹھوڑی تو بالکل غائب ہے۔

دبی‌پیشانی والی کھوپڑی کے اندر دماغ موجودہ انسان کے دماغ کے بعض حصوں سے محروم تھا۔ نچلا جبڑا جس میں ٹھوڑی غائب تھی ابھی انسانی گفتگو کے لئے موزوں نہیں ہوا تھا۔

ایسا آدمی جس کی ایسی پیشانی اور ٹھوڑی ہو ہماری طرح نہ تو سوچ سکتا تھا اور نہ باتیں کر سکتا تھا۔

پھربھی زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کو بولنا تھا۔ مشترکہ کام گفتگو کا تقاضہ کرتا تھا کیونکہ جب کئی آدمی ایک ہی کام مل کر کرتے ہیں تو ان میں کام کے بارے میں اتفاق ہونا چاہئے۔ آدمی اس وقت تک انتظار نہیں کر سکتا تھا جب تک اس کی پیشانی ترقی‌یافتہ بنے اور اس کا جبڑا زیادہ نمایاں ہو کیونکہ اس کےلئے اس کو ہزاروں سال انتظار کرنا پڑتا۔

لیکن وہ دوسروں کو اپنے خیالات کیسے بتاتا تھا؟

جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے اظہار کےلئے وہ اپنا پورا جسم استعمال کرتا تھا۔ اس کےلئے ابھی بولنے کا کوئی مخصوص عضو نہ تھا اس‌لئے اپنے ہاتھ، چہرے کے پٹھے، اپنے بازو اور پیر استعمال کرتا تھا، لیکن سب سے زیادہ اس کے ہاتھ اظہار کرتے تھے۔

تم نے کبھی کسی کتے سے باتیں کی ہیں ؟ جب کوئی کتا اپنے مالک سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھتا ہے، اپنے تھوتھن سے اس کو ٹھیلتا ہے، اس کی گود میں اپنا پنجہ رکھ دیتا ہے، دم ہلاتا ہے، جوش سے بدن کھجلاتا ہے اور جماھیاں لیتا ہے۔ وہ الفاظ تو استعمال نہیں کر سکتا اسلئے اپنا سارا جسم استعمال کرتا ہے۔ اپنے تھوتھن کی نوک سے لیکر دم کے سرے تک تاکہ اس کا پیغام مالک تک پہنچ جائے۔

زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کے پاس بھی بولنے کےلئے الفاظ نہ تھے۔ لیکن ہاتھ تھے جو اس کو اپنی بات سمجھانے میں مدد دیتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ کام کےلئے استعمال کرتا تھا اور کام کےلئے زبان کی بھی ضرورت تھی۔

یہ کہنے کے بجائے کہ ''اس کو کاٹ‌دو،، زمانۂتاریخ سے قبل کا آدمی ہاتھ سے ہوا کو کاٹ‌کر یہ بات بتاتا تھا۔ ''مجھ کو دو،، کہنے کے بجائے وہ اپنے ہاتھ پھیلا دیتا تھا۔ ''یہاں آؤ،، کہنے کے بجائے وہ اپنے ہاتھ اپنی طرف ہلاتا تھا۔ ہاتھوں کی مدد کےلئے وہ آواز بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ دوسرے آدمیوں کی توجہ اپنی طرف کرنے اور اپنے ہاتھ کے اشاروں کو دیکھنے پر مجبور کرنے کےلئے گرجتا، غراتا یا شور مچاتا تھا۔

لیکن ہمیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

جو بھی ٹوٹا ہوا پتھر کا اوزار ہمیں ملتا ہے وہ ماضی کا ایک جز ہے۔ لیکن ہمیں اشاروں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے کہاں مل سکتے ہیں؟ ہم ان ہاتھوں کے اشاروں کو کیسے بحال کر سکتے ہیں جو مدتوں ہوئے خاک میں مل چکے ہیں؟

یہ بات ناممکن ہوتی اگر یہ زمانۂتاریخ سے قبل کے لوگ ہمارے اجداد نہ ہوتے اور ہمارےلئے وراثت نہ چھوڑ گئے ہوتے۔

بولتے ہوئے ہاتھ

تھوڑے ہی دن ہوئے ایک امریکی انڈین لینن گراد آیا تھا۔ وہ ''نیز پیرس،، قبیلے کا آدمی تھا جس کے معنی ہیں ''چھیدی ہوئی ناک،،۔ وہ توماہاکوں سے مسلح انڈینوں سے بالکل نہیں ملتا تھا جن کا چرچا فینی‌مور کوپر نے بہت کیا ہے۔

اس انڈین کے پیر میں نہ تو ہرن کی کھال کے جوتے (moccasins) تھے اور نہ ٹوپی میں چڑیوں کے پر۔ وہ عام یورپی لباس پہنے تھا اور انگریزی اور اپنی قبائلی زبان دونوں روانی سے بولتا تھا۔

بہرحال، ان دو زبانوں کے علاوہ وہ تیسری زبان بھی جانتا تھا جو انڈین لوگوں میں ہزارہا سال سے محفوظ ہے۔

یہ دنیا کی سب سے سادہ زبان ہے۔ اگر تم اس کو سیکھنا چاہو تو تمہیں فعلوں کی گردانوں اور اسم وصفت وغیرہ کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں جو ہمارے لئے درد سر ہوتے ہیں۔ صحیح تلفظ کی مہارت پیدا کرنا کافی آسان بات ہوگی کیونکہ تم کو کسی لفظ کا تلفظ ادا کرنا ہی نہ پڑیگا!

تیسری زبان جو ہمارا ملاقاتی بولتا تھا وہ آوازوں کی نہیں اشاروں کی زبان تھی۔ غالباً اس زبان کی لغت اس طرح کی ہوگی۔

اشاروں کی زبان کی لغت کا ایک صفحہ

کمان — ایک ہاتھ خیالی کمان پکڑے ہے اور دوسرا ہاتھ اس کی تانت کو کھینچ رہا ہے۔

ویگوام (امریکی انڈینوں کا خیمہ) — ایک دوسرے میں جٹی ہوئی انگلیاں خیمہ دکھاتی ہیں۔

گورا آدمی — پیشانی کے اوپر ہاتھ رکھتا جو ہیٹ کے چھجے کےلئے اشارہ ہے۔

بھیڑیا — ہاتھ کی دو اٹھی انگلیاں جو دو کانوں کی شکل رکھتی ہیں۔

خرگوش — اوپر کی طرح ہاتھ کی دو اٹھی انگلیاں اور ایک حلقہ بنانےوالا اشارہ۔ یہ خرگوش کے دو اٹھے ہوئے کان اور اس کی گول پیٹھ کےلئے اشارہ ہے۔

6-2088

مچھلی — ملی ہوئی انگلیوں کے ساتھ ہاتھ کے ٹیڑھے میڑھے چلنے کا اشارہ جیسے مچھلی تیرتی ہے اور اس کی دم دائیں بائیں چلتی رہتی ہے۔
مینڈک — ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے سرے ایک بار ملے ہوئے، پھر الگ پھدکنے کی حرکت کے ساتھ۔
بادل — دونوں مٹھیاں سر کے اوپر بادل دکھاتی ہیں۔
برف — اوپر کی طرح دو مٹھیاں سر کے اوپر لیکن انگلیاں رفتہ رفتہ کھلتی ہیں اور برف کے گالوں کی طرح ناچتی ہوئی نیچے آتی ہیں۔
بارش — اوپر کی طرح مٹھیاں جو پھیلتی ہیں اور تیزی سے نیچے جاتی ہیں۔
تارہ — دو انگلیاں ملی ہوئی اور پھر الگ سر کے اوپر کافی اونچی جیسے ستارہ جھلملا رہا ہو۔

اس زبان کا ہر لفظ ہوا میں کھینچی جانےوالی تصویر ہے۔

جیسے کہ بہت ہی قدیم تحریریں بھی الفاظ میں نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ تصویروں میں ہیں اسی طرح شاید بہت ہی قدیم اشارے بھی تصویری اشارے تھے۔

ظاہر ہے کہ موجودہ انڈین قبیلوں کی اشاروں کی زبان تو زمانۂ تاریخ سے قبل کے انسان کی زبان نہیں تھی۔ موجودہ انڈین قبیلوں کی اشاروں کی زبان میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو کسی زمانۂتاریخ سے قبل کی زبان میں نہیں ملیں گے۔ یہ ہیں بہت ہی حال کے تصویری اشارے، مثلاً :

موٹر — دو پہیئے دکھانے کےلئے ہاتھوں سے دو حلقے بنانا اور خیالی اسٹیرنگ پہیئے کا گھمانا۔
ٹرین — پہیوں کو دکھانے کےلئے ہاتھوں سے دو حلقے بنانا اور پھر ہاتھ سے لہراتا ہوا اشارہ انجن کی بھاپ کو اوپر جاتے ہوئے دکھانے کےلئے۔

یہ بہت ہی نئے اشارے ہیں۔ لیکن اشاروں کی زبان میں ایسے لغتوالے اشارے بھی ہیں جو زمانۂتاریخ سے قبل کے ہیں مثلاً :

آگ — ہاتھ کا اوپر کی طرف لہراتا ہوا اشارہ کسی پڑاؤ کے الاؤ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دکھانے کےلئے۔
کام — ہاتھ سے کاٹنے کا اشارہ۔

کون جانتا ہے شاید زمانۂتاریخ سے قبل کا آدمی جب ''کام،، کہنا چاہتا ہوگا تو ہاتھ سے ہوا کو کاٹتا ہوگا۔ بہرحال پتھر کا پہلا اوزار تو بسولی تھی۔

ہماری اپنی اشاروں کی زبان

ہم نے بھی اپنی اشاروں کی زبان محفوظ رکھی ہے۔

جب ہم ''ہاں،، کہنا چاہتے ہیں تو ہمیشہ بولتے نہیں ہیں بلکہ سر ہلا دیتے ہیں۔

جب ہم ''وہاں،، کہنا چاہتے ہیں تو کبھی کبھی اس طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک مخصوص ''بولنےوالی انگلی،، ہے جس کو ہم اشارے کی انگلی کہتے ہیں۔

جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو جھکتے ہیں۔ ہم اپنا سر ہلاتے ہیں، شانے جھٹکتے ہیں، اپنے بازو اٹھاتے ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں، پیشانی پر بل ڈالکر گھورتے ہیں، اپنے ہونٹ کاٹتے ہیں، کسی پر انگلی ہلاتے ہیں، میز پر ہاتھ یا مکہ مارتے ہیں، پیر پٹکتے ہیں، ہاتھ ہلاتے ہیں، اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہیں، اپنے بازو بڑھاتے ہیں، اپنا ہاتھ دیتے ہیں اور دور سے چومتے ہیں۔

یہاں ایسی پوری گفتگو ہوتی ہے جس میں ایک لفظ بھی نہیں بولاجاتا۔

اور یہ ''بن بولی زبان،، اشاروں کی زبان، مرنا نہیں چاہتی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس میں بعض خوبیاں بھی ہیں۔ کبھی کبھی ایک اشارہ بھی کسی طویل گفتگو سے زیادہ مطلب کا اظہار کرجاتا ہے۔ کوئی اچھا ایکٹر خاموش رہنے کے باوجود اپنے چشم و ابرو اور ہونٹوں کے ذریعہ آدھہ گھنٹے کے اندر سیکڑوں الفاظ اداکر دیتا ہے بہرحال اشاروں کی زبان ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

تم کوئی بات اپنے ہاتھوں یا پیروں سے کیوں ادا کرو جبکہ تم اس کو آسانی سے الفاظ میں کہہ سکتے ہو! ہم کوئی زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی تو ہیں نہیں۔ پیروں کو پٹکنا، چیزوں کو اشاروں سے بتانا اور ہاتھوں کو ہلانا ایسی عادتیں ہیں جن کو بھول ہی جانا اچھا ہے۔

پھر بھی کبھی کبھی صرف اشاروں کی زبان ہی ہماری ترجمانی کر سکتی ہے۔ کبھی تم نے دو جہازوں کو جھنڈوں کے سگنلوں کے ذریعہ باتیں کرتے دیکھا ہے۔ ہوا، لہروں اور توپوں کی گرج کے شور کے اوپر آدمی کے لئے آواز پہنچانا ناممکن ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے کان کام نہیں دیتے اور ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔

تم غالباً اشاروں کی زبان اکثر استعمال کرتے ہو۔ مثلاً جب درجے میں استاد کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھا دیتے ہو اور یہ ٹھیک بھی ہے۔

کیونکہ تم سوچ سکتے ہو کہ اگر ایک ساتھ تیس چالیس بچے بولنا شروع کردیں تو کیا حالت ہوگی؟

اس‌لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اشاروں کی زبان کی اپنی خوبیاں ہیں اور اس وجہ سے وہ ہزارہا سال تک زندہ رہی ہے اور اب بھی اس کی ضرورت ہے۔

بولی، اشاروں کی زبان پر حاوی ہوگئی ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ اب مفتوح فاتح کی لونڈی بن گئی ہے۔ اسی‌لئے کچھ قوموں میں اشاروں کی زبان کا وجود نوکروں، ماتحتوں اور ان لوگوں کی زبان کی حیثیت سے رہ گیا ہے جو کمتر سمجھے جاتے ہیں۔

اکتوبر کے عظیم سوشلسٹ انقلاب سے پہلے قفقاز کے آرمینیائی دیہاتوں میں عورت کو اپنے شوہر کے علاوہ کسی مرد سے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ جب کسی دوسرے آدمی سے اسے کچھ کہنا ہوتا تو اس کو اشاروں کی زبان استعمال کرنی پڑتی۔

شام، ایران اور دنیا کے بہت سے دوسرے حصوں میں اشاروں کی زبان تھی۔ مثلاً شاہ ایران کے محل میں ملازمین کو صرف اشاروں کی زبان استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ وہ صرف اپنے برابر والوں سے الفاظ میں بات‌چیت کر سکتے تھے۔ یہ بدقسمت لوگ واقعی ''آزادیٔ تقریر'' سے محروم تھے۔

اس طرح ہمیں اس ماضی کی باقیات ملتی ہیں جو مدتوں ہوئے معدوم ہوچکا ہے۔

آدمی اپنا دماغ حاصل کرتا ہے

جنگل میں ہر جانور ان ہزاروں سگنلوں کو سنتا ہے جو اس کو چاروں طرف سے پہنچتے ہیں اور ان سے چوکنا رہتا ہے۔

ایک ٹہنی چرچرائی۔ ممکن ہے کہ دشمن ہو۔ اور جانور بھاگنے یا اپنی مدافعت کےلئے تیار ہوجاتا ہے۔ زور کی گرج ہوتی ہے، ہوا جنگل کے درختوں کو چیرتی، شاخوں کی پتیاں بکھیرتی ہوئی چلتی ہے۔ جانور طوفان سے بچنے کےلئے اپنے گھونسلوں یا بھٹوں میں چھپ جاتے ہیں۔

جب سڑتی ہوئی پتیوں اور سانپ چھتریوں کی مہک کے ساتھ مل کر شکار کی بو نم زمین پر پھیلتی ہے تو جانور اس بو کے ذریعہ شکار کا پیچھا کرتا ہے۔

ہر سرسراہٹ، ہر بو، گھاس میں ہر نشان، ہر چیخ یا سیٹی کچھ نہ کچھ معنی رکھتی ہے اور اس کی طرف فوراً توجہ کرنی چاہئے۔

زمانۂ‌تاریخ سے قبل کا آدمی بھی بیرونی دنیا کے سگنل سنا کرتا تھا ۔ بہرحال، اس نے دوسرے قسم کے سگنلوں کو بھی سمجھنا جلد ہی سیکھ لیا ۔ یہ ایسے سگنل تھے جو اس کے جرگے کے لوگ اس کو دیتے تھے ۔

مثلاً زمانۂ‌تاریخ سے قبل کا کوئی شکاری جنگل میں کسی بارہ سنگھے کے نشانات دیکھتا تو وہ ہاتھ ہلاکر دوسرے شکاریوں کو اس کے بارے میں سگنل دیتا ۔ دوسرے شکاری جانور کو نہیں دیکھتے تھے لیکن سگنل سے چوکس ہوجاتے تھے ۔ وہ اپنے اسلحہ کو زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے جیسے کہ انھوں نے خود بارہ سنگھے کی بڑی بڑی سینگیں اور چوکنے کان دیکھ لئے ہوں ۔

جانور کے نشانات قدم بھی سگنل ہوتے تھے ۔ شکاری کا ہاتھ ہلانا وہ اشارہ تھا جو جانوروں کے قدموں کے نشانات کے بارے میں بتاتا تھا ۔ جب بھی کوئی شکاری زمین پر جانور کا کوئی نشان دیکھتا یا جھاڑیوں میں اس کی سرسراہٹ سنتا تو اس نشان کے بارے میں وہ دوسرے شکاریوں کو سگنل بھیجدیتا ۔

اسی طرح بولی بھی ایک سگنل بن گئی، ان سگنلوں کے علاوہ جو قدرت نے آدمی کو عطا کئے تھے ، ایسا سگنل جس کے ذریعہ ایک جرگے کے ممبر ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے ۔

مشہور روسی سائنس‌داں ایوان پاولوف نے اپنی ایک تصنیف میں انسانی بولی کو ''سگنلوں کے بارے میں سگنل،، کہا ہے ۔

پہلے تو یہ اشارے صرف آوازوں اور اشاروں ہی کی صورت میں تھے ۔ ان کو آدمی کی آنکھیں اور کان موصول کرتے تھے اور ان کو دماغ کی طرف اس طرح بھیج دیتے تھے جیسے کوئی سگنل مرکزی ٹیلی‌فون اسٹیشن کو جاتا ہے ۔ جب دماغ کو ''سگنلوں کے بارے میں سگنل،، ملتا مثلاً ''جانور آرہا ہے،، تو دماغ فوراً حکم دیتا : ہاتھو ! تم اپنا بھالا مضبوطی سے پکڑلو ۔ آنکھو ! جھاڑیوں کی طرف اچھی طرح نگراں رہو ۔ کانو ! ہر سرسراہٹ اور ٹہنیوں کی چرچراہٹ کی آواز سنو ۔ جانور ابھی آنکھ اور نشانے کی زد سے دور ہوتا لیکن شکاری اس کےلئے تیار ہوجاتا ہے ۔

اشارات اور جذبات میں جتنا اضافہ ہوتا گیا اتنے ہی اکثر ''سگنلوں کے بارے میں سگنل،، دماغ کو پہنچنے لگے اور ''مرکزی اسٹیشن،، کا کام بڑھنے لگا جو انسانی کھوپڑی کے پیشانی والے سرے میں ہوتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ''مرکزی اسٹیشن،، میں توسیع ہوتی رہنا چاہئے ۔ دماغ کے خلئے برابر بڑھتے گئے اور ان کے درمیان سلسلے زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے ۔ دماغ خود زیادہ بڑا ہوگیا ۔

نیان‌ڈیرتھال آدمی کا دماغ pithecanthropus کے دماغ سے چار پانچ سو مکعب سنٹی‌میٹر زیادہ بڑا ہوتا تھا ۔ زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کا دماغ جتنا بڑھتا گیا اتنا زیادہ وہ سوچنے لگا ۔

جب وہ کوئی ایسا سگنل دیکھتا یا سنتا جس کا مطلب ''سورج،، ہوتا تو وہ سورج کے بارے میں سوچتا چاہے اس وقت آدھی رات ہی کیوں نہ ہوتی۔
جب وہ سگنل دیکھتا کہ اسے جاکر اپنا شکاری بھالا لانا چاہئے تو اگرچہ بھالا اس وقت نہ ہوتا پھربھی بھالے کی شکل اس کے سامنے کھنچ جاتی۔
مشترکہ کام نے آدمی کو بولنا سکھایا اور جب اس نے بولنا سیکھ لیا تو سوچنا بھی سیکھا۔ آدمی کو اس کا دماغ قدرت سے بطور تحفہ نہیں ملا۔ اس نے اس کو اپنے ہاتھوں کی محنت سے حاصل کیا۔

کیسے ہاتھوں کی جگہ زبان نے لی

جب بہت کم اوزار تھے اور زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کا تجربہ بھی بہت محدود تھا اس وقت اِنتہائی سادہ اشارے بھی ایک دوسرے کو ہنر سکھانے کےلئے کافی تھے۔
لیکن آدمی کا کام جتنا ہی پیچیدہ ہوتا گیا اس کے اشارے بھی اتنے ہی پیچیدہ ہوتے گئے۔ ہر چیز کےلئے ایک خاص اشارہ ضروری ہوگیا۔ اس اشارے کو چیز کی وضاحت بالکل ٹھیک کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح تصویری اشاروں کا وجود ہوا۔ آدمی جانوروں، اوزاروں اور دوسری چیزوں کی تصویریں ہوا میں بنانے لگا۔
مثلاً وہ کسی خارپشت کے بارے میں بتانا چاہتا تو وہ صرف اس کی تصویرکشی ہی نہ کرتا بلکہ ایک لمحے کےلئے وہ خود مجسم خارپشت بن‌جاتا۔ دوسروں کو دکھاتا کہ خارپشت کیسے زمین کھودتی ہے اور اس کو اپنے پنجوں سے ہٹاتی ہے۔ اس کے کانٹے کیسے نوکیلے ہوتے ہیں۔
اس کہانی کا اظہار خاموش حرکات وسکنات کے ذریعہ کرنے کےلئے زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کو بہت ہی نگراں رہنا پڑتا تھا، بالکل ہمارے زمانے کے سچے فن‌کار کی طرح۔
جب تم یہ کہتے ہو کہ ''میں نے پانی پیا،، تو جس شخص کو یہ بتا رہے ہو اس کو تمہاری بات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تم نے کسی گلاس، بوتل یا ہاتھ کے چلو سے پیا۔
وہ آدمی جو اشاروں کی زبان جانتا ہے اس بات کو دوسرے طریقے سے کہےگا۔ وہ اپنے ہاتھ کا چلو منہ تک لائےگا اور خیالی پانی کو پئےگا۔ جو لوگ اس کو دیکھیں گے وہ سمجھ سکیں گے کہ پانی کتنا مزیدار، ٹھنڈا اور تازگی بخشنے والا تھا۔

ہم صرف ''شکار،، کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن زمانۂ تاریخ سے قبل کا آدمی شکار کے پورے منظر کو ادا کرکے دکھاتا تھا۔

اشاروں کی زبان بیک وقت بہت پرمعنی اور محدود بھی ہوتی تھی۔ یہ پرمعنی ہوتی تھی کیونکہ یہ واقعہ یا چیز کی بہت ہی صاف تصویر کشی کرتی تھی۔ لیکن یہ محدود بھی تھی۔ اشاروں کی زبان میں تم اپنی دائیں یا بائیں آنکھ کے بارے میں بتا سکتے تھے لیکن صرف ''آنکھ،، بتانا بہت مشکل تھا۔ تم کسی چیز کو بتانے کے لئے اشارے استعمال کر سکتے تھے لیکن کوئی اشارہ کسی مجرد خیال کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

اشاروں کی زبان میں دوسری خامیاں بھی تھیں۔ اشاروں کی زبان میں تم رات میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ رات کے اندھیرے میں چاہے جتنے زوردار اشارے کئے جائیں وہ دیکھے نہیں جا سکتے۔ اس کے علاوہ دن کی روشنی میں بھی لوگ ایک دوسرے کے اشارے کبھی کبھی نہیں سمجھ پاتے تھے۔

میدانوں میں لوگ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے اشاروں کی زبان میں بول سکتے تھے لیکن جنگل میں جب شکاری ایک دوسرے سے گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے الگ ہوجاتے تھے تو یہ ناممکن ہوتا تھا۔

اب لوگوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے آواز کا استعمال کریں۔ پہلے پہل تو زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کی زبان اور گلا بہت ہی نافرماں بردار تھے۔ ایک آواز اور دوسری آواز میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ الگ آوازیں مل کر کوئی غراھٹ، غل یا چیخ بن جاتی تھیں۔ زبان سے صاف الفاظ ادا کرنے میں آدمی کو بہت زمانہ لگ گیا۔

زبان کی حرکتیں ایسے اشارے تھیں جو سب سے کم نظر آتے تھے لیکن ان کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ سنے جا سکتے تھے۔

ابتدا میں باآواز بات چیت اشاروں کی زبان سے بہت مشابہہ تھی۔ وہ بھی اسی طرح تصویروں کی زبان تھی اور اسی طرح بہت صفائی اور سچائی سے ہر چیز اور ہر حرکت کی تصویر کشی کرتی تھی۔

ایوے قبیلے کے لوگ صرف ''چلنا،، نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں: زو دزے دزے — سنبھل کر چلنا، زو بوھو بوھو — بھاری پن سے موٹے آدمیوں کی طرح چلنا، زو بلا بلا — تیزی سے دوڑنا، زو پیا پیا — لڑکھڑا کر چلنا، زو گوو گوو — ھلکے سے لنگڑا کر اور سر آگے جھکا کر چلنا۔

ان میں سے ہر جملہ صوتی تصویر ہے جو آوازوں میں ایک شخص کی چال کی ہر تفصیل بتاتا ہے۔ ان میں سنبھل کر قدم رکھنا، لمبے آدمی کے بڑے بڑے ڈگ اور اس آدمی کے قدم ہیں جو اپنے گھٹنے ذرا بھی نہیں جھکاتا۔

جتنی چالیں ہیں اتنی ہی طرح کے جملے ان کے اظہار کےلئے ہیں۔ غرض اس طرح تصویری نشان کی جگہ صوتی نشان نے لےلی اور اس طرح زمانۂ تاریخ سے قبل کے انسان نے اشاروں اور الفاظ میں باتیں کرنا سیکھا۔

انڈین اشاروں کی زبان استعمال کر رہا ہے

دریا اور اس کے وسائل

ہم نے ماضی کے سفر کرکے کیا دریافت کیا؟

اس کھوجی سیاح کی طرح جو دریا کے بہاؤ کے اوپر جاتے ہوئے اس کا منبع معلوم کرتا ہے ہم اس چھوٹے سے چشمے تک پہنچے ہیں جس سے انسانی تجربات کا زبردست دریا نکلا ہے۔

یہاں دریا کے منبع پر ہمیں انسانی سماج، زبان اور عقل کی ابتدا بھی دکھائی دیتی ہے۔

جیسے کوئی دریا ہر بار کسی معاون کے ملنے پر گہرا ہوتا جاتا ہے اسی طرح انسانی تجربے کا دریا بھی ہر نسل کے تجربے سے گہرا اور چوڑا ہوتا جاتا ہے۔

ماضی میں نسلیں یکےبعد دیگرے غائب ہوتی گئیں۔ آدمی اور قبیلے بلا کسی نشان کے غائب ہوگئے، شہر اور گاؤں تباہ ہوکر خاک میں مل گئے اور ہمیشہ کےلئے کھوگئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو وقت کی تباہ کن طاقت کو روک سکے۔ لیکن انسان کا جمع کیا ہوا تجربہ محفوظ رہا۔ اس نے وقت پر فتح حاصل کرلی اور ہماری زبان، ہنر اور سائنس میں رچ بس گیا۔ زبان کا ہر لفظ، کام میں ہر حرکت، سائنس میں ہر نظریہ ماضی کی تمام نسلوں کا جمع کیا ہوا تجربہ ہے۔

ان نسلوں کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ اس طرح جس طرح دریا کا کوئی بھی معاون دریا ضائع نہیں ہوتا۔ ان تمام لوگوں کی محنت جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اس وقت موجود ہیں انسانی تجربوں کے دریا میں سمٹ آئی ہے۔

اچھا تو ہم دریا کے منبع پر پہنچ گئے جہاں سے ہماری تمام سرگرمیوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس طرح اس آدمی کا ظہور ہوا جو کام کرتا ہے، بولتا ہے اور سوچتا ہے۔

جب ہم ان لاکھوں برسوں کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں جو ہم کو بندروں سے جدا کرتے ہیں تو ہم کو فریڈرک اینگلس کے یہ دانشمندانہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ محنت نے انسان کی تخلیق کی۔

چھٹا باب

چھوڑے ہوئے گھر میں

جب لوگ کسی گھر کو ہمیشہ کےلئے چھوڑتے ہیں تو ان کی چھوڑی ہوئی چیزیں ضرور رہ جاتی ہیں۔ کاغذات، برتنوں کے ٹوٹے ٹکڑے اور خالی ڈبے وغیرہ خالی کمروں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ٹھنڈے چولھے کے پاس ٹوٹے ہوئے برتن بھانڈے ہوتے ہیں اور کھڑکی پر ٹوٹا لیمپ اس بدنظمی کو بڑی حسرت سے دیکھتا ہے۔

کسی دور کے کونے میں ٹوٹی ہوئی آرام کرسی اونگھتی نظر آتی ہے۔ وہ مکینوں کے ساتھ نہیں گئی کیونکہ اس کی ایک ٹانگ ہی غائب تھی۔

ان ٹوٹی پھوٹی باقیات سے اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ خاندان کیسے یہاں رہتا تھا۔ لیکن ماہر آثار قدیمہ کے سامنے یہی فریضہ آتا ہے۔ وہ ہمیشہ سب سے آخر میں اس گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ دراصل اس کو بہت خوش قسمت سمجھنا چاہئے اگر اسے کوئی گھر مل‌جائے کیونکہ عام طور پر وہ اس زمانے میں وہاں پہنچتا ہے جب آخری مکین ہزاروں سال پہلے وہ گھر چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اس کو صرف دیواروں کے کھنڈر اور بنیاد کے کچھ حصے ہی ملتے ہیں۔ یہاں ہر ٹھیکرا، ہر ٹکڑا خوش قسمتی کی علامت ہے۔

ایک پرانا گھر اس آدمی کو بہت کچھ بتا سکتا ہے جو اس کی زبان سمجھتا ہو! پرانے پتھروں‌والے برجوں اور کائی سے ڈھکی ہوئی دیواروں نے نہ‌جانے کتنے لوگ اور واقعات دیکھے ہیں! لیکن ان گھروں نے جو دنیا میں سب سے پرانے ہیں یعنی زمانۂ‌تاریخ سے قبل کے آدمیوں کے غاروں نے اس سے کہیں زیادہ دیکھا ہے۔

ایسے غار ہیں جن میں لوگ پچاس ہزار سال پہلے رہتے تھے! خوش قسمتی سے پہاڑ بہت مضبوط ہوتے ہیں اور غار کی دیواریں اس طرح نہیں گرتی ہیں جیسے آدمیوں کے گھروں کی دیواریں۔

یہ رہا ایک غار۔ اس کے رہنے‌والے بدلتے رہے ہیں۔ اس گھر کا پہلا مکین ایک زمین‌دوز چشمہ تھا۔ وہ یہاں مٹی، ریت اور چھوٹے چھوٹے پتھر لایا تھا۔
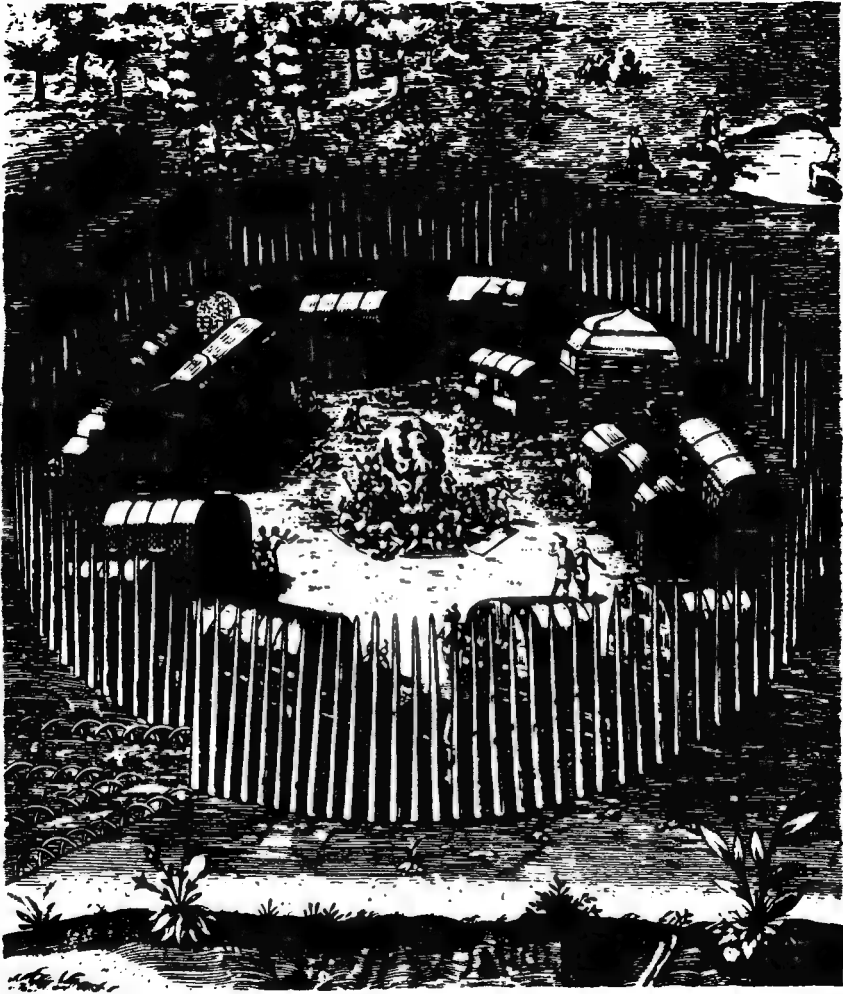
اب یہ لوگ غاروں یا کھودے ہوئے گڈھوں میں نہیں رہتے تھے۔ یہ ورجینیا کے انڈین لوگوں کا ۱۶ویں صدی کا پڑاؤ ہے

پھر پانی ختم ہوگیا۔ لوگ آکر غار میں رہنے لگے۔ پتھر کاٹنے کے جو بھونڈے اوزار یہاں مٹی میں ملے ہیں وہ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتاتے ہیں۔ قدیم آدمی ان اوزاروں کو جانوروں کے جسم کاٹنے، ہڈی سے گوشت الگ کرنے اور گودا نکالنے کےلئے ہڈیوں کو توڑنے کے کام میں لاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ شکاری تھے۔

بہت سال گزر گئے۔ شکاریوں نے غار چھوڑ دیا۔ پھر نئے رہنےوالے آگئے۔ غار کی دیواریں چکنی اور چمکدار ہوگئیں۔ غار میں رہنےوالے ریچھ نے اپنا جھبرا بدن دیواروں سے رگڑ رگڑ کر ان کو ایسا بنا دیا۔ اور یہ رہا ریچھ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کی کھوپڑی جس میں چوڑی پیشانی اور تنگ تھوتھن ہے۔

زمین کے اوپری پرت میں انسانی آبادی کے مزید نشانات ملتے ہیں۔ یہ ہیں الاؤ کے کوئلے اور راکھ، ٹوٹی ہوئی ہڈیاں، پتھروں اور ہڈیوں کے اوزار۔ ایک بار پھر آدمی غار میں رہنے لگے۔ ہم انہیں دیکھ تو نہیں سکتے لیکن ان کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ ہمیں صرف وہ چیزیں دیکھنا ہیں جو انہوں نے چھوڑی ہیں۔

ناتجربےکار آدمی تو یہی کہےگا کہ یہ تو پتھر کے ٹکڑے ہیں۔ لیکن اگر تم ان کو غور سے دیکھو تو یہ بھونڈے قسم کے ایسے ڈیزائن ہیں جو آئندہ چل کر چھری اور سوجے بنے۔ ان میں ایک اوزار میں چاقو کی ایسی کاٹنےوالی دھار ہے اور دوسرے میں تیز نوک جیسے سوجے میں ہوتی ہے۔

یہ ہمارے اوزاروں کے اجداد ہیں۔ سب سے پرانا ہمارے ہتھوڑے کا باوا ہے۔ یہ گول پتھر کا ہے۔

اگر ہم غار کی تہہ میں کوڑے کرکٹ کو کھودیں تو ہتھوڑے سے قریب ہی نہائی ملےگی۔

ہتھوڑا پتھر کا ہے اور نہائی ہڈی کی۔

اور یہ بالکل ان نہائیوں کی طرح نہیں ہے جو ہم نے دیکھی ہیں حالانکہ اس نے بہت اچھی طرح کام دیا ہے۔ اس میں بہت سے کٹاؤ اور دندانے ہیں کیونکہ جب کوئی اوزار بنایا جاتا تھا تو نہائی کو چوٹیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔

ہم ان اوزاروں سے کیا معلومات حاصل کر سکتے ہیں؟

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس غار کے نئے رہنےوالے جو آدمی تھے وہ پہلےوالوں سے بہت زیادہ ترقی‌یافتہ تھے۔ وہ ہزاروں سال جو گزرے ہیں ان میں انسان کی محنت بہت قسموں کی اور پیچیدہ ہوگئی ہے۔

پہلے رہنےوالے ایک ہی دھاردار پتھر کو سب کاموں کےلئے استعمال کرتے تھے۔ اب کاٹنے، چھیدنے، چھیلنے اور درختوں کو کاٹنے کےلئے الگ الگ اوزار ہونے

اوزار طرح طرح کے ہونے لگے۔ یہاں تیر کے دو اوپری حصے، ایک برمانے والا اوزار، ایک دھاردار ٹکڑا اور رندا ہیں جو مختلف کاموں کے لئے استعمال ہوتے تھے

لگے۔ تیزنوک والا اوزار جانوروں کی ان کھالوں میں سوراخ بنانے کے لئے تھا جن کو کاٹ کر کپڑے بنائے جاتے تھے۔ دندانےدار تیز دھار کا اوزار گوشت کاٹنے اور کھالوں کو چھیلنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ تیز نوکیلے سروالا اوزار شکاری برچھا تھا۔

اب آدمی کے پاس زیادہ کام بھی تھا اور زیادہ فکریں بھی۔ زمانہ بدل گیا تھا، آب و ہوا سرد اور سخت تھی۔ اب آدمی کو کپڑوں کی جو ریچھوں کی کھال سے بنتے تھے، جاڑوں کے لئے غذا جمع کرنے کی اور رہنے کے لئے گرم جگہ کی فکر کی ضرورت تھی۔ بہت سے مختلف قسم کے کام تھے اور ان کے لئے بہت طرح کے اوزار بھی۔

اس طرح ہمیں اپنے اجداد کی رہائش گاہوں میں اپنے اوزاروں کے اجداد ملتے ہیں۔

بہرحال، ہم کو وہی چیزیں ملتی ہیں جن کو وقت نے محفوظ رکھا ہے اور وقت اچھا محافظ نہیں ہے۔ وہ صرف ایسی چیزوں کو محفوظ رکھتا ہے جو بہت ہی پائدار چیزوں کی بنی ہوتی ہیں۔ اس نے صرف ایسی چیزیں محفوظ رکھیں جو پتھر یا ہڈی کی بنی ہوئی تھیں۔ لکڑی یا جانوروں کی کھال کی بنی ہوئی چیزیں وقت نے جلد ہی ضایع کردیں۔ اسی لئے ہم کو سوجا تو ملتا ہے لیکن کپڑے نہیں ملتے جن
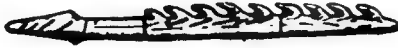
اب پتھر کے اوزاروں کے علاوہ ہڈی اور سینگوں کے بھی اوزار
بنائے جانے لگے تھے۔ یہاں ایک خنجر اور مچھلی پکڑنے والے
برچھے کے نوکیلے سرے ہیں جو رینڈیر کی سینگوں سے بنے ہیں

کو تیار کرنے میں سوجا مدد دیتا تھا۔ اسی لئے ہمیں برچھے کا نوکدار پتھریلا حصہ تو ملتا ہے لیکن لکڑی کا دستہ نہیں ملتا۔

جو چیزیں غائب ہوگئی ہیں ان کے متعلق اندازہ لگانا صرف ان ہی چیزوں سے ممکن ہے جو باقی رہ گئی ہیں۔ ان دھندلے نشانات اور ٹکڑوں سے جو ہمیں ملتے ہیں ہزاروں سال پہلے کی چیزوں کے خاکے تیار کرنا ہیں۔

پھربھی ہم اپنی کھوج جاری رکھیں گے۔

جب کوئی ماہرآثارقدیمہ کسی کھنڈر کی کھدائی شروع کرتا ہے تو وہ عام طور پر اپنا کام اوپر سے شروع کرتا ہے اور نیچے کی طرف جاتا ہے۔ پہلے سب سے اوپر کے پرتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، پھر وہ اور گہرا کھودتا ہے، زمین کی گہرائیوں میں، تاریخ کی گہرائیوں میں۔ ماہرآثارقدیمہ کتاب کو الٹا پڑھتا ہے۔ بالکل آخری باب سے شروع کرتا ہے اور پہلے باب پر ختم کرتا ہے۔ ہم نے اپنی کہانی کچھ اور ہی طرح شروع کی ہے۔ ہم نے بہت ہی نچلے پرتوں سے شروع کیا ہے، غار کی تاریخ کے پہلے بابوں سے۔ اور اب ہم رفتہ رفتہ اوپر کی طرف جائیں گے، جدید زمانوں سے زیادہ قریب ہوتے جائیں گے۔

اچھا، تو اس کے بعد غار میں کیا ہوا؟

غار کی زمین کے پرتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے متعدد بار غار کو چھوڑا اور پھر واپس آئے۔ جب غار میں لوگ نہیں رہتے تھے تو وہاں

لکڑ بگھے اور ریچھ رہنے لگتے تھے اور اس کے اندر مٹی اور کوڑے کرکٹ کے پرت کے پرت جمتے جاتے تھے۔ چھت کی چٹان کے ٹکڑے غار کے اندر فرش پر گر جاتے اور بہت برسوں بعد جب اس غار کو کوئی نیا انسانی قبیلہ ڈھونڈ نکالتا تو وہاں کوئی ایسی چیز نہ ہوتی جو اس کو پہلے والے باسیوں کے بارے میں بتاتی۔

سال، صدیاں اور ہزار سالہ عہد گزرتے گئے۔ لوگوں نے کھلی جگہوں میں مکانات بنانا شروع کئے اور غاروں کی پرانی پناہ گاہوں کو چھوڑدیا اور بالآخر ان کو بالکل ترک کر دیا۔ کبھی کبھار سر سبز پہاڑی چراگاہوں میں گلے چراتے ہوئے گلہ بان ایک دو دن کے لئے وہاں ٹھہرجاتے یا کوئی مسافر بارش سے بچنے کے لئے غار میں چلا آتا۔

اور پھر غار کی تاریخ کا آخری باب شروع ہوا۔ لوگ ایک بار پھر غار میں آئے۔ لیکن اس بار وہ پناہ لینے نہیں آئے۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں جو یہاں رہ چکے تھے تمام امکانی باتیں دریافت کرنے آئے تھے۔

یہ تازہ وارد لوگ پتھر کے قدیم اوزاروں کو کھود کر نکالنے کے لئے فولاد کے جدید آلات لائے۔

اور یہ ماضی کی تحقیقات کرنےوالے یکےبعددیگرے غار کے پرت کھودتے اور اس کی تاریخ شروع سے آخر تک پڑھتے گئے۔

ان کو جو اوزار ملے ان کا مقابلہ کرکے وہ دیکھ سکے کہ کس طرح مختلف ہنر اور انسانی تجربہ نسلاً بعد نسلاً بڑھتے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بھدے اوزاروں کی جگہ رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ زیادہ اچھے اوزار لیتے گئے۔ اس طرح بھدی دستی کلہاڑی کی جگہ تکونی کلہاڑی اور نیم حلقےوالے تیروں نے لےلی اور بعد میں طرح طرح کے برچھے، چاقو اور سوجے وغیرہ نکلے جو اچھی طرح ترشے ہوئے پتھر کے تھے۔ پھر نئی چیزوں کے بنے ہوئے اوزار، ہڈیوں اور سینگوں کے بنے ہوئے اوزار پتھر کے اوزاروں کے ساتھ آن ملے۔ اب ہڈیوں، جانوروں کی کھالوں اور لکڑیوں کو کاٹنے وغیرہ کے لئے الگ الگ مخصوص اوزار ہوگئے۔ قدیم آدمی نے ہڈیوں کو کاٹنے، کھالوں کو چھیلنے اور سمندری گھونگھوں میں سوراخ کرنے کے لئے پتھر کے اوزار استعمال کئے۔ اس کے مصنوعی پنجے اور دانت زیادہ تیز اور زیادہ مختلف قسم کے ہونے لگے اور جو ہاتھ وہ اپنے شکار کو پکڑنے کے لئے استعمال کرتا تھا زیادہ دراز ہونے لگا۔

لمبا ہاتھ

جب قدیم آدمی نےایک ڈنڈے سے نوکیلا پتھر باندھکر برچھا بنایا تو اس نے اپنے ہاتھ کو لمبا کرلیا۔

اس سے وہ زیادہ مضبوط اور باہمت بن گیا۔

اس سے پہلے اگر وہ کہیں ریچھ کے نزدیک آجاتا تھا تو خوف سے بھاگتا تھا کیونکہ وہ اس غار میں رہنےوالے جھبرے جانور سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ کسی چھوٹے جانور کو بلاکسی مشکل کے پکڑکر مار ڈالتا تھا لیکن ریچھ کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ریچھ کے تیز پنجوں سے نکل کر نہیں جا سکے گا۔

لیکن یہ اس کے برچھا بنانے سے پہلے کی بات تھی۔ برچھے نے اس کو باہمت بنا دیا تھا۔ اب وہ ریچھ کو دیکھ کر خوف سے بھاگتا نہیں تھا بلکہ اس پر جرأت سے حملہ کرتا تھا۔ ریچھ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہوکر شکاری پر حملہ کرتا تھا لیکن قبل اس کے کہ ریچھ کے پنجے شکاری تک پہنچیں، شکاری کے برچھے کی تیز پتھریلی نوک اس کے بالوں‌والے پیٹ میں پیوست ہو جاتی تھی کیونکہ برچھا ریچھ کے پنجوں سے کہیں زیادہ لمبا تھا۔

زخمی ریچھ غصے میں تیزی سے جھپٹتا تھا اور برچھا اس کے پیٹ میں اور گہرا اتر جاتا تھا۔

لیکن اگر کہیں شکاری کا برچھا ٹوٹ‌جاتا تو پھر اس‌کےلئے کوئی امید نہ رہتی۔ پھر تو ریچھ اس کو دبوچ کر ختم کر دیتا تھا۔

بہرحال، ریچھ کو بہت کم جیت ہوتی تھی۔ تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں آدمی کبھی تنہا شکار کھیلنے نہیں نکلتا تھا۔ خطرے کی پہلی آہٹ پر پورا غول دوڑ پڑتا تھا۔ لوگ ریچھ کو گھیرکر اپنے پتھر کے چاقوؤں سے ختم کر دیتے تھے۔

برچھے کی وجہ سے قدیم زمانے کے آدمی کو ایسے شکار نصیب ہونے لگے جن کا خواب تک اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ماہرین‌آثارقدیمہ کو اب بھی غاروں کے اندر گہرائیوں میں پتھر کی سلوں کے بنے ہوئے گودام ملتے ہیں۔ جب یہ سلیں ہٹائی جاتی ہیں تو ان کے نیچے سے ریچھ کی ہڈیوں کے بڑے بڑے ڈھیر ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ شکاری کامیاب تھے کیونکہ صاف ظاہر ہے ان کے پاس ذخیرہ کرنے کےلئے ریچھ کا کافی گوشت ہوتا تھا۔

اگر ریچھ ایسے ہی بھدے اور بھاری جانور کا شکار کرنا ہوتا تو برچھا ہی سب سے اچھا اوزار ہوتا۔ لیکن آدمی کو اور بھی جانوروں کا شکار کرنا ہوتا تھا۔ ایسے جانوروں کا جو خود اس سے زیادہ تیز اور چست چالاک تھے۔

میدانوں میں گھومتے ہوئے شکاری جنگلی گھوڑوں اور ارنے بھینسوں کے بڑے بڑے غولوں سے دوچار ہوتے۔ وہ چرتے ہوئے جانوروں کے قریب چپکے چپکے رینگ کر پہنچتے لیکن ذرا سی آہٹ یا سرسراہٹ پر یہ غول چوکڑیاں بھرتا دور بھاگ جاتا۔

قدیم آدمی کے بازو ابھی جانوروں کے شکار کےلئے بہت چھوٹے تھے۔ لیکن پھر شکار نے خود اس کو ایک نئی اور بہت اچھی چیز مہیا کردی۔ یہ چیز تھی ہڈی۔

اس نے اپنے پتھر کے چاقو سے ہڈی کا ایک ہلکا اور تیز نوکیلا اوزار بنایا اور اس کو ایک چھوٹے لکڑی کے دستے سے باندھ دیا۔ اب اس کے پاس ایک نیا اوزار ہوگیا — پھینک کر مارنےوالا برچھا (javelin)۔

شکاری اپنا بھاری برچھا کسی تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے پر نہیں پھینک سکتا تھا لیکن یہ ہلکا برچھا اس پر پھینک سکتا تھا کیونکہ وہ بہت دور تک جاتا تھا۔ اب آدمی کا ہاتھ اور لمبا ہو گیا۔ اب ایک اڑتے ہوئے ہتیار یعنی javelin کے ذریعہ تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کو غائب ہونے سے پہلے ہی مار سکتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ کسی بھاگتے ہوئے نشانے پر مارنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ آدمی کا بازو مضبوط ہو اور آنکھ بہت سدھی ہوئی۔

شکاری لڑکپن سے برچھا پھینکنا سیکھتا تھا۔ پھر یہ کوئی غیرمعمولی بات نہیں ہوتی تھی اگر سو پھینکے ہوئے برچھوں میں صرف درجن بھر نشانے پر پڑتے تھے۔

صدیاں لاکھوں برسوں میں بدلتی گئیں۔ جنگلی گھوڑوں اور ارنے بھینسوں کے غول کم پڑنے لگے۔ قدیم آدمی ان کے خاتمے کا بڑی حد تک ذمےدار تھا۔ اب اکثر شکاری خالی ہاتھ گھر لوٹنے لگے۔ ان کو ایک نئے ہتیار کی ضرورت تھی، ایسے ہتیار
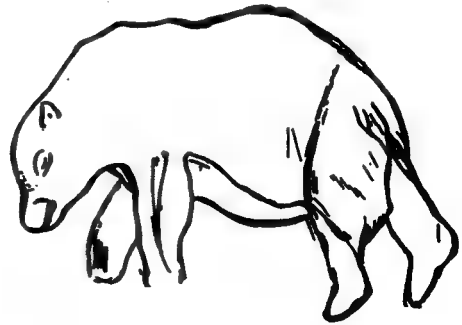
شکار کیا ہوا ریچھ، کسی قدیم فن‌کار کی ڈرائنگ سے

کی جو اور دور سے نشانے پر مارا جا سکے۔ آدمی کو کوئی اور ہتیار ایجاد کرنا تھا، ایسا ہتیار جو اس کے ہاتھ کو اور بھی زیادہ لمبا بنا سکے۔

اور اس نے ایک نیا ہتیار بنالیا۔

اس نے ایک نیا لیکن مضبوط پودا کاٹا۔ اس کو لچکا کر محراب بنائی اور دونوں سروں کو تانت سے باندھ دیا۔
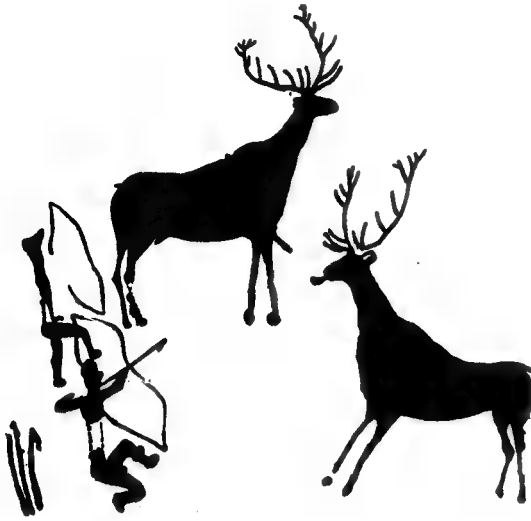
اب شکاریوں کے پاس تیر کمان ہونے لگے
(غار کی ڈرائنگ)

اب شکاری کے پاس کمان ہوگئی۔ جب وہ تانت کو آہستہ سے کھینچتا تو وہ اس کے پٹھوں کی تمام طاقت جمع کرلیتی۔ اور پھر جب وہ اس کو چھوڑتا تو یہ طاقت فوراً منتقل ہوکر تیر میں پہنچ جاتی۔ اور تیر اس تیزی سے جاتا جیسے کوئی عقاب اپنے شکار پر ٹوٹتا ہے۔

تیر اور javelin دو بھائیوں کی طرح مشابہہ ہیں لیکن تیر اپنے بھائی سے ہزاروں سال چھوٹا ہے۔

آدمی کو تیر ایجاد کرنے میں ہزاروں سال لگ گئے۔ پہلے وہ کمان کے ذریعہ تیر نہیں بلکہ javelin پھینکتا تھا۔ اسی‌لئے آدمی اپنی کمان اتنی بڑی بناتا تھا جو اس کے قد کے برابر ہوتی تھی۔

اس طرح آدمی نے اپنے کمزور اور چھوٹے بازوؤں کو لمبا اور طاقتور بنایا۔ جب اس نے کسی ہرن کی سینگ کی نوک سے یا کسی دیوہیکر جانور کے بڑے دانتوں سے تیز نوکیلے ہتیار بنانا سیکھلیا تو اس نے جانوروں کے اپنے ہتیاروں یعنی سینگوں اور دانتوں کو خود انھیں کے خلاف استعمال کرنا شروع کردیا۔ اور اس بات نے آدمی کو تمام جاندار مخلوق میں سب سے زیادہ طاقتور بنادیا۔

ہاتھ جو برچھا پھینکتا اور کمان کی تانت کھینچتا تھا اب کوئی معمولی ہاتھ نہ تھا۔ وہ ایک دیو کا ہاتھ تھا۔

اور جب یہ نوجوان دیو شکار کےلئے جاتا تھا تو وہ ایک جانور کو تاک لگا کر نہیں مارتا تھا۔ وہ پورے کے پورے غولوں کا شکار کرتا تھا۔

جیتا جاگتا آبشار

سولیوترے (فرانس) میں ایک ڈھلوان پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی کے دامن میں ماہرین آثارقدیمہ نے ہڈیوں کا ایک زبردست ڈھیر دریافت کیا۔ اس میں میموتھوں کی شانے کی ہڈیاں، قدیم زمانے کے بیلوں کی سینگیں اور غار میں رہنےوالے ریچھوں کی کھوپڑیاں تھیں۔ جب سائنس‌داں تمام ہڈیوں کو چھانٹ چکے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں کم‌ازکم ایک لاکھ گھوڑوں کی ہڈیاں تھیں۔

اتنا بڑا گھوڑوں کا قبرستان کہاں سے آیا؟

اور زیادہ گہرے جائزے پر انھوں نے دیکھا کہ بہت سی ہڈیاں چٹخی، ٹوٹی اور جلی ہوئی تھیں۔ یہ بات صاف ہوگئی کہ پرانے زمانے کے باورچیوں کے ہاتھوں میں پہنچنے کے بعد یہ ہڈیاں یہاں آئی تھیں۔ گھوڑوں کا یہ غیرمعمولی قبرستان کسی زبردست باورچی خانے کے کوڑا گھر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ایسا زبردست کوڑا گھر ایک سال میں تو نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ اسلئے یہ بات صاف تھی کہ یہاں لوگ بہت، بہت برسوں تک رہے تھے۔

لیکن یہ کوڑا گھر یہاں، پہاڑی کے دامن میں کیوں تھا؟ کیا یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ قدیم زمانے کے شکاریوں نے میدانوں کی ہموار زمین کے بجائے اپنا پڑاؤ یہاں بنایا تھا؟

غالباً یہی ہوا تھا۔

گھوڑے اور رینڈیر (ہڈی پر نقش)

جب وہ گھوڑوں کے غول میدانوں میں دیکھتے تھے تو شکاری اپنے کو لمبی لمبی گھاس میں چھپاتے ہوئے بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے تھے۔ ہر شکاری کے پاس کئی برچھے ہوتے تھے۔ آگےوالے شکاری دوسروں کو اشارہ کرتے تھے کہ گھوڑے کہاں ہیں، کتنے ہیں اور کس طرف جارہے ہیں۔

تب شکاری ایک حلقہ بنا لیتے تھے اور غول کو گھیر کر حلقہ چھوٹا کرتے جاتے تھے۔ گھوڑے جو پہلے میدان میں سیاہ دھبوں کی طرح ہوتے تھے اب نظر آنے لگتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے سر، سبک پیر اور بدن پر جھبرے بال ہوتے۔

گھوڑوں کا غول چوکنا ہو جاتا تھا۔ وہ دشمن کی بو سونگھ کر بھاگنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن بہت دیر ہوچکی ہوتی تھی۔ ان پر برچھوں کی بارش ہو جاتی تھی جیسے لمبی چونچوںوالی بےپر چڑیاں ان پر جھپٹ رہی ہوں۔

برچھے جانوروں کے پہلوؤں، پیٹھوں اور گردنوں میں پیوست ہوجاتے تھے۔ اب وہ کہاں جائیں؟ دشمن گھوڑوں کو تین طرف سے گھیر لیتا تھا۔ اس زندہ دیوار سے جو ان کے چاروں طرف اچانک کھڑی ہوگئی تھی فرار کا صرف ایک راستہ تھا۔ اب غول کھلے ہوئے رخ کی طرف زور سے ہنہناتا ہوا شکاریوں سے بھاگتا تھا۔ لیکن شکاری تو اسی کے منتظر ہوتے تھے۔ وہ گھوڑوں کو گھیر کر اور اونچائی پر پہاڑی کی طرف لےجاتے تھے۔ گھوڑے خوف سے بدحواس ہو کر آگے کی طرف بھاگتے تھے۔ انھیں اس کی فکر نہیں ہوتی تھی کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ بس اٹھی ہوئی دموں اور پسینے سے تر پیٹھوں کا ایک سیلاب ہوتا تھا جو پہاڑی کے اوپر بڑھتا تھا۔ پھر اچانک ان کے سامنے خلا آجاتا تھا۔ آگے والے گھوڑے پہاڑی کی نکر تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کو خطرے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر زوروں سے پھنکارتے تھے۔ لیکن بہت دیر ہوچکی ہوتی تھی۔ وہ رک نہیں سکتے تھے کیونکہ پیچھےوالے گھوڑے انھیں ڈھکیلتے تھے۔ اور پھر یہ سیلاب ایک آبشار کی طرح نیچے گرتا تھا اور تہہ میں پہنچ کر لاشوں اور ٹوٹے پھوٹے جسموں کا ایک ڈھیر بن‌جاتا تھا۔

شکار ختم ہوجاتا تھا۔

پہاڑی کے دامن میں الاؤ زوروں میں جلتے تھے۔ بوڑھے شکار کو تقسیم کر دیتے تھے جو پورے جرگے کی مشترکہ ملکیت ہوتا تھا۔ لیکن سب سے اچھے ٹکڑے ان شکاریوں کو دئے جاتے تھے جو سب سے زیادہ بہادر اور مشاق ہوتے تھے۔

نئے لوگ

جب ہم کسی گھڑی کی گھنٹےوالی سوئی دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں چلتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ایک دو گھنٹے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سوئی اپنی جگہ سے آگے کھسک گئی ہے۔

زندگی کے بارے میں بھی یہی بات ٹھیک ہے۔ ہم ان تمام تبدیلیوں کو فوراً نہیں دیکھ لیتے جو ہمارے ماحول میں یا خود ہم میں ہوتی ہیں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ تاریخ کی گھنٹےوالی سوئی غیرمتحرک ہے اور صرف متعدد سال بعد ہم اچانک یہ دیکھتے ہیں کہ سوئی اچانک حرکت کر گئی ہے، کہ ہم خود بھی بدل گئے ہیں اور ہمارے چاروں طرف ہر چیز مختلف ہوگئی ہے۔

ہم اپنے روزنامچوں، فوٹوؤں، اخباروں اور کتابوں کے ذریعہ پرانے اور نئے کا موازنہ کرسکتے ہیں۔ ہمارے پاس موازنے کےلئے چیزیں ہیں۔ لیکن ہمارے قدیم اجداد کے پاس پرانے اور نئے کے موازنے کےلئے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ زندگی بےحرکت ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پرانے اور نئے کا موازنہ کئے بغیر تبدیلیوں کو دیکھنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح گھڑی کی سوئی کی حرکت ایسے ڈائل پر دیکھنا جس پر نمبر نہ پڑے ہوں۔

پتھر کے اوزار بنانےوالا ہر کاریگر ان تمام حرکتوں اور طریقوں کی نقل کرتا تھا جو اس کو یہ ہنر سکھانےوالا آدمی بتاتا تھا۔

نیا گھر بساتے وقت عورتیں چولھا ٹھیک اسی طرح بناتی تھیں جیسے ان کی دادیوں نے پہلے کیا تھا۔

شکاری اپنے قدیم رواج کے مطابق شکار کےلئے گھات لگاتے تھے۔
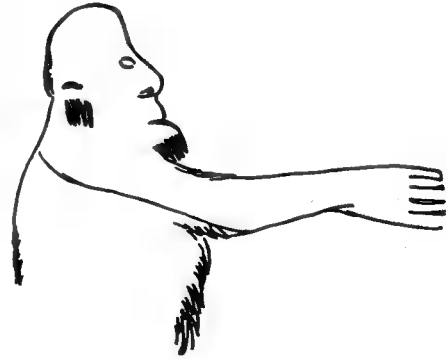
Cro-Magnon آدمی کے ہاتھوں اپنی تصویر (میموتھ کی ہڈی پر نقش)

Cro-Magnon آدمی اور موجودہ دور کے آدمی میں مشکل سے ہی کوئی فرق ہوگا۔ یہ صورتیں کرائمیا (سوویت یونین) میں پائی ہوئی کھوپڑیوں سے بحال کی گئی ہیں

پھربھی، بلا محسوس کئے لوگوں نے رفتہ رفتہ اپنے اوزار، رہائش‌گاہیں اور کام کے طریقے بدلے۔

پہلے ہر نیا اوزار بالکل پرانے اوزار کی طرح ہوتا تھا۔ پہلا javelin برچھے سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ پہلا تیر بہت کچھ javelin سے ملتا تھا۔ لیکن تیر اور برچھا بہت مختلف ہیں اور تیر کمان سے شکار کرنا تو برچھے کے شکار سے کہیں الگ ہے۔

صرف آدمی کے اوزار اور ہتیار ہی نہیں بدلے تھے۔ وہ خود بھی بدل رہا تھا۔ یہ ان انسانی ڈھانچوں سے دیکھا جا سکتا ہے جو مختلف کھدائی کی جگہوں پر پائے گئے ہیں۔ اگر اس آدمی کا مقابلہ جو پہلے‌پہل غار میں داخل ہوا تھا اس آدمی سے کریں جس نے برفانی دور کے آخر میں غار کو ترک کیا تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں مختلف قسم کی مخلوقات میں سے تھے۔ نیان‌ڈیرتھال آدمی سب سے پہلے غار میں رہنے لگا تھا۔ اس کی پیٹھ جھکی ہوئی تھی اور بہت لڑکھڑاتا ہوا چلتا تھا، اس کے چہرے پر نہ تو کوئی پیشانی تھی اور نہ ٹھڈی۔ لیکن اچھے بدن‌والا، لمبا cro-magnon آدمی جس نے سب سے آخر میں غار چھوڑا صورت‌شکل میں ہم سے مختلف تھا۔

”گھر کی تاریخ“ کا پہلا باب

آدمی کے طریقۂزندگی میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کی رہائش‌گاہ میں بھی تبدیلیاں ہوئیں ۔ اگر ہم اس کی رہائش‌گاہ کی تاریخ لکھیں تو ہمیں غار سے شروع کرنا ہوگا۔ یہ رہائش‌گاہ جو قدرت کی تخلیق تھی آدمی نے بنائی نہیں تھی بلکہ پائی تھی۔

لیکن قدرت اچھی معمار نہیں ہے ۔ جب اس نے پہاڑ اور پہاڑوں کے غار بنائے تھے تو اس نے ذرا بھی اس کی پروا نہیں کی تھی کہ اس کے غاروں میں کوئی رہےگا یا نہیں ۔ اسی‌لئے جب قدیم آدمی رہنے کےلئے غاروں کی تلاش کرتا تھا تو اس کو مشکل ہی سے مناسب غار ملتے تھے۔ یا تو چھت بہت نیچی ہوتی تھی یا دیواریں گرنےوالی ہوتی تھیں یا غار کا دہانہ اتنا چھوٹا ہوتا تھا کہ اس میں سے رینگ کر جانا بھی مشکل تھا۔

آدمیوں کا پورا غول رہائش‌گاہ کو ٹھیک‌ٹھاک کرنے میں لگ‌جاتا تھا۔ وہ غار کے فرش اور دیواروں کو پتھر کے چھیلنےوالے اوزاروں اور لکڑی کے ڈنڈوں سے کھرچتے اور ہموار کرتے تھے۔

دہانے کے قریب وہ چولھے کےلئے ایک گڈھا کھود دیتے تھے اور پتھر جوڑ دیتے تھے۔ مائیں زمین میں چھوٹے چھوٹے گڈھے کھود کر بچوں کےلئے ”پالنے“ بناتی تھیں اور گدوں کے بجائے چولھے کی گرم راکھ ان گڈھوں میں بچھائی جاتی تھی۔

غار کے دوروالے گوشے مین ریچھ کے گوشت اور کھانے کی دوسری چیزوں کا ذخیرہ ہوتا تھا۔
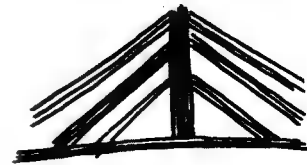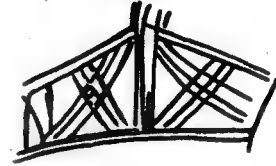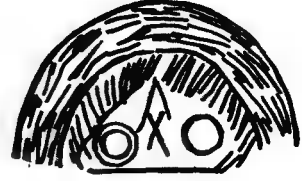
قدیم زمانے کے فن‌کاروں نے اپنی رہائش‌گاہوں کی تصویرکشی اس طرح کی ہے

اس طرح قدیم زمانے کے لوگوں نے قدرت کے بنائے ہوئے غار کو اپنی محنت سے انسانی رہائش‌گاہ میں تبدیل کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی رہائش‌گاہوں کو زیادہ آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو کسی اوپر نکلی ہوئی چٹان کی معلق چھت مل‌جاتی تو وہ اس کے چاروں طرف دیوار کھڑی کردیتے۔ اگر کوئی ایسی جگہ مل‌جاتی جو چہار دیواری کا کام دےسکتی تو ان دیواروں پر چھت بنا دیتے۔

جنوبی فرانس کے پہاڑوں میں اب بھی قدیم زمانے کی ایک رہائش‌گاہ کے کھنڈرات ملتے ھیں۔ مقامی لوگوں نے اس کو ''شیطانی چولھے،، کا عجیب نام دیا ھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زبردست چٹانوں کی بنی ہوئی پناہ‌گاہ میں شاید کوئی شیطان ھی چولھے سے گرمی حاصل کر سکتا تھا۔ اگر ان کو اپنے قدیم اجداد کے بارے میں معلومات ھوتیں تو ان کو پتہ چلتا کہ ''شیطانی چولھا،، انسانی ھاتھوں نے ھی بنایا تھا۔

یہاں قدیم زمانے کے شکاریوں نے دو دیواریں دیکھیں جن کے اوپر ایک چٹان سایہ کئے تھی۔ دیواریں ان پتھروں سے بن گئی تھیں جو پہاڑ سے ڈھلک کر آئے تھے۔ شکاریوں نے باقی دو دیواریں بنا کر ان دیواروں سے ملادیا جو ان کو ملی تھیں۔ ایک دیوار پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے بنی تھی اور دوسری ان کھمبوں سے جن کے درمیان درختوں کی شاخیں بنی ہوئی تھیں اور وہ جانوروں کی کھالوں سے ڈھکے تھے۔ ھم صرف قیاس کر سکتے ھیں کہ چوتھی دیوار کیسی تھی کیونکہ وقت نے اس کو خاک کردیا ھے۔

یہ دیواریں ایک گڈھے کو جو زمین میں کھدا تھا گھیرے میں لئے تھیں۔ گڈھے کی تہہ میں ماھرین آثارقدیمہ کو پتھر کے ٹکڑے اور ھڈیوں اور سینگوں کے اوزار ملے۔

''شیطانی چولھا،، آدھا گھر ھے اور آدھا غار۔ یہاں سے اصلی گھر کا فاصلہ دور نہ تھا کیونکہ ایک بار آدمی کو دو دیواریں بنانا آگیا تو اس نے جلد ھی چار دیواریں بنانا بھی سیکھ لیا ھوگا۔

اس طرح پہلے مکان نمودار ہوئے جو نہ تو غاروں میں تھے اور نہ باھر نکلی ہوئی چٹانوں کے سائے میں بلکہ کھلے میں تھے۔

قدیم شکاریوں کی رہائش‌گاہ

۱۹۲۵ء کی خزاں کی بات ھے۔ دریائے دون پر واقع گاگارینو گاؤں کا ایک کسان جس کا نام آنتونوف تھا اپنے صحن میں مٹی کھود رہا تھا۔ اس کو ایک نئے باڑے پر لگانے کےلئے اس مٹی کی ضرورت تھی۔

لیکن اس کا پھاوڑا برابر ھڈیوں پر پڑ رہا تھا جو وھاں دفن تھیں۔ اتفاق سے اسی وقت وھاں سے گاؤں کا ٹیچر ولادیمیروف گزرا۔ آنتونوف نے اس کو پکارا اور شکایت کی:

''سمجھ میں نہیں آتا یہ اتنی ھڈیاں کہاں سے آگئیں کہ کھودنا مشکل ھوگیا۔ میرا پھاوڑا ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گیا۔''

شاید اگر آنتونوف نے کسی اور سے کہا ھوتا تو وہ ایک آدھ منٹ تک رک کر چلاجاتا۔ لیکن گاؤں کا یہ ٹیچر سائنس سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔

وہ صحن میں آگیا اور اس نے ایک موٹے زرد دانت کے ٹکڑے کا جائزہ لیا جو ایسا چکنا تھا جیسے گھس کر بنایا گیا ھو۔

یہ بات بالکل صاف تھی کہ ایسا بڑا دانت کسی قدیم زمانے کے دیوپیکر جانور میموتھ کا ھی ھوسکتا تھا۔

دریائے دون پر میموتھ! یہ واقعی حیرت کی بات تھی۔

ٹیچر نے ڈھیر بھر ھڈیاں ایک لاری پر لادیں اور قریب‌ترین شہر کو لے گیا جہاں ایک چھوٹا سا مقامی میوزیم تھا۔

اگر تم کبھی ایسے چھوٹے میوزیموں میں گئے ھو تو تم نے دیکھا ھوگا کہ یہاں انتہائی عجیب چیزیں ایک ھی کمرے میں رکھی ھیں۔ ایک ھی کمرے میں تم کو کیوپڈ کا سنگمرمر کا مجسمہ اور اٹھارھویں صدی کے کسی امیر کی روغنی تصویر ملے گی۔ ایک اور کمرے میں مقامی معدنیات اور پودوں کے ذخیرے کے برابر کوئی پیپئرماشے کا بنا ھوا pithecanthropus مجسمہ نظر آئے گا جس کے بالدار ھاتھ میں ڈنڈا ھوگا۔

یہ اس قسم کا میوزیم تھا جس میں ولادیمیروف یہ ھڈیاں لایا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ میوزیم کا نگراں قدیم دیوپیکر جانور کے دانت اور دوسری ھڈیوں کا اندراج میوزیم کی فہرست میں کرکے دوسری چیزوں کے ساتھ نمائش کےلئے رکھ دیتا۔

لیکن اس نے اس سے زیادہ کام کیا۔ اس نے لینن گراد کے علم الانسان اور علم الاقوام کے میوزیم کو خط لکھا جہاں دریائے نیوا کے کنارے ایک قدیم عمارت میں شاندار ذخیرہ ھے جو دنیا کے تمام حصوں سے آیا ھے اور جس کو روسی سائنس‌دانوں اور کھوج کرنےوالوں نے جمع کرنے میں مدد دی ھے۔

جلد ھی لینن گراد سے ایک ماھر آثارقدیمہ زامیاتین کاکارینو پہنچ گیا تاکہ گاؤں کے ٹیچر کے ساتھ مل کر کھدائی کا کام جاری رکھا جا سکے۔
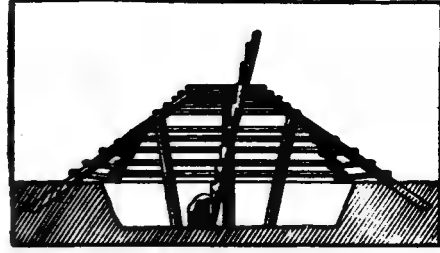
دریائے تھامپسن پر رہنےوالے انڈین لوگوں کی رہائش‌گاہیں۔ ان کی ساخت قدیم زمانے کی رہائش‌گاہوں کی طرح ہے

یہ صورت اکثر ہمارے ملک میں پیش آتی ہے۔ کوئی ٹیچر یا گاؤں کے کتب‌خانے کا نگراں قدیم تہذیب کا کوئی نمونہ دیکھتا ہے اور قریبی میوزیم کو اس کے بارے میں لکھتا ہے اور شہر سے سائنس‌داں کھدائی کے کام کی نگرانی کےلئے آجاتے ہیں۔

گاگارینو میں کیا ملا؟

پہلے ہی دن کی کھدائی میں ان کو پتھر کے چھیلنے اور کاٹنےوالے اوزار، ہڈی کا ایک سوجا، قطبی لومڑی کا دانت جس میں ایک سوراخ بنایا گیا تھا، ایک چولھے کے کوئلے اور راکھ میں ملی ہوئی میموتھ اور دوسرے جانوروں کی ہڈیاں ملیں۔

اسی طرح کے پتھر کے اوزار اور دانت کے ٹکڑے اس مٹی میں بھی ملے تھے جو آنتونوف کے باڑے پر لگانے کےلئے استعمال ہوئی تھی۔ یہ ہڈیاں مٹی میں اتنی زیادہ تھیں کہ کسان کے خاندان نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کو پلاسٹر سے چننے پر وقت ضایع نہ کرنا چاہئے۔

یہاں کئی مہینوں تک کھدائی جاری رہی اور برابر نئی چیزیں ملتی رہیں۔ اوزار، زیورات، چھوٹی چھوٹی مورتیاں اور جانوروں کی ہڈیاں ملیں۔ ہر چیز کو احتیاط کے ساتھ لینن‌گراد روانہ کیا گیا جہاں مختلف شعبوں کے سائنس‌دانوں نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔

ماہرین‌معدنیات نے یہ پتہ لگایا کہ اوزاروں کےلئے کس طرح کا پتھر استعمال ہوتا تھا۔ قدیم جانوروں کے ماہروں نے ہڈیوں کا مطالعہ کرکے معلوم کیا کہ قدیم زمانے کے آدمی کس قسم کے جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ چیزوں کو بحال کرنےوالے ماہروں نے ہڈی کی نقشیں مورتیوں کو جوڑکر پھر اصلی روپ میں کردیا۔

اس دوران میں ماہرین آثار قدیمہ کا ایک جتھہ، تمام قواعد کی پوری پابندی کے ساتھ، کھدائی میں مصروف رہا۔ اور جلد ہی ان کے سامنے قدیم زمانے کے شکاریوں کی رہائش گاہ کی تصویر آنے لگی۔

شکل کے لحاظ سے وہ ایک گول تہہ خانہ تھا۔ دیواریں باہر سے پتھر کی سلوں، میموتھ کے دانتوں اور جبڑوں سے محفوظ کی گئی تھیں۔ وہ غالباً لکڑی کے کھمبوں سے بنی تھیں جن پر جانوروں کی کھالیں منڈھی تھیں اور یہ کھمبے اوپر مل کر چھت بناتے تھے۔ دیواروں کو باہر سے مضبوط بنانے کےلئے بھاری پتھر اور میموتھ کی ہڈیاں لنڈھکا کر دیواروں تک لائی گئی تھیں۔

ہڈی کے ٹکڑوں سے بنا ہوا ہار

باہر سے یہ رہائش گاہ ایک بڑے خیمے کی طرح معلوم ہوتی تھی۔دیواروں کے قریب ماہرین کو نقشیں ہڈیوں کی عورتوں کی دو مورتیاں ملیں۔ ایک بہت موٹی تھی اور دوسری دبلی۔ غالباً ہڈی پر کندہ کاری کرنےوالے نے ان کو اصلی زندگی سے لیا تھا۔ عورتوں کے پیچیدہ جوڑے بڑی نفاست سے بنائے گئے تھے۔

فرش کے بیچوں بیچ ایک گڈھا تھا جو صندوق کا کام دیتا تھا۔ جو چیزیں اس میں ملیں وہ غالباً بہت بیش بہا سمجھی جاتی ہونگی — ہڈی کی سوئی، قطبی لومڑی کے دانتوں کے بنے ہوئے دانے اور ایک میموتھ کی دم۔

قدیم آدمی سینے کےلئے سوئی استعمال کرتے تھے، یہ دانے کسی زیور کے تھے۔ لیکن انھوں نے میموتھ کی دم محفوظ رکھنے کی زحمت کیوں گوارا کی تھی؟

دوسری جگہوں پرایسی نقشیں مورتیاں پائی گئیں جن میں قدیم شکاریوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان مورتیوں سے پتہ چلتا ہے کہ شکاری جانوروں کی کھالیں اپنے کندھوں پر ڈالتے تھے اور دمیں پیچھے لٹکتی لگاتے تھے تاکہ وہ ان جانوروں کی طرح معلوم ہوں جن کی کھالیں وہ پہنے تھے۔ وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس کے بارے میں بعد میں دیکھا جائےگا۔ ابھی تو ہم قدیم آدمی کی رہائش گاہ کے بارے میں ہر امکانی دریافت کر رہے ہیں۔

کاگارینو گاؤں جیسے بہت سے قدیم پڑاؤ سوویت یونین کے دوسرے حصوں میں

بھی ملے ہیں۔ شہر وورونیژ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں اتنی ہڈیاں ملیں کہ اس کا نام ہی کوستینکی یعنی ہڈی گاؤں پڑ گیا۔

یہ ہڈیاں میموتھ، غاروالے شیروں، ریچھوں اور ان گھوڑوں کی تھیں جن کو قدیم زمانے کے لوگ شکار کرتے تھے۔

دو سوویت ماہرین آثار قدیمہ یفی مینکو اور زمیاتین نے کوستینکی کے پڑاؤ کا پوری طرح جائزہ لیا۔

انھوں نے دریافت کیا کہ شکاری گاگارینو کی طرح ایک تہہ خانے میں نہیں بلکہ کئی تہہ خانوں میں رہتے تھے اور سب ایک ساتھ مل کر شکار کھیلتے تھے۔ یہاں پتھر اور ہڈی کے بنے ہوئے اچھے اوزار اور ہاتھی دانت سے تراشی ہوئی عورتوں کی مورتیاں پائی گئیں۔ ان میں سے ایک کے گدنا گدا ہوا اور چمڑے کا پیش بند پہنے ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ لوگ چمڑے کو پکانا جانتے تھے۔

ابتدائی دور کے ان شکاریوں کی رہائش گاہیں ہمارے مکانوں سے بالکل مختلف تھیں۔ باہر سے صرف ان کی چھتیں ایک گول پہاڑی کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ داخلہ صرف چمنی کے ذریعہ تھا کیونکہ صرف چھت میں ایک سوراخ تھا جس سے دھواں نکلتا تھا۔

مٹی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بنچوں کی جگہ پر میموتھوں کی جبڑے کی ہڈیاں لگی تھیں اور دھرتی ماتا ہی ان کا بستر تھی۔ وہ ایک ہموار مستطیل قطعہ میں سوتے تھے اور تکیوں کی جگہ پر مٹی کے ڈھیلے تھے۔

ہڈی کی بنچوں اور مٹی کے بستروں والے اس مکان میں میزیں پتھر کی تھیں۔

کام کرنے کی میز سب سے روشن جگہ پر تھی یعنی چولھے کے قریب۔ وہ پتھر کی ہموار سلوں کی بنی تھی۔ اس کے اوپر ماہرین آثار قدیمہ نے متعدد اوزار، پتھر اور ہڈیوں کے ٹکڑے اور نامکمل چیزیں پائیں۔ میز پر ہڈی کے دانے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ پالش کئے ہوئے تھے اور ان میں سوراخ تھے۔ باقی ابھی نامکمل تھے۔ کاریگر نے ایک پتلی ہڈی میں کئی جگہ سوراخ تو بنائے تھے لیکن اس کو یہ ہڈی دانوں میں توڑنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کوئی بات ایسی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنا کام روک کر رہائش گاہ چھوڑنی پڑی تھی۔ واقعی کوئی بڑا خطرہ رہا ہوگا ورنہ وہ ایسی بیش بہا چیزیں جیسے نوکیلے ہتیار، ہڈی کی سوئیاں جن میں ناکے تھے اور مختلف قسم کے پتھر کے کاٹنے والے اوزار چھوڑ کر نہ جاتے۔

ان تمام اوزاروں کو بنانا آسان کام نہیں تھا۔ رہائش گاہ میں جو چیزیں ملیں ان میں سے ہر ایک کو بنانے میں بہت سے گھنٹے لگے تھے۔ مثلاً ہڈی کی سوئی کو لے لو۔ یہ تاریخ انسانی میں سوئی کی پہلی قسم تھی۔ یہ واقعی چھوٹی سی چیز ہے لیکن اس کو بنانے میں کافی ہنر درکار تھا۔

ہڈی کی سوئیاں اور وہ پتھر جس پر ان کو تیز کیا جاتا تھا
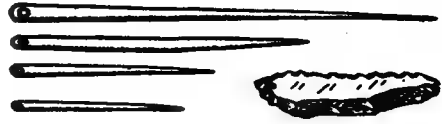
ایک اور پڑاؤ میں ہڈی کی سوئیاں بنانےوالا پورا ورکشاپ ملا ۔ اس میں تمام ضروری اوزار، ہڈیوں کے ٹکڑے اور نیم‌تیار سوئیاں تھیں ۔ ہر چیز اسی طرح تھی جیسے چھوڑی گئی تھی ۔ اس طرح کہ اگر ہماری جدید دنیا کو ہڈی کی سوئیوں کی ضرورت ہوتی تو ان کی مصنوعات کل سے پھر شروع کی جا سکتی تھی ۔ لیکن ہمیں اب اس کام کو کرنےوالا ایک بھی کاریگر مشکل سے ملےگا ۔

ہڈی کی سوئی اس طرح بنتی تھی کہ پہلے کسی خرگوش کی ہڈی سے ایک پتلا سا ٹکڑا پتھر کے چاقو کی مدد سے کاٹا جاتا تھا پھر پتھر کی ریتی کی مدد سے اس کی نوک کو پتلا اور تیز کیا جاتا تھا ۔ پھر ایک نوکیلا پتھر اس میں سوراخ بنانے کےلئے استعمال ہوتا تھا اور پھر اس سوئی کو پتھر کی سل پر رگڑ کر پالش کیا جاتا تھا ۔

اس طرح واحد سوئی بنانے میں اتنے اوزار اور اتنا وقت لگتا تھا!

ہر قبیلے میں ایسے باھنر کاریگر نہیں ہوتے تھے جو ہڈی کی سوئیاں بنا سکیں ۔ زمانۂتاریخ سے قبل ہڈی کی ایک سوئی بھی بہت ھی بیش‌بہا ملکیت سمجھی جاتی تھی ۔

آؤ ابتدائی دور کے شکاریوں کے پڑاؤ کا اندر سے جائزہ لیں ۔

برف‌پوش استیپی میدانوں کے بیچوں‌بیچ ہم متعدد چھوٹے چھوٹے ٹیلے دیکھتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک سے دھوئیں کے مرغولے لہراتے ہوئے نکل رہے ہیں ۔ ہم ایک ٹیلے کے قریب آتے ہیں اور دھوئیں کے ان بادلوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جو ہماری آنکھوں کو پریشان کر رہے ہیں ہم چمنی کے ذریعہ اندر پہنچ جاتے ہیں ۔

تھوڑی دیر کےلئے یہ تصور کرلو کہ ہم نے جادو کی ٹوپی پہن‌لی اور کسی کو دکھائی نہیں دیتے ۔ رہائش‌گہ کے اندر دھواں بھرا ہے اور اندھیرا ہے ۔ شور و غل ہو رہا ہے ۔ اس میں کم از کم دس بڑے اور اس سے کہیں زیادہ بچے ہیں ۔

جب ہماری آنسو سے بھری آنکھیں دھوئیں کی عادی ہوجاتی ہیں تو ہم کو آدمیوں کے چہرے اور بدن دکھائی دینے لگتے ہیں ۔ ان میں بندروں جیسی کوئی بات نہیں ہے ۔ وہ لمبے، سڈول اور مضبوط ہیں ۔ ان کی گال کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور

آنکھیں ایک دوسرے سے قریب ھیں۔ ان کے سیاہ جسموں پر لال رنگ کے نقش و نگار بنے ھوئے ھیں۔

عورتیں زمین پر ایک حلقے میں بیٹھی اپنی ھڈی کی سوئیوں سے جانوروں کی کھالوں کے لباس سی رھی ھیں۔ بچوں کے پاس کھلونے نہیں ھیں۔ وہ ایک گھوڑے کی ٹانگ اور بارہسنگھے کی سینگ سے کھیل رہے ھیں۔ چولھے کے پہلو میں ایک کاریگر اپنے پیر ایک دوسرے پر رکھے کام کرنےوالی پتھر کی بنچ پر بیٹھا ھے۔ ایک لکڑی کے دستے میں ھڈی کی تیز نوک لگاکر برچھا بنا رھا ھے۔ اس کے برابر ایک اور کاریگر اپنے پتھر کے چاقو سے کوئی نقش کھود رھا ھے۔

آؤ ذرا قریب سے چل کر دیکھیں کہ یہ نقش کیسا ھے؟

اس نے بڑی مہارت کے ساتھ ایک چرتے ھوئے گھوڑے کا خاکہ ھڈی پر بنایا ھے۔ اس نے گھوڑے کی خوبصورت ٹانگوں، محراب‌دار گردن، چھوٹے ایال اور بڑے سر کی نقش‌کاری بڑے صبر اور مہارت کے ساتھ کی ھے۔ اب معلوم ھوتا ھے کہ گھوڑا زندہ ھے اور بس حرکت کرنےوالا ھے کیونکہ ماھر نقاش نے اپنے تصور میں ھر تفصیل کو پیش نظر رکھا ھے۔

اب یہ نقش ختم ھوگیا۔ لیکن نقاش نے اسی پر بس نہیں کی۔ اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ وہ ایک زوردار ضرب سے گھوڑے پر ایک خط بنادیتا ھے، پھر دوسرا اور تیسرا۔ اب جانور کے بدن پر ایک انوکھی شکل نمودار ھوجاتی ھے۔ یہ ابتدائی دور کا نقاش کیا کر رھا ھے؟ وہ ایسے نقش کو کیوں خراب کررھا ھے جس پر آج کا ھر آرٹسٹ فخر کر سکتا ھے؟

ایک میموتھ جس پر دو خیمے بنے ھیں
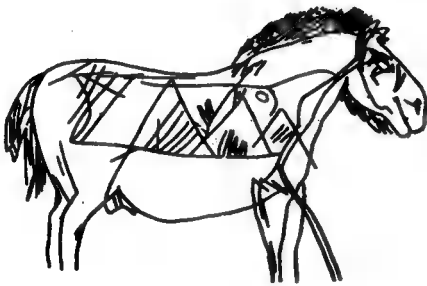
فن‌کار گھوڑے کی شکل بنانے کے بعد اس پر کئی خیمے بھی بناتا تھا
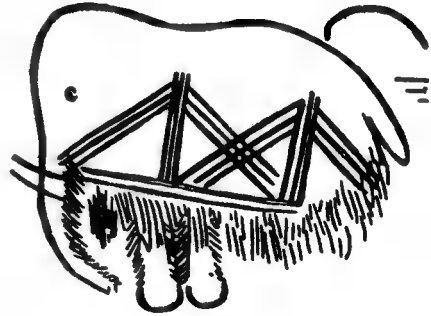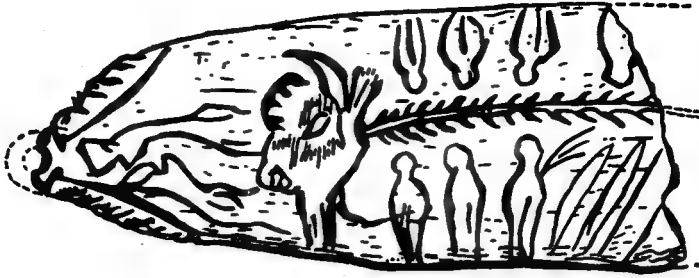
ھڈی پر یہ نقش کیا بتاتا ہے؟

یہ شکل زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے۔ اور پھر ہم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گھوڑے کے اوپر ایک خیمہ کا خاکہ نمودار ہوجاتا ہے۔ اس کے برابر یہ آرٹسٹ اور کئی خیمے بناتا ہے۔ ارے یہ تو پورا پڑاؤ ہے!

اس طرح کی ڈرائنگ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا یہ محض کاریگر کے اپنے خیالات کا نتیجہ ہے؟

نہیں، ہم ان عجیب ڈرائنگوں کا پورا مجموعہ ابتدائی دور کے شکاریوں کے غاروں سے جمع کر سکتے تھے۔ ایک ڈرائنگ میموتھ کی ہے جس پر دو خیمے بنے ہیں۔ ارنے بھینسے کی ایک ڈرائنگ پر تین خیمے ملتے ہیں۔ ایک میں ارنے بھینسے کا آدھا کھایا ہوا ڈھانچا بیچ میں دکھایا گیا ہے۔ سر، ریڑھ کی ہڈی اور ٹانگوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے۔ بڑا سا، داڑھی‌والا سر اگلے پیروں کے بیچ میں ہے اور اس کے ڈھانچے کے پاس آدمیوں کی دو قطاریں ہیں۔

ہڈی کے ٹکڑوں، پتھر کی سلوں اور چٹانوں پر جانوروں، آدمیوں اور خیموں کے ایسے بہت سے انوکھے نقش ملتے ہیں۔ لیکن ان کی سب سے بڑی تعداد غاروں کی دیواروں پر ملتی ہے۔

جب ہم اپنے غار کی کھدائی کر رہے تھے تو ہمیں اس کی دیواروں پر کوئی نقش نہیں ملے تھے۔

لیکن ہم تو غار کے دھانے پر تھے جہاں لوگ کھاتے، سوتے اور کام کرتے تھے۔

اچھا آؤ اب اور اندر چلیں اور تمام کونے دیکھیں اور ان سرنگوں کو دیکھیں جو سیکڑوں میٹر تک چلی گئی ہیں۔

غار کی ارنے بھینسے کی ڈرائنگیں

زمیں‌دوز آرٹ گیلری

آؤ اپنی ٹارچیں لیکر غار کی کھوج کریں - ہم کو ہر موڑ اور چوراھا یاد رکھنا پڑیگا ورنہ ہم یہاں کھوجائیں گے -

پتھر کی گزرگاہ زیادہ تنگ ہوتی جاتی ہے - چھت سے پانی ٹپکتا ہے - ہم اپنی ٹارچیں اٹھاکر غار کی دیواروں کا جائزہ لیتے ہیں -

زمیں‌دوز چشموں نے غار کو چمکدار کرسٹلوں سے آراستہ کردیا ہے - لیکن انسانی ہاتھ یہاں کارفرما نہیں رہا ہے -

ہم غار میں آگے بڑھتے ہیں - اچانک کوئی زور سے کہتا ہے :

"دیکھو!"

دیوار پر ایک بڑا ارنا بھینسا نقش ہے - وہ سرخ و سیاہ رنگا ہوا ہے - جانور

یہ عجیب مخلوق کون ہے جو کمان لئے ہے — آدمی یا جانور؟

اپنے اگلے پیروں پر گر گیا ہے اور اس کی کوہان والی پیٹھ میں بہت سے برچھے گڑے ہیں۔
هم اس نقش کے سامنے خاموش کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کو ایسے فن کار نے بنایا تھا جو ہزاروں سال پہلے گزرا ہے۔
تھوڑی دور آگے چل کر ہم کو ایک اور نقش ملتا ہے۔ ایک عفریت ناچ رہا ہے۔ یا تو یہ آدمی ہے جو جانور جیسا دکھائی دیتا ہے یا پھر کوئی جانور ہے جو آدمی جیسا نظر آتا ہے۔ عفریت کے سر پر خمدار سینگیں اور داڑھی ہے، اس کے کوبڑ اور بالدار دم ہے۔ اس کے ہاتھ پیر آدمی جیسے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں کمان ہے۔
قریب سے جائزہ لینے پر یہ عفریت آدمی نکلتا ہے جو ارنے بھینسے کی کھال پہنے ہے۔
آگے چل کر تیسری اور چوتھی ڈرائنگ ملتی ہے۔
یہ کیسی انوکھی آرٹ گیلری ہے؟
آجکل مصور روشن نگارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ گیلریوں میں تصویریں اس طرح لٹکائی جاتی ہیں کہ ان پر ہمیشہ روشنی پڑے۔ پھر ان ابتدائی دور کے لوگوں نے غار کی تاریکیوں میں، انسانی نگاہ سے دور کیوں گیلری بنائی؟
یہ بالکل صاف ہے کہ فن کار نے یہ نقوش دوسروں کے لئے نہیں بنائے تھے۔
لیکن اگر ایسا ہے تو اس نے آخر ان کو بنایا ہی کیوں؟ جانوروں کے بھیس میں یہ عجیب ناچتی ہوئی شکلیں کیا ہیں؟

راز اور اس کا حل

''متعدد شکاری ناچ میں حصہ لیتے ہیں۔ ہر ایک کے سر پر یا تو بھینسے کی کھال ہوتی ہے یا سینگ‌دار بھینسے کا چہرہ۔ ہر شکاری کے پاس کمان یا برچھا ہوتا ہے۔ یہ ناچ بھینسے کے شکار کا ناچ ہے۔ جب کوئی ناچنے‌والا تھک‌جاتا ہے تو وہ دکھاتا ہے کہ وہ گر رہا ہے۔ تب دوسرا ناچنے‌والا اس پر نقلی تیر چلاتا ہے۔ ''بھینسا،، زخمی ہوجاتا ہے۔ اس کو ٹانگیں پکڑکر حلقے سے باہر کھینچ لیتے ہیں اور پھر دوسرے ناچنے‌والے اس پر اپنے چاقو تان لیتے ہیں۔ پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور حلقے میں اس کی جگہ کوئی دوسرا ناچنے‌والا آجاتا ہے۔ یہ بھی بھینسے کا چہرہ پہنے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ ناچ، ایک لمحہ رکے بغیر، متواتر دو تین ہفتے تک جاری رہتا ہے۔،،
اس طرح ایک دیکھنے‌والے نے ابتدائی دور کے شکاریوں کے ناچ کے بارے میں لکھا ہے۔ لیکن اس نے یہ ناچ کہاں دیکھا ہوگا؟

اس نے یہ ناچ شمالی امریکہ کے میدانوں میں دیکھا جہاں بعض انڈین قبیلوں میں اب بھی قدیم شکاریوں کے رسم و رواج باقی ہیں۔

اس طرح ہم ایک سیاح کی ڈائری میں اسی شکار کے ناچ کا بیان پاتے ہیں جو قدیم دور کے فن‌کار نے غار کی دیوار پر نقش کیا ہے۔ اب ہم پراسرار ڈرائنگ کے راز کو سمجھ جاتے ہیں۔ لیکن اس راز کو حل کرتے ہوئے ہم ایک اور راز سے دوچار ہوتے ہیں۔ کس قسم کا ناچ ہفتوں تک جاری رہتا ہے؟

ہم ناچ کو ایسی چیز سمجھتے ہیں جس کا مقصد تفریح ہوتا ہے یا پھر وہ آرٹ کا کوئی نمونہ ہوتا ہے۔ کیا یہ انڈین واقعی محض تفریح کےلئے تین ہفتوں تک ناچتے تھے کہ تھک تھک کر گرجاتے تھے! وہ آرٹ کے بڑے دلدادہ تھے؟ اور پھر ان کا ناچ تو ایک رسم کی طرح ہے۔

ان کا جادوگر اپنے پائپ سے ایک خاص سمت دھواں چھوڑتا ہے اور ناچنےوالے اس طرف جاتے ہیں جیسے وہ کسی خیالی جانور کا پیچھا کر رہے ہوں۔ یہ جادوگر ناچ میں دھوئیں کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے اور ناچنے والوں کو اتر یا دکھن، پورب یا پچھم بھیجتا ہے۔

لیکن اگر جادوگر کسی ناچ کا ہدایت‌کار ہو تو اس کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی جادووالا ناچ ہے۔

انڈین یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنی عجیب حرکتوں سے بھینسوں پر جادو کرتے ہیں، اپنے عجیب جادو کے زور سے ان کو میدانوں سے اپنے قریب لاتے ہیں۔

دیوار پر ناچتی ہوئی شکل یہی ہے! یہاں صرف ناچنےوالا نہیں ہے بلکہ وہ ایک جادو بھی کر رہا ہے۔ اور جو فن‌کار تہہ‌زمین گہرائیوں میں گیا تاکہ یہ شکل آگ کی روشنی میں بنائے محض فن‌کار ہی نہیں بلکہ جادوگر بھی تھا۔

جانوروں کے چہرے پہنے شکاریوں اور زخمی بھینسوں کی شکلیں بناکر وہ اپنا جادو کر رہا تھا تاکہ شکار کامیاب رہے۔ اس کو قطعی عقیدہ تھا کہ یہ جادووالا ناچ شکار میں مدد دےگا۔

یہ بات ہمیں عجیب اور مضحکہ انگیز دونوں معلوم ہوتی ہے۔

جب ہم کوئی گھر بناتے ہیں تو ہم بڑھئیوں اور معماروں کی حرکتوں کی نقل کرکے مکان کی بنیاد کے چاروں طرف ناچتے نہیں ہیں۔ شکار پر جانے سے پہلے ہم بندوق لیکر بھی نہیں ناچتے۔ لیکن آج ہم جن چیزوں کو احمقانہ سمجھتے ہیں ہمارے زمانۂتاریخ سے قبل کے اجداد ان کو بہت ہی سنجیدہ باتیں سمجھتے تھے۔

اب ہم نے ایک پراسرار نقش کا راز پالیا ہے اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ناچتے ہوئے آدمی کی شکل دیوار پر کیوں بنائی گئی ہے۔

لیکن وہاں اور بھی عجیب نقوش تھے۔

یاد ہے، ہم نے غار میں ایک ہڈی پر پوری کہانی کندہ پائی تھی۔ یہ ایک بھینسے کے ڈھانچے کی تصویر تھی جس کے پاس دو قطاروں میں شکاری کھڑے تھے۔ صرف بھینسے کے سر اور اگلے پیروں کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔
یہ نقش کیا ہو سکتا ہے؟
اگر ہم اس کا جواب چاہتے ہیں تو ہمیں اس بار شمالی امریکہ کے بجائے روس کے شمال بعید کا سفر کرنا چاہئے۔
سائبیریا میں ایسی جگہیں ہیں جہاں اب سے تیس چالیس سال پہلے تک شکاری کوئی ریچھ مارنے پر ''ریچھ کی دعوت،، کرتے تھے۔ ریچھ کے ڈھانچے کو گھر میں لا کر کسی معزز جگہ پر رکھا جاتا تھا۔ وہ ریچھ کے سر کو اس کے اگلے پنجوں کے بیچ میں رکھتے تھے۔ روٹی یا برچ کی چھال کے بنے ہوئے بارسنگھوں کی کئی مورتیاں ریچھ کے سر کے قریب رکھ دی جاتی تھیں۔ گویا یہ ریچھ کا نذرانہ ہوتا تھا۔ ریچھ کے
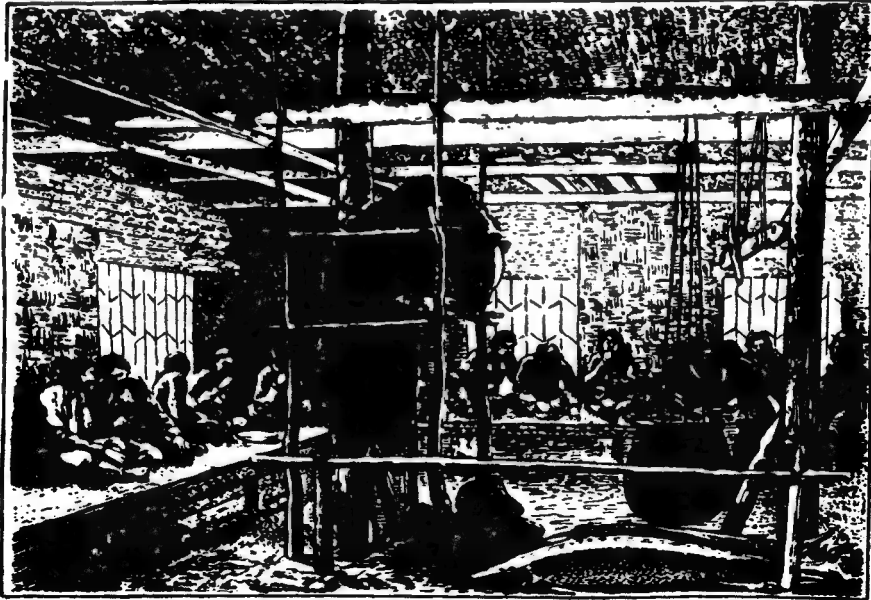
گیلیاک لوگ ''دعوت ریچھ،، منا رہے ہیں۔ ریچھ کے تھوتھن کے قریب کئی بڑی مچھلیاں بھینٹ کے طور پر رکھی ہیں

سر کو برچ کی چھال کے گچھوں سے سجایا جاتا تھا اور چاندی کے سکے اس کی آنکھوں میں رکھے جاتے تھے۔ پھر ہر شکاری باری باری جا کر اس کے تھوتھن کو چومتا تھا۔

یہ دعوت کی ابتدا ہوتی تھی جو کئی دنوں یا یوں کہنا چاہئے کئی راتوں تک جاری رہتی تھی۔

ہر رات شکاری اس ڈھانچے کے گرد جمع ہوکر ناچتے گاتے تھے۔ وہ برچ کی چھال یا لکڑی کے چہرے پہنتے تھے اور ریچھ کے پاس آکر اس کے سامنے جھکتے تھے اور پھر ریچھ کی بھدی چال کی نقل کرتے ہوئے ناچتے تھے۔

ناچنے والے جانوروں کی کھالوں اور چہروں میں (غار کی ڈرائنگ)

ناچ گانا ختم ہونے کے بعد وہ بیٹھ کر ریچھ کا گوشت کھاتے تھے لیکن سر اور اگلے پنجوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

اب ہڈی کے ٹکڑے پر ڈرائنگ کا مطلب سمجھ میں آگیا۔ اس میں ایک ''بھینسے کی دعوت،، کو پیش کیا گیا ہے۔ تصویر میں بھینسے کے چاروں طرف لوگ جمع ہوکر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کو گوشت دیا۔ وہ بھینسے سے درخواست کر رہے ہیں کہ آئندہ بھی اس کی مہربانی اسی طرح رہے۔

اگر ہم امریکی انڈینوں کے پاس پھر واپس جائیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان کے یہاں بھی ایسی دعوتیں ہوتی ہیں۔

کوی‌چوان قبیلے کے شکاری مارے ہوئے ہرن کے پچھلے پیر پورب کی طرف کرکے اس کو لٹاتے ہیں اور ایک پیالے میں اس کے سر کے قریب طرح طرح کے کھانے رکھ دیتے ہیں۔ ہر شکاری باری باری ہرن کے پاس جاتا ہے اور اس کو سر سے دم تک اپنے دائیں ہاتھ سے سہلاتا ہے اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ ہرن نے اپنے کو شکار کرنے کا موقع دیا۔ وہ مردہ جانور سے مخاطب ہوکر کہتا ہے:

''بڑے بھائی، آرام کرو!،،

پھر جادوگر ہرن سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے:

''تم اپنی سینگیں ہمارے لئے لائے۔ اس کے لئے تمہارا شکریہ۔

ساتواں باب

کیا کیا عجائبات ہیں وہاں..

تمام روسی بچے شہزادہ ایوان اور حسین واسی‌لیسا، آگ چڑیا اور کبڑے گھوڑے اور ایسے جانوروں کے بارے میں قصے کہانیاں جانتے ہیں جو آدمی بن‌جاتے تھے اور آدمی جو جانوروں کا روپ دھار لیتے تھے۔

اگر ہم پریوں کے قصے کہانیوں میں یقین کریں تو ساری دنیا میں مہربان اور ظالم، نظر آنےوالی اور نہ نظر آنےوالی پراسرار ہستیوں کی آبادی ہونی چاہئے تھی۔ اس خیالی دنیا میں ہر ایک کو ظالم جادوگروں اور بھیانک جادوگرنیوں کے جادو ٹونوں سے بچنا پڑتا۔

تم کو اپنی آنکھوں پر کبھی اعتبار نہ آتا کیونکہ کوئی انتہائی مکروہ صورت مینڈک دیکھتے دیکھتے کسی حسین دوشیزہ میں تبدیل ہوجاتا اور کوئی خوبصورت جوان ہولناک اژدھا بن‌جاتا۔ اس دنیا کے اپنے نرالے قاعدے ہیں۔ مردے جی اٹھتے ہیں، کٹے ہوئے سر بولتے ہیں اور جل پریاں مچھیروں کو پھسلا کر پانی کی تہہ میں لےجاتی ہیں۔

مشہور روسی شاعر پوشکن نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے:

کیا کیا عجائبات ہیں وہاں
بھتنی ایک منڈلاتی ہے وہاں
اور جل پری شاخوں میں نہاں

اور ہم یہ قصہ پڑھتے وقت اس پر یقین کرنے کےلئے تیار ہوجاتے ہیں۔ لیکن کتاب بند کرتے ہی ہم اپنی اصلی دنیا میں واپس آجاتے ہیں جہاں جادوگر یا جادوگرنیاں نہیں ہیں، جہاں ہر بات کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ کوئی پریوں کا قصہ چاہے کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو بہرحال ہم سچ مچ ایسی خیالی دنیا میں رہنا نہیں پسند کریں گے

جہاں دماغ لاچار ہو اور جہاں آدمی کو پیدائش سے ھی خوش قسمت ہونا چاہئے جو کسی بھیڑیامانس یا جادوگرنی سے پہلے ھی ٹکر لیکر ختم نہ ہو۔

لیکن ہمارے قدیم اجداد کا بالکل یہی خیال تھا کہ دنیا اسی طرح بنی ہے۔ ان کو خیالی دنیا اور اس حقیقی دنیا میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا جس میں وہ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا کی ساری اچھائیاں اور برائیاں دنیا پر حکومت کرنےوالی اچھی یا بری روحوں کی حرکتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

جب ہم کسی پتھر سے ٹھوکر کھاکر گرجاتے ہیں تو ہم اپنےکو یا اپنی لاپروائی کے سوا اور کسی کو الزام نہیں دیتے۔

لیکن قدیم زمانے کا آدمی اپنے کو ملزم نہیں ٹھہراتا تھا۔ وہ اس بری روح پر الزام دھرتا تھا جس نے اس کی راہ میں یہ پتھر ڈالا تھا۔

جب کوئی آدمی چاقو کی ضرب سے مارا جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ چاقو کے ذریعہ اس کا قتل ہوا۔

لیکن قدیم زمانے کا آدمی کہتا کہ آدمی کے مرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ چاقو پر جادو کیا گیا تھا۔

بہرحال، آج بھی ایسے لوگ ہیں کہ وہ ''نظر لگنے'' سے بیمار ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ دوشنبہ کے دن کوئی کام شروع کرنے کو بدشگونی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کالی بلی راستہ کاٹ‌جائے تو بھی شگون برا ہے۔

ہمارے خیال میں ایسے لوگ بیوقوف ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایسے وہم کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ نیک اور بدروحوں میں یہ سب عقیدہ جہالت کا نتیجہ ہوتا ہے اور جہالت ایسا جالا ہے جو اندھیرے کونوں میں ھی نظر آتا ہے۔

بہرنوع، ہم اپنے قدیم اجداد کا، جو جادوگروں اور بدروحوں پر یقین کرتے تھے، مذاق نہیں اڑائیں گے۔ وہ اس طرح قدرت کے قوانین کی وضاحت کرتے تھے کیونکہ صحیح جواب کےلئے ان کی معلومات بہت ھی کم تھیں۔

متعدد ابتدائی آسٹریلیائی قبیلے ابھی اسی معیار پر ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان میں پتھر کے زمانے کے وہم اور فضول خیالات باقی ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایک سیاح نے لکھا ہے ''مقامی ساحلی باشندے کسی بادبانی کشتی کو جس میں نئے قسم کا ساز و سامان اور مستول لگے ہوتے ہیں یا کسی دخانی جہاز کو جس میں دوسرے جہازوں سے زیادہ چمنیاں ہوتی ہیں دیکھ‌کر جوش میں آجاتے ہیں۔ کوئی برساتی، انوکھی قسم کی ٹوپی، جھولا کرسی یا کوئی ایسا اوزار جو انہوں نے پہلے نہ دیکھا ہو ان کو مشکوک بنا دیتے ہیں۔'' کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ جو چیز انہوں نے پہلے نہیں دیکھی ہے اس کا جادو ٹونے سے تعلق ہے۔

نیو پومیرانیا میں جادو منتر کا ناچ

تجربے نے انھیں بتایا ہے کہ ہر چیز کسی نہ کسی طرح دوسری چیز سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس کا سبب نہیں جانتے اس لئے ان کا یہ یقین جاری ہے کہ بعض چیزیں دوسری چیزوں پر جادو کا اثر رکھتی ہیں۔

وہ یقین کرتے ہیں کہ ''نظربد،، سے بچنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ کوئی تعویذ یا گنڈا وغیرہ پہنا جائے۔ یہ گھڑیال کے دانتوں کا ہار ہو سکتا ہے یا ہاتھی کے دم پر اگنے والے بالوں کا کوئی کنگن۔ تعویذ پہننے والے کو ہر آفت سے محفوظ رکھتا ہے۔

موجودہ ابتدائی قبیلوں کے آدمی بھی زمانۂ تاریخ سے قبل کے لوگوں سے زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ اور یہ لوگ بھی غالباً جادوٹونے وغیرہ پر یقین کرتے تھے۔ ہمیں اس کا ثبوت ان تعویذوں سے ملتا ہے جو آثارقدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں اور غاروں کے نقوش سے بھی۔

دنیا کے بارے میں ہمارے
اجداد کا خیال

ایسے آدمی کے لئے دنیا میں رہنا مشکل تھا جو اس کے قوانین سے ناواقف تھا ۔ کمزور اور لاچار تھا اور اپنے کو بالکل انجانی طاقتوں کے ہاتھ میں پاتا تھا ۔ اس کو ہر چیز کے تعویذ ہونے اور ہر آدمی کے جادوگر ہونے کا گمان ہو سکتا تھا ۔ وہ یقین کرتا تھا کہ ہر جگہ بدلہ لینے پر آمادہ، بےچین مردوں کی روحیں زندوں کی گھات میں ہیں ۔ شکار میں مارا ہوا ہر جانور واپس آکر شکاری سے بدلا لےسکتا ہے ۔

لاپ‌لینڈ کے لوگ اپنے اجداد سے دعا کر رہے ہیں کہ وہ انھیں شکار میں کامیاب کریں
(۱۷ ویں صدی کا نقش)

مصیبت سے بچنے کےلئے آدمی کو برابر روحوں کے سامنے گڑگڑاتے، ان کو خوش کرتے رہنا چاہئے۔ ان کو شانت رکھنے کےلئے بھینٹ دینا چاہئے۔

جہالت سے ڈر پیدا ہوتا ہے۔

اور جونکه آدمی کے پاس علم کی کمی تھی اس لئے وہ دنیا کے مالک کا رویه نہیں اختیار کر پاتا تھا۔ وہ ایک خوف‌زدہ، لاچار بھکاری کی طرح تھا۔

بہرحال، ابھی اس کےلئے یہ بات بہت قبل از وقت تھی کہ اپنے کو قدرت کا مالک سمجھے۔ اب وہ دنیا کے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ اس نے میموتھ پر فتح پائی تھی۔ پھر بھی وہ قدرت کی عظیم طاقتوں کے مقابلے میں ایک کمزور مخلوق تھا جس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان طاقتوں پر کیسے قابو حاصل کیا جائے۔

ایک ناکامیاب شکار کا مطلب تھا ہفتوں بھوکوں رہنا۔ ایک برفانی طوفان سارے پڑاؤ کو برف سے بھر دیتا تھا۔

پھر آدمی کو کس بات نے یہ طاقت عطا کی کہ وہ لڑتا رہے اور رفتہ رفتہ، قدم بقدم، قدرت کی طاقتوں پر قابو پانے کےلئے آگے بڑھے؟

اس کی طاقت یہ تھی کہ وہ تنہا نہیں تھا۔ پوری برادری، پورا قبیلہ ملکر قدرت کی مخالف طاقتوں سے لڑتا تھا۔ وہ ملکر کام کرتے تھے اور اپنی مشترکہ محنت کے ذریعہ علم اور تجربہ حاصل کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے یا اپنے طریقے سے سمجھتے تھے۔

وہ انسانی سوسائٹی کے معنی ہی نہیں سمجھتے تھے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے بندھے ہیں، کہ ایک جرگے کے لوگ دراصل واحد، زبردست، کثیر بازووالے آدمی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور ان کو کس چیز نے آپس میں باندھ رکھا تھا؟ وہ خون کے رشتوں سے بندھے تھے۔ لوگ بڑے بڑے خاندانوں میں رہتے تھے۔ بچے اپنی ماؤں کے ساتھ رہتے تھے

جادو کی چھڑیاں — اسکیمو شکاری کے تعویذ

اور جب وہ بڑے ہوجاتے تو ان کے اپنے بچے ہوتے تھے۔ پھربھی وہ اپنے بھائی، بہنوں، چچا، چچیوں، ماؤں اور دادیوں کے ساتھ رہتے تھے۔

اس طرح خاندان بڑھتا رہتا تھا۔

زمانۂتاریخ سے قبل کی سوسائٹی جس میں شکاری رہتا تھا اس کا اپنا خاندان ہوتا تھا، وہ جرگہ جو مشترکہ جد کی اولاد ہوتا تھا۔ لوگ یقین کرتے تھے کہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہے اس کےلئے وہ اپنے اجداد کے ممنون احسان ہیں۔ ان کے اجداد نے انہیں شکار کرنا اور اوزار بنانا سکھایا ہے، انھوں نے انہیں رہائش‌گاہیں دی ہیں اور آگ کا استعمال بتایا ہے۔

کام کرنا اور شکار کھیلنا اجداد کی مرضی پوری کرنا تھا۔ وہ آدمی جو اپنے اجداد کی مرضی کا فرماں‌بردار ہوتا تھا مصیبت اور خطرے سے محفوظ رہتا تھا۔ لوگوں کے اجداد ان کی روزمرہ کی زندگی کا نظر نہ آنےوالا جز تھے، ان کی روحیں ہر شکار میں ان کی ہدایت‌کار ہوتی تھیں اور ہمیشہ گھر میں موجود رہتی تھیں۔ یہ روحیں سب دیکھتی تھیں اور سب جانتی تھیں۔ وہ آدمی کو برائیوں کی سزا اور نیکیوں کا انعام دے سکتی تھیں۔

اسلئے مشترکہ بھلائی کےلئے مشترکہ کام، قدیم آدمی کےلئے مشترکہ جد کی فرماں‌برداری اور اس کی مرضی کی تکمیل کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔

پھربھی، قدیم آدمی خود اپنی محنت کو اس طرح نہیں سمجھتا تھا جس طرح ہم آج سمجھتے ہیں۔

ہم خیال کرتے ہیں کہ قدیم زمانے کا شکاری ارنےبھینسے مارکر خود کھاتا تھا اور اپنے خاندان کو کھلاتا تھا۔ لیکن شکاری یہ یقین کرتا تھا کہ بھینسا اس کو کھلاتا ہے۔ اب بھی قدیم زمانے کی باقیات کی وجہ سے ہم گائے کو رازق اور زمین کو دھرتی‌ماتا کہتے ہیں۔ ہم گائے سے اجازت لیکر اس کو نہیں دوھتے۔ پھربھی ہم کہتے ہیں کہ گائے ہم کو دودھ ”دیتی“ ہے۔
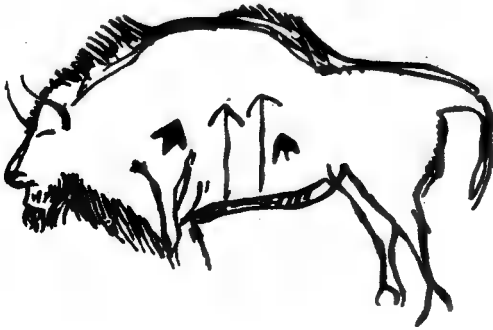
برچھوں سے چھدا ہوا ارنا بھینسا (غار کی جادو کی ڈرائنگ)

زمانۂ تاریخ سے قبل کے شکاری کا ”رازق“ جانور تھا۔

خواہ وہ ارنابھینسا ہو یا میموتھ یا بارسنگھا۔ شکاری یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے جانور کو مارا ہے بلکہ وہ یقین کرتا تھا کہ جانور نے اپنی مرضی سے اس کو اپنا گوشت اور چمڑا دیا ہے۔ انڈینوں کا عقیدہ ہے کہ جانور کو اس کی مرضی کے بغیر نہیں مارا جا سکتا۔ اگر کوئی ارنا بھینسا مارا جاتا ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ آدمیوں کےلئے اپنےکو بھینٹ دینا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کو مارا جائے۔

ارنابھینسا قبیلہ کا رازق اور محافظ ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ان کا مشترکہ جد بھی قبیلے کا محافظ ہوتا تھا۔

اس طرح قدیم زمانے کے آدمی کے دماغ میں (جس کو اس دنیا کے متعلق بہت کم معلومات تھیں جس میں وہ رہتا تھا) ''جد محافظ'' اور ''جانور محافظ'' جو قبیلے کا رازق تھا ایک دوسرے میں ضم ہوکر رہ گئے تھے۔

''ہم ارنےبھینسے کے بچے ہیں،، شکاری کہتے تھے اور وہ سچ مچ یقین بھی کرتے تھے کہ ارنابھینسا ان کا جد تھا۔ جب قدیم زمانے کا فن‌کار کسی ارنے بھینسے کا نقش بناتا تھا اور اس کے جسم پر تین خیمے کھینچتا تھا تو اس کا مطلب ہوتا ہے ''ارنے بھینسے کے بچوں کا پڑاؤ،،۔

اپنی روزمرہ کی محنت میں آدمی جانوروں سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن وہ ایسے تعلق کو نہیں سمجھتا تھا جو خون کا تعلق نہ ہو۔ ہر تعلق کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کچھ نہ کچھ مشترک ضرور ہے۔ جب وہ کوئی جانور مارتا تھا تو اس سے معافی مانگتا تھا اور اس کو بڑا بھائی کہہ‌کر خطاب کرتا تھا۔ وہ اپنے ناچوں اور جادو
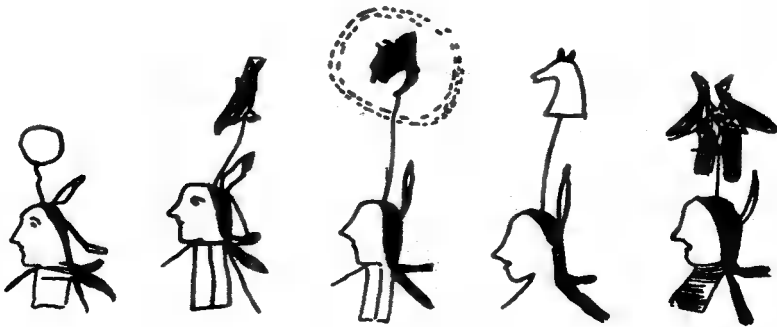
ان انڈین لوگوں کے سروں پر ان کے جادو والے نشان ہیں

ٹونے والے رسوم میں جانور بھائی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا - وہ اس کی کھال پہنتا تھا اور اس کی حرکتوں کی نقل کرتا تھا -

آدمی نے ابھی اپنے کو ''میں،، کہنا نہیں سیکھا تھا - وہ اب بھی اپنے کو جرگے کا ایک جز اور آلہ سمجھتا تھا - ہر جرگے کا اپنا نام، اپنا نشان (ٹوٹم) ہوتا تھا - یہ ان کے مشترکہ جد اور محافظ کسی جانور کا نام ہوتا تھا - کوئی جرگہ ''ارنابھینسا،، کہلاتا تھا تو کوئی ''ریچھ،، اور کوئی ''ھرن،، - جرگے کے آدمی ایک دوسرے کےلئے جان دینے پر تلے رھتے تھے - وہ جرگے کے رسوم کو اپنے نشان کی مرضی سمجھتے تھے اور نشان کی مرضی ھی قانون ھوتی تھی -

اپنے اجداد سے باتیں

آؤ پھر زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کے غار میں چلیں اور الاؤ کے پاس اس کے ساتھ بیٹھیں - ھم اس کے عقیدوں اور رسم و رواج کے بارے میں اس سے بات‌چیت کریں گے -

وہ ھمیں بتائے گا کہ آیا ھماری قیاس‌آرائیاں صحیح ھیں، آیا ھم نے غار کے نقوش اور ھڈی کے نقشیں تعویذوں کو صحیح سمجھا ھے جن کو ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اس نے ھمارے لئے خاص طور پر چھوڑا ھے -

لیکن غار کا مالک ھم سے کیسے باتیں کریگا؟

ھزاروں سال ھوئے ھوا چولھے سے راکھ تک اڑالے گئی ھے - ان لوگوں کی ھڈیاں جو کسی زمانے میں آگ کے پاس بیٹھ کر پتھر اور ھڈی کے اوزار بناتے تھے اور جانوروں کی کھال کے کپڑے سیتے تھے مدتوں ھوئے خاک ھو چکی ھیں - اب تو شاذ و نادر ھی ماھرین آثار قدیمہ کو زرد اور پتھرائی ھوئی انسانی کھوپڑی زمین میں ملتی ھے -

کیا کھوپڑی بات کر سکتی ھے؟

ھم نے غار کی کھدائی کی تاکہ ھم اوزاروں کے ٹکڑے تلاش کرسکیں اور یہ معلوم کرسکیں کہ ان اوزاروں سے قدیم آدمی کس طرح کام کرتا تھا -

لیکن ھم قدیم آدمی کی باتوں کے ٹکڑے کہاں سے لائیں؟

ھمیں اس کی تلاش اپنی جدید زبان میں کرنا چاھئے -

اس طرح کی کھدائی کےلئے کسی پھاوڑے کی ضرورت نہیں ھے کیونکہ ھم اس طرح کی کھدائی ڈکشنری میں کریں گے زمین میں نہیں - ھر زبان، ھر بولی میں ماضی

کے بیش‌بہا جواہر پائے جاتے ھیں۔ اور یہی ھونا بھی چاھئیے۔ بھرحال ھماری زبان میں ھزاروں سال کا تجربہ شامل ھے۔

تم کہہ سکتے ھو کہ زبان کے مطالعہ اور اس کے بارے میں دریافت سے آسان بات اور کیا ھوسکتی ھے! بس یہی تو کرنا ھے کہ ڈکشنری لیکر بیٹھ گئے اور اس کی ورق گردانی کرڈالی!

لیکن یہ ایسی معمولی بات نہیں ھے۔

تحقیقات کرنےوالے قدیم الفاظ کی تلاش میں ساری دنیا کا سفر کرتے ھیں، ڈھالو پہاڑوں پر چڑھتے ھیں اور سمندر پار کرتے ھیں۔ کبھی کبھی ایسے لوگ بھی مل‌جاتے ھیں جنھوں نے کسی اونچے پہاڑ کے پیچھے اپنی چھوٹی سی برادری بنا رکھی ھے اور ان قدیم الفاظ کو محفوظ رکھا ھے جو مدتوں ھوئے دوسری زبانوں سے غائب ھوچکے ھیں۔

ھر زبان بنی‌نوع انسان کے طویل راستے پر ایک پڑاؤ کی حیثیت رکھتی ھے۔ آسٹریلیا، افریقہ اور امریکہ کے شکاری قبیلوں کے پڑاؤ ھم مدتوں ھوئے پیچھے چھوڑ آئے ھیں۔ پھر تحقیقات کرنےوالے سمندروں کو پار کرکے پولی‌نیشیا پہنچتے ھیں تاکہ وہ پرانی اصطلاحات اور جملے تلاش کریں جو ھم بھول چکے ھیں۔

الفاظ کی تلاش میں تحقیقات کرنے والے سرگرداں رھتے ھیں۔ وہ جنوب کے ریگستانوں اور شمال کے ٹنڈرا کو چھانتے ھیں۔

سوویت یونین میں شمال بعید کے لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے ھیں جو اس زمانے کے ھیں جب نجی ملکیت نہیں ھوتی تھی، جب لوگ ''میرے،، کے معنی نہیں جانتے تھے مثلاً ''میرا گھر،، ، ''میرا ھتیار،، وغیرہ۔

اگر ھمیں قدیم بول چال کی باقیات تلاش کرنا ھیں تو ھمیں اسی طرح کی زبانوں کو ''کھودنا،، چاھئے جس طرح ماھرین آثارقدیمہ قدیم زمانے کے پڑاؤں میں کھنڈرات اور اوزار کھودتے ھیں۔

ھر آدمی تو ڈکشنری کی کھدائی کا ماھر نہیں ھو سکتا۔ اس کےلئے خاص تربیت اور علم کی ضرورت ھے کیونکہ زبان میں پرانے الفاظ میوزیم کی طرح محفوظ نہیں رھتے۔ صدیوں کے دوران الفاظ کئی بار اپنا روپ بدلتے ھیں۔ وہ سفر کرکے ایک زبان سے دوسری زبان میں پہنچتے ھیں، ان کے شروع اور آخر کے حصے بدلتے رھتے ھیں۔ کبھی کبھی صرف پرانے الفاظ کی جڑیں ھی، کسی پرانے جلے ھوئے درخت کی جڑوں کی طرح باقی رہ‌جاتی ھیں۔ اور صرف جڑ ھی کے ذریعہ اس بات کا پتہ چلتا ھے کہ لفظ اصل میں کہاں سے آیا ھے۔

ھزاروں لاکھوں سال کے دوران نہ صرف الفاظ کی صورت بدلتی ھے بلکہ ان کے

معنی میں بھی تبدیلی ہوتی ہے - کبھی کبھی لفظ کو ایسے معنی مل جاتے ہیں جو پہلے والے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں -

یہ اب بھی ہوتا ہے - جب کوئی نئی چیز دریافت ہوتی ہے یا بنائی جاتی ہے تو ہم ہمیشہ اس کے لئے نئے الفاظ نہیں ایجاد کرتے ہیں - ہم اکثر ڈھونڈھ کر کوئی پرانا لفظ اس نئی چیز پر اس طرح چپکا دیتے ہیں جیسے وہ کوئی لیبل ہو -

مثلاً گھڑی کے لفظ کو لے لیجئے - آجکل کی گھڑیاں گھنٹوں، منٹوں اور سکنڈوں میں وقت بتاتی ہیں اور شاید اب بہت کم لوگ وقت کی تقسیم میں گھڑیوں کے بارے میں جانتے ہوں - اسی طرح پھل کا لفظ چاقو کے تیز حصے اور دوسری چیزوں کے دھاردار حصے کے لئے بھی آتا ہے - حالانکہ اصل پھل سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے - مچھردانی کو لیجئے - اس میں دراصل مچھر رہتے نہیں یا پکڑے نہیں جاتے جیسے چوہے، چوہےدان میں بلکہ مچھردانی کے ذریعہ مچھر اس کے اندر لیٹے ہوئے آدمی سے دور رکھے جاتے ہیں - اس طرح کسی نئے رشتے یا رابطے کی وجہ سے گھڑی، پھل اور مچھردانی کو نئے معنی دئے گئے ہیں -

یہ سب بہت حال کی تبدیلیاں ہیں جو ہماری زبان کی اوپری تہوں میں ہوئی ہیں - اسی‌لئے ان الفاظ کے پہلے معنی معلوم کرنا اتنا آسان ہے -

لیکن ہم جتنا ہی گہرائیوں میں اترتے جاتے ہیں کام اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے - الفاظ کے قدیم اور ایسے معنی تلاش کرنے کےلئے جو معدوم ہوچکے ہیں آدمی کو بڑا عالم ہونا چاہئے -

قدیم بولی کی باقیات

زبانوں کی تحقیقات کرتے وقت محققوں نے آوازوالی قدیم زبان کی باقیات پائی ہیں - ان باقیات کے بارے میں اکادمیشن میشچانی‌نوف نے اپنی ایک کتاب میں بتایا ہے -

انھوں نے لکھا ہے کہ یوکاگیروں کی زبان میں ایک لفظ ہے جس کے لفظی معنی ہوئے ''آدمی ہرن مار،، - یہ ایک بڑا اور بھدا لفظ ہے اور اس کے معنی سمجھنا اور زیادہ مشکل ہے -

کون کس کو مارتا تھا؟ آدمی ہرن کو مارتا تھا کہ ہرن آدمی کو یا دونوں مل کر کسی اور کو مارتے تھے یا کوئی اور ان دونوں کو مارتا تھا؟

لیکن یوکاگیر یہ لفظ سمجھتے ہیں - یہ لفظ ▪ تب استعمال کرتے ہیں جب وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''آدمی نے ہرن ماردیا،، -

ایسا عجیب لفظ کیسے بنا؟

یہ اس زمانے کی بات ہے جب آدمی اپنے متعلق ''میں،، کا لفظ نہیں استعمال کرتا تھا، جب وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وھی خود کام کرتا ہے، شکار کھیلتا ہے، گھات لگا کر ھرن کو مارتا ہے۔ وہ یقین کرتا تھا کہ اس نے نہیں بلکہ سارے جرگے نے ملکر اور جرگے نے بھی نہیں بلکہ پراسرار، انجانی طاقتوں نے جو ھر چیز پر حکمراں ھیں ھرن کو مارا ہے۔ اس دوردراز زمانے میں دنیا میں انسان بہت کمزور اور لاچار تھا کیونکہ قدرت اس کا حکم نہیں مانتی تھی۔

ایک دن ''آدمی ھرن مار،، کسی انجانی طاقت کی مرضی کی وجہ سے کامیاب رہا۔ دوسرے دن شکار ناکامیاب ھوا اور لوگ پڑاؤ پر خالی ھاتھ واپس آئے۔ ''آدمی ھرن مار،، کے لفظ سے اس بات کا اظہار نہیں ھوتا ہے کہ عمل کرنےوالا کون ہے۔ اور قدیم زمانے کا آدمی سمجھ بھی کیسے سکتا تھا کہ عمل کرنےوالا کون تھا — وہ یا ھرن؟ کیونکہ وہ یقین کرتا تھا کہ ھرن تو اس کو اپنے انجانے محافظ کی طرف سے ملا ہے — جو ھرن اور خود کا مشترکہ جد ہے۔

''آدمی ھرن مار،، (قدیم زمانے کی ڈرائنگ)

اگر اپنی کھدائی میں ھم انسانی بول‌چال کی پہلی تہہ سے بعد کی تہوں تک آتے ھیں تو ھمیں اکثر اس بول‌چال کی باقیات ملتی رھیں گی جو ھمیں اس زمانے میں پیچھے لےجاتی ہے جس میں آدمی اپنے کو پراسرار طاقتوں کا آلۂ کار سمجھتا تھا۔

چوکچیوں کی زبان میں ایک جملہ ہے ''آدمی کے ذریعہ گوشت کتے کو دیتا ہے،،۔

ظاھر ہے کہ یہ جملہ بہت گلمڈ ہے۔ ھم نے یہ جملہ بول چال کی ایک تہہ سے کھودا جو زمانہ ھوئے دفن پڑی تھی۔ اس وقت لوگ اس طرح نہیں سوچتے تھے جیسے آج سوچتے ھیں۔

یہ کہنے کے بجائے کہ ''آدمی اپنے کتے کو گوشت
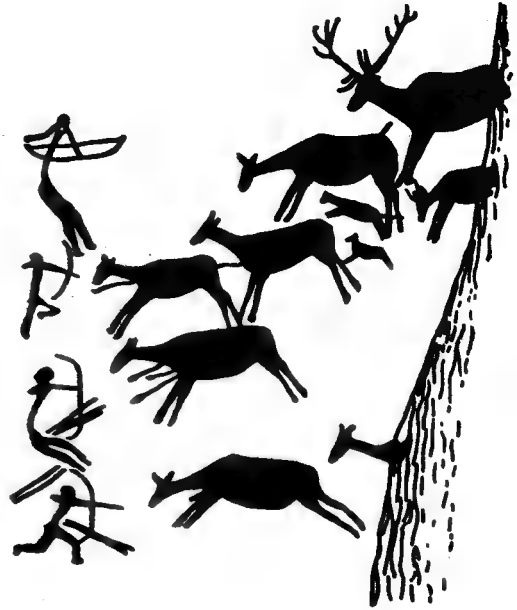
دیتا ہے،، قدیم لوگ کہتے تھے ''آدمی'' کے ذریعہ گوشت کتے کو دیتا ہے،،۔

تو آدمی کے ذریعہ گوشت کون دیتا ہے؟

وہ پراسرار طاقت جو آدمی کو آلۂکار کی طرح استعمال کرتی ہے۔

ڈکوتا انڈین یہ کہنے کے بجائے کہ ''میں بنتا ہوں،، کہتے ہیں ''بنائی میری کی ہوئی،، جیسے وہ خود کروشیا کی سلائی ہو اس کا استعمال کرنےوالا نہیں۔

پرانی بول‌چال کی باقیات کے نمونے اب بھی یورپی زبانوں میں پائے جا سکتے ہیں۔ جیسے فرانسیسی میں کہاجاتا ہے il fait froid یعنی ''سردی ہے،،۔ لیکن اگر اس کا لفظ بلفظ ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا ''وہ سردی کرتا ہے،،۔

پھر ہمیں وہی پراسرار، دنیا پر حکومت کرنےوالا ''وہ،، ملتا ہے۔

لیکن ہمیں غیرملکی زبانوں سے مثالیں ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدیم بول‌چال کی کافی سے زیادہ مثالیں یعنی قدیم خیالات کے نمونے روسی زبان میں بھی ملتے ہیں۔

مثلاً ہم کہتے ہیں ''اس کو دوھرا کر دیا گیا،، یا ''اس کو کپکپا دیا،،۔ اچھا، تو کون سی طاقت ہے جو آدمی کو دھرا کرتی یا کپکپاتی ہے۔

اسی طرح اور بھی متعدد جملے ہیں جن میں ''وہ،، کی انجانی، پراسرار طاقت موجود نظر آتی ہے۔

ہم تم کسی پراسرار طاقت میں یقین نہیں رکھتے، لیکن ہماری بات‌چیت میں اب بھی ہمارے اجداد کی زبانوں کی باقیات موجود ہیں جو ان تمام طاقتوں میں بڑا عقیدہ رکھتے تھے۔

اس طرح زبانوں کی تہیں کھودتے ہوئے، ہمیں صرف الفاظ نہیں بلکہ قدیم زمانے کے لوگوں کے خیالات بھی ملتے ہیں۔ قدیم زمانے کا آدمی ایک عجیب اور پراسرار دنیا میں رہتا تھا، جہاں وہ کام اور شکار نہیں کرتا تھا بلکہ کوئی اسے کام کےلئے استعمال کرتا تھا، اسے ہرن مارنے کےلئے استعمال کرتا تھا، جہاں ہر ہونےوالی بات کسی انجانی ہستی کی مرضی کے مطابق ہوتی تھی۔

لیکن وقت گزرتا گیا۔ آدمی جتنا زیادہ مضبوط ہوتا گیا، جتنا اپنے چاروں طرف کی دنیا کو سمجھتا گیا اور دنیا میں اپنی جگہ کو پہچانتا گیا، اس کی زبان میں ''میں،، کا لفظ اتنا ہی زیادہ آتا گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ شخص بھی نمودار ہوا جو کام کرتا تھا، جدوجہد کرتا تھا اور چیزوں اور قدرت کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا تھا۔

اب ہم ''آدمی ہرن‌مار،، نہیں کہتے ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں ''آدمی نے ہرن کو مارا،،۔ پھربھی ہر زبان میں جب تب پچھلے زمانے کا سایہ نظر آجاتا ہے۔ کیا ہم نہیں کہتے ''قسمت کا لکھا،، ، ''یہ بدشگون ہے،، وغیرہ۔

کون لکھتا ہے؟ کون اس کو بلشگون بناتا ہے؟

قسمت!

لیکن قسمت بھی وہی انجانی چیز ہے جس سے قدیم زمانے کا آدمی ڈرتا تھا۔ ''قسمت،، کا لفظ اب بھی ہماری زبانوں میں موجود ہے۔ لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل میں غائب ہو جائے گا۔

ایک عجیب چڑیا جس کی چونچ سے بجلی اور گرج پیدا ہوتی ہے (ڈکوٹا انڈین لوگوں کی ڈرائنگ)

اب کسان اعتماد کے ساتھ کھیت جوتتا ہے اور جانتا ہے کہ بری یا اچھی فصل کا دار و مدار خود اس پر ہے۔ اس کی مدد کرنے والی فارم کی بہت سی مشینیں اور کھادیں ہیں جو بنجر زمین کو زرخیز بناتی ہیں اور سائنس جو پودوں کو پروان چڑھانے میں اس کی مدد کرتی ہے۔

جہازران اب اعتماد کے ساتھ اپنے بحری سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ خاص آلات ان کو بتاتے ہیں کہ کہاں پانی اتھلا ہے اور سمندر میں طوفان آنے کی اطلاع پہلے سے حاصل کر لیتے ہیں۔

اس طرح کے جملے اب کم سننے میں آتے ہیں ''یہ اس کی قسمت ہے،،، ''یہ تو پہلے سے لکھ گیا تھا،،۔

جہالت سے خوف پیدا ہوتا ہے اور علم سے اعتماد۔ علم آدمی کو اب قدرت کا غلام نہیں رکھتا بلکہ اس کو قدرت کا مالک بناتا ہے۔

''روح اعظم،، کی شان میں گیت کی تصویرکشی جادو کے نشانات کے ذریعہ

آٹھواں باب

گلیشیروں کا پیچھے ہٹنا

ہر سال جب برف پگھلنے لگتی ہے تو اچانک ہر جگہ، جنگلوں اور کھیتوں میں، گاؤں کی سڑکوں کے برابر اور گڈھوں میں اچھلتے کودتے، طوفانی چشمے، چھوٹی چھوٹی ندیاں، نالے اور آبشار پیدا ہو جاتے ہیں۔

وہ جمی ہوئی اور گندی برف کے نیچے سے ان بچوں کی طرح پھدک کر نکلتے ہیں جو کسی طرح گھر کے اندر نہیں رہ سکتے۔ یہ دھارے پتھروں پر اور سڑکوں کے پار جھپٹتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور ان کی بہنے کی گونج فضا میں ہوتی ہے۔

برف روشن ڈھالوں اور کھلے میدانوں سے پیچھے ہٹ کر گھاٹیوں، گڈھوں اور دیواروں کے پیچھے سایہ‌دار کونوں میں چلی جاتی ہے جہاں وہ کبھی کبھی مئی کی گرم کرنوں کے آنے تک چھپی رہتی ہے۔

قدرت میں بہت جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔سورج چند دنوں میں ننگی پہاڑیوں کو سرسبز گھاس کا لباس پہنا دیتا ہے اور درخت کی خالی ٹہنیوں پر کونپلیں آ جاتی ہیں۔

یہ ہر بہار میں ہوتا ہے جیسے ہی جاڑے میں جمی ہوئی برف کی موٹی تہہ پگھلتی ہے۔

لیکن زمانۂ‌تاریخ سے قبل کیا ہوا جب برف کا زبردست کمبل جو دنیا پر ایک سفید ٹوپی کی طرح تھا پگھلنا شروع ہوا؟

تب چشموں اور چھوٹی چھوٹی ندی نالوں کے بجائے بڑے بڑے اور گہرے دریا برف کے نیچے سے پھوٹ نکلے۔ ان میں سے اب بھی بہت سے سمندر کی طرف بہتے ہیں اور راستے میں ہر چھوٹے چشمے اور دریا سے پانی جمع کر لیتے ہیں۔

یہ قدرت کی زبردست انگڑائی تھی، وہ زبردست بہار جس نے شمال کے میدانوں کو بڑے بڑے جنگلوں سے ڈھک دیا۔

لیکن بہار اچانک تو ہوتی نہیں۔ کبھی کبھی مئی میں گرم اور دھوپ‌والے

دن کے بعد ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی ہے اور جب دوسرے دن صبح تم جگتے ہو تو چھتوں پر برف نظر آتی ہے۔ ہر چیز اس طرح سفید لباس پہن لیتی ہے جیسے بہار کبھی آئی ھی نہ ہو۔ زمانۂتاریخ سے قبل کی زبردست بہار بھی ایکدم جاڑے پر قابو نہیں پا سکی۔ گلیشیر رفتہ رفتہ پیچھے ہٹے، جیسے ▪ زبردستی پیچھے ڈھکیلے جا رہے ہوں اور جہاں بھی ان سے ہو سکا وہ صدیوں تک ڈٹے رہے۔

کبھی کبھی گلیشیر تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ایسے رک جاتے تھے جیسے اپنی طاقت جمع کر رہے ہوں اور پھر آگے بڑھتے تھے۔ ٹنڈرا بھی ان کے ساتھ جنوب کی طرف جا رہے تھے اور ان کے ساتھ ان کے سدا کے ساتھی رینڈیر بھی۔

میدانوں پر گھاس کو دبائے ہوئے کائی پھیلی تھی۔ ارنے بھینسے اور گھوڑے اور آگے جنوب میں گھاس کے میدانوں تک چلے گئے۔

گرمی اور سردی کی لڑائی بہت دنوں تک جاری رہی لیکن آخر میں گرمی کی جیت ہوئی۔

پگھلتے ہوئے گلیشیروں سے بڑے بڑے دریا زوروں کے ساتھ بہہ نکلے۔ برف کی جو ٹوپی دنیا کو ڈھکے تھی سکڑنے اور چھوٹی ہونے لگی۔ برف کی سرحد اور شمال کی طرف ہٹ گئی اور اس کے ساتھ ٹنڈرا بھی۔ ان علاقوں میں جہاں پہلے صرف کائی اور چھدرے، ٹیڑھے میڑھے چھوٹے چھوٹے صنوبر کے درخت تھے وہاں اب بڑے بڑے تناور صنوبر کے درختوں کے زبردست جنگل ہوگئے۔

اور گرمی برابر بڑھتی گئی۔

اب گہرے سبز صنوبروں کے جھنڈوں کے درمیان آسپ اور برچ کی ہلکی سبز کلغیاں نظر آنے لگیں۔ اور ان کے پیچھے چوڑی پتیوں والے بلوط اور لارش بھی شمال کی طرف چلے۔

''صنوبر کا زمانہ،، اب ''بلوط کا زمانہ،، بن گیا۔ ایک جنگلی گھر نے دوسرے کی جگہ لے لی۔

لیکن ہر جنگلی گھر کے رہنےوالے بھی الگ الگ تھے۔

جب پتیوںوالے جنگل شمال کی طرف بڑھے تو جھاڑیاں، سانپ چھتریاں اور بیریاں بھی ان کے ساتھ بڑھیں اور وہ جانور بھی جو جنگلوں سے غذا حاصل کرتے تھے۔ ان میں جنگلی سور، گوزن، ارنابھینسا، لال ہرن تھے جن کی سینگیں بڑی شاندار ہوتی ہیں۔ ان میں بھورا ریچھ بھی تھا جس کو میٹھی چیزیں پسند ہیں۔ وہ جھاڑیوں کو توڑ کر شہد تلاش کرتا تھا۔ بھیڑئیے بہت دبی چال سے گری ہوئی پتیوں پر دوڑ کر خرگوشوں کا پیچھا کرتے تھے۔ گول چہرے اور چھوٹے پنجوںوالے عودبلاؤ جنگلی چشموں کے آرپار اپنے بند بناتے تھے۔ کثیر تعداد چڑیوں کے گیتوں، جھیلوں پر آتے ہوئے راج ہنسوں اور بطخوں کے شور سے سارا جنگل گونجنے لگا۔

برف کے قیدی

جب قدرت میں اتنی زبردست تبدیلیاں ہو رہی تھیں اس وقت آدمی صرف کنارے کھڑا ہو کر تماشائی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ تھیٹر کے مناظر کی طرح ہر چیز اس کے چاروں طرف بدل رہی تھی۔ لیکن ڈرامے اور اس میں فرق یہ تھا کہ اس کے ہر ایکٹ میں ہزاروں سال لگ جاتے تھے اور اسٹیج ہزاروں لاکھوں مربع کلومیٹر لمبا چوڑا تھا۔

اور اس ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ڈرامے میں آدمی تماشائی نہیں بلکہ ایکٹروں میں ایک تھا۔

ہر بار جب منظر بدلتا تو آدمی کو بھی وجود قائم رکھنے کے لئے زندگی بدلنی پڑتی۔

جب ٹنڈرا جنوب کی طرف بڑھنے لگا تو اپنے ساتھ رینڈیر لایا جیسے یہ جانور اس کے بندی ہوں اور زنجیر سے اس کے ساتھ بندھے ہوں۔ اس نظر نہ آنےوالی زنجیر کے ایک سرے پر رینڈیر تھے اور ٹنڈرا کی کائی دوسرے سرے پر۔

رینڈیر جنکی غذا کائی تھی ٹنڈرا میں ادھر ادھر پھرتے تھے اور آدمی بھی ان کے تعاقب میں رہتا تھا۔

استیپی میدانوں میں آدمی ارنے بھینسے اور گھوڑوں کا شکار کرتا تھا اور ٹنڈرا میں رینڈیروں کا۔

رینڈیر کے سوا وہ ٹنڈرا میں اور کس چیز کا شکار کر سکتا تھا؟

میموتھ سب کے سب مر چکے تھے۔ زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی نے ہزاروں میموتھ مار کر ان کی ہڈیوں کے پہاڑ اپنی رہائش گاہوں کے قریب لگا دئے تھے۔ اس نے گھوڑوں کے بہت سے غول کے غول ماڑدالے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ اس وقت جنوب چلے گئے جب ہری بھری گھاس کی جگہ سوکھی کائی نے لے لی۔

اس طرح رینڈیر ہی ٹنڈرا میں آدمی کا واحد رازق رہ گیا۔ وہ رینڈیر کا گوشت کھاتا تھا، اس کی کھال پہنتا تھا اور اس کی سینگوں سے اپنے برچھے اور مچھلی کے شکار کے کانٹے بناتا تھا۔ اس لئے اس کو اپنی زندگی کو مکمل طور پر رینڈیر کے مطابق بنانا پڑا۔

جہاں بھی رینڈیر کے گلے جاتے آدمی ان کے پیچھے جاتا۔ جب قبیلے پڑاؤ ڈالتے تو عورتیں جلدی سے خیموں کو کھالوں سے ڈھک دیتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کو زیادہ دن تک ایک جگہ نہیں رہنا ہے۔ جب مچھروں کے دل بادل گلوں کو نئی چراگاہیں ڈھونڈھنے پر مجبور کرتے تھے تو لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ

ہوتا تھا کہ وہ پڑاؤ اکھاڑ کر ان کے پیچھے جائیں۔ عورتیں خیمے اکھاڑتیں اور ان کو اپنی پیٹھ پر ڈال لیتیں۔ وہ ٹنڈرا میں ہانپتی کانپتی، تھکی ہاری چلتی رہتیں اور مرد ان کے آگے آگے تیزی سے چلتے۔ ان کے پاس سوائے برچھوں اور مچھلی پکڑنے کے آنکڑوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔ گھریلو معاملات کی فکر کرنا مرد کا کام نہیں تھا۔

ٹنڈرا میں رینڈیر ہی آدمی کی کفالت کرتا تھا

پھر ٹنڈرا شمال کی طرف ہٹنا شروع ہوا اور اس کے ساتھ رینڈیر بھی چلے۔ ٹنڈرا کی جگہ بڑے بڑے، ناقابل گذر جنگل اگ آئے۔ پھر زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کا کیا حشر ہوا؟

بعض شکاری قبیلے شمال میں رینڈیر کے گلوں کا تعاقب کرتے ہوئے آرکٹک کی طرف چلے گئے۔ ان کے لئے یہ بہت آسان تھا کیونکہ وہ شمالی آب و ہوا کے کافی عادی ہو گئے تھے۔ برفانی دور کا انتہائی شدید جاڑا لاکھوں سال تک رہا۔ ان لاکھوں برسوں میں قدیم زمانے کے آدمی جاڑے کا مقابلہ کرنا، جانوروں کے گرم سمور سے اپنے کپڑے بنانا سیکھ لیا۔ باہر جتنا ہی زیادہ سخت جاڑا ہوتا کھودی ہوئی رہائش گاہ کے اندر چولھا اتنا ہی زیادہ روشن ہوتا۔

اب ٹھہرنے سے آرکٹک کو منتقل ہو جانا زیادہ آسان تھا۔ بہرحال آسان راستہ ہمیشہ سب سے بہتر راستہ نہیں ہوتا اور ان لوگوں نے جو ٹنڈرا کے ساتھ شمال کو چلے گئے تھے بہت کچھ کھو دیا کیونکہ برفانی دور ہزاروں سال تک چلتا رہا۔ گرین لینڈ کے اسکیمو لوگ اب بھی برف کے درمیان رہتے ہیں اور قدرت کے خلاف جو وہاں بہت سخت اور بالکل عریاں ہے متواتر جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

جو قبیلے ٹھہر گئے تھے ان کی حالت بالکل مختلف ہوئی۔ پہلے تو ابھرتے ہوئے جنگلوں کے درمیان ان کی زندگی زیادہ کٹھن ہو گئی۔ لیکن بالآخر انھوں نے اپنے کو برفانی قید خانے سے رہا کر لیا جس میں ان کے اجداد ہزاروں سال تک قیدی رہ چکے تھے۔

جنگل سے آدمی کی لڑائی

جہاں پہلے ٹنڈرا تھے وہاں جو جنگل ابھرے وہ بالکل ہمارے موجودہ جنگلوں کی طرح نہیں تھے۔ یہ بڑے بڑے درختوں اور جھاڑیوں کی ایک گھنی اور نا قابل گذر دیوار تھی جو ہزاروں کلومیٹرتک پھیلتی چلی گئی تھی۔ وہ دریاؤں اور جھیلوں کے کناروں تک اور بعض جگہوں پر سمندروں کے ساحلوں تک بڑھتی چلی گئی تھی۔

اس انوکھی اور نئی دنیا میں زمانۂتاریخ سے قبل کے آدمی کی زندگی آسان نہ تھی۔ جنگل اس کو اپنے جھبرے پنجوں میں لیکر گھونٹتا تھا، اس کے لئے سانس لینے کی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کو جنگل کے خلاف متواتر لڑائی لڑنی پڑتی تھی۔ وہ درختوں کو کاٹتا اور زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعے صاف کرتا تھا۔

ٹنڈرا ہو یا میدان، قدیم زمانے کے آدمی کو پڑاؤ کے لئے جگہ پانا دشوار نہ تھا۔ ہر جگہ کافی گنجائش تھی۔ لیکن جنگل میں اس کو پہلے یہ کھلی جگہ قدرت سے چھین کر لینا پڑتی تھی۔ جنگل کی ہرجگہ درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے بھری ہوتی تھی اور آدمی کو جنگل پر اس طرح حملہ کرنا پڑتا تھا جیسے دشمن کے قلعے پر کیا جاتا ہے۔

لیکن ہتیاروں کے بغیر جنگ کیسے ممکن ہے۔ درختوں کو کاٹنے کے لئے کلہاڑی کی ضرورت تھی۔ اس طرح آدمی نے ایک بھاری تکونا پتھر لمبے دستے میں لگایا۔

اور پھر جہاں سے صرف ھدھد درختوں پر حملے کرتے تھے کلہاڑیوں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نئی آواز سے جنگل کے جانور اور پرندے ڈر گئے۔ یہ تھی ان پہلی کلہاڑیوں کی آواز جو پہلے درخت کاٹ رہی تھیں۔

دھاردار تیز پتھر درخت میں گہرا پیوست ہوجاتا اور اس کے زخم سے گاڑھا رس بہ نکلتا۔ درخت کراھتا اور چرچراتا، پھر لکڑھارے کے قدموں پر آن گرتا۔

لوگ روزانہ، بڑے صبر کے ساتھ درختوں کو کاٹتے اور جنگل کی دنیا میں اپنے لئے جگہ بناتے۔

کوئی قطعہ صاف کرنے کے بعد لوگ درخت کے ٹھنٹھوں اور جھاڑیوں کو جلا دیتے۔

اس طرح آدمی جنگل کے خلاف لڑتا اور فتح حاصل کرتا رہا۔ وہ ھارے ہوئے دشمن کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

شاخوں کو کاٹنے کے بعد لوگ درخت کے ایک سرے کو نوکیلا بناکر اس کو زمین میں گاڑتے، پتھر کے گھن سے اس کو زمین کے اندر مضبوط ٹھونک دیتے۔ پھر

پتھر کی کلہاڑی کا چوبی دستہ

پتھر کی کلہاڑی جس میں دستہ لگانے کےلئے سوراخ ھے

وہ اس طرح دوسرا، تیسرا اور چوتھا کھمبا ایک ھی قطار میں گاڑتے چلے جاتے ۔ جلدھی ایک دیوار بن جاتی جس کو وہ چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں کھمبوں کے درمیان بن کر اور مضبوط بنا دیتے اور تھوڑے دنوں میں ایک لکڑی کا حجرہ جو خود چھوٹا سا جنگل معلوم ہوتا جنگل کے اندر تیار ھو جاتا ۔ اس میں درختوں کے تنوں کے درمیان ٹہنیوں کو آپس میں بنکر دیوار بنائی جاتی ۔ لیکن یہ تنے کسی طرف اگتے نہیں تھے بلکہ اس طرح زمین میں قائم کھڑے رہتے جس طرح آدمی نے ان کو گاڑا تھا ۔

قدیم زمانے کے آدمی کے لئے جنگل کی دنیا میں اپنے لئے جگہ بنانا بہت کٹھن تھا اور اس سے زیادہ مشکل تھا اپنے لئے غذا حاصل کرنا ۔

کھلے میدانوں میں نکل کر وہ گلوں میں رھنے سہنےوالے جانوروں کا شکار کرتا ۔ میدانوں میں گاوں کو دور دور تک دیکھنا آسان تھا کیونکہ کسی ٹیلے سے بھی میلوں دور تک چاروں طرف سب کچھ نظر آتا تھا ۔

لیکن جنگل کی بات ھی اور تھی ۔ حالانکہ جنگل کا گھر رھنےوالوں سے بھرا ھوا تھا پھر بھی وہ دکھائی نہیں دیتے تھے ۔ تمام منزلوں میں ان کی آواز، ان کی سرسراھٹ اور چیخوں کی گونج ھوتی تھی لیکن ان کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا ۔

کوئی چیز پیر کے نیچے سرسراتی یا سرکے اوپر اڑتی، کسی چیز سے پتیاں ھلتیں ۔ قدیم زمانے کا آدمی ان سرسراھٹوں اور مہکوں میں کیسے تمیز کر سکتا تھا، وہ تمام چمکدار درختوں کے تنوں کے درمیان جانور کے چمکدار گاوں کا کیسے پتہ لگا سکتا تھا؟

جنگل کی ھر چڑیا اور جانور کا اپنا حفاظت کرنےوالا رنگ تھا ۔ چڑیا کے پر درختوں کے داغدار تنوں کی طرح ھوتے تھے ۔ جنگل کی نیم تاریکی میں جانوروں کے سمور کا سرخی مائل بادامی رنگ بھی سوکھی ھوئی پتیوں کی طرح ھوتا تھا ۔ کسی جانور

کا پتہ لگانا مشکل تھا ۔ لیکن جب جانور قریب ہوتا اس وقت شکاری کا نشانہ بڑا سچا ہونا چاہئے تھا ورنہ جانور جھاڑیوں میں غائب ہو جاتا تھا ۔

اسی وقت قدیم زمانے کے شکاری کو پھینکنےوالے برچھے کی جگہ تیز پرواز کرنےوالے تیر کو دینا پڑی ۔ وہ اپنی کمان ہاتھ میں لیتا اور ترکش کندھے سے لٹکاتا اور پھر گھنے جنگل میں گھس کر جنگلی سوروں کا شکار کرتا یا دلدل میں بطخوں اور راج ھنسوں کو مارتا ۔

آدمی کا چوپایہ دوست

ہر شکاری کا ایک وفادار دوست ہوتا جس کے چار پنجے، بڑے نرم کان اور سیاہ کھوجی تھوتھن ہوتا ۔

یہ چوپایہ دوست شکاری کو شکار ڈھونڈھنے میں مدد دیتا تھا ۔ کھانے کے وقت وہ مالک کے پاس بیٹھتا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر یہ کہتا معلوم ہوتا تھا ''اور میرا حصہ کہاں ہے؟''

یہی چوپایہ دوست ہزاروں سال سے آدمی کی خدمت بڑی وفاداری کے ساتھ کر رہا ہے کیونکہ یہ اسی دوردراز زمانے کی بات ہے جب آدمی تیر و کمان سے شکار کھیلتا تھا ۔ اس نے کتے کو اپنا دوست بنایا تھا ۔

دریائے ینیسئی کے کنارے کوہ افونتووا کی کھدائی میں، سوویت ماہرین آثار قدیمہ نے ایک قدیم شکاری پڑاؤ میں کتے کی ھڈیاں پائیں ۔ اس کے سوا کہ تھوتھن ذرا چھوٹا تھا باقی ھڈیاں بھیڑئے سے مشابہہ تھیں ۔

قدیم زمانے کے آدمی کا کتا غالباً اس کے گھر کی حفاظت کرتا تھا اور شکار میں اس کی مدد کرتا تھا ۔ ابتدائی جنگلی بستیوں میں باورچی خانوں کے کوڑا گھروں میں سائنس دانوں نے جانوروں کی ایسی ھڈیاں پائیں جن پر کتے کے دانتوں کے نشان تھے ۔ اسی لئے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی کھانے کے وقت کتا آدمی کے ساتھ بیٹھتا تھا اور ھڈیاں چاہتا تھا ۔

کوئی آدمی کتے کو رکھ کر نہ کھلاتا اگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ۔ قدیم زمانے کا آدمی کتے کے پلے کو شکار کا پتہ لگانے میں اپنے مددگار کی حیثیت سے سدھانے لگتا تھا ۔

اس نے مددگار کے انتخاب میں غلطی نہیں کی تھی ۔ قبل اس کے کہ وہ کسی جنگلی سور کے نشان دیکھتا یا ہرن کے پاؤں کی چاپ سنتا اس کا کتا چوکنا ہوکر اپنا تھوتھن اونچا کرتا اور بو سونگھنے لگتا ۔

اور جھاڑیوں سے کس چیز کی مہک آتی تھی؟ کون یہاں سے ابھی گذرا تھا؟ کتے کے لئے دو تین بار سونگھنا ھی کافی تھا۔ اس وقت کتا کچھ بھی دیکھتا سنتا نہیں تھا، وہ اپنے خاص کام میں بالکل محو ھوجاتا تھا یعنی جانور کا پتہ لگائے۔ وہ جنگل میں دبے پاؤں تیزی سے دوڑتا تھا۔ مالک کو صرف اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔

کتے کو پالتو بنانے کے بعد آدمی اور مضبوط ھو گیا۔ اس نے کتے کی ناک کو جو اس کی ناک سے کہیں زیادہ تیز تھی اپنی خدمت کے لئے استعمال کیا۔

بہرحال، آدمی نے ناک کے سوا کتے کی دوسری چیزوں مثلاً اس کے چار پیروں سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اپنی گاڑی میں گھوڑا جوتنے سے پہلے آدمی اپنا سامان اور خاندان لے جانے کے لئے کتا استعمال کرتا تھا۔

سائبیریا میں ایک قدیم شکاری پڑاؤ سے کتے کی ھڈیوں کے پاس ھی ساز بھی ملا۔ اس کا مطلب یہ ھوا کہ کتے آدمی کی صرف شکار ھی میں نہیں مدد کرتے تھے بلکہ اس کو کھینچ کر لے بھی جاتے تھے۔

اس طرح پہلی بار ھماری ملاقات آدمی کے بہترین دوست یعنی کتے سے ھوئی۔

اس سمجھدار جانور کے بارے میں نہ جانے کتنی سچی کہانیاں لکھی جا چکی ھیں جو پہاڑوں میں آدمیوں کو بچاتا ھے، میدان جنگ سے زخمیوں کو لے جاتا ھے۔ گھروں اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ھے۔ گھر، شکار، جنگ اور تحقیقاتی تجربہ‌گاھوں میں کتے ھمارے بڑے وفادار خادم ھوتے ھیں۔

جب سائنس کے مفاد اور انسانیت کی بھلائی کےلئے سائنس‌داں کسی کتے کو آپریشن کی میز پر لٹاتا ھے تو وہ سائنس‌داں کو اعتماد کی نگاھوں سے دیکھتا ھے، ایسی نگاھوں سے جیسے وہ اپنے مالک کے لئے جان دینے کو تیار ھے۔

لینن گراد کے قریب پاولووا کے قصبے میں اس لیباریٹری کی عمارت کے سامنے جہاں سائنس‌داں دماغ کے افعال کا مطالعہ کرتے ھیں ایک بڑی سی یادگار ھے۔

یہ یادگار ھمارے اسی وفادار چار پیروں والے دوست کے اعزاز میں نصب کی گئی ھے۔
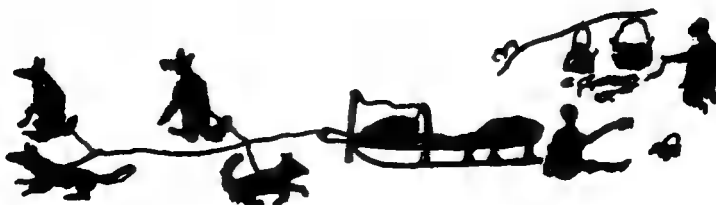
برف‌گاڑی جس کو کتے گھسیٹتے ھیں (کوریاک ڈرائنگ)

دریا سے آدمی کی لڑائی

قدیم زمانے کے سب ہی آدمی تو اپنے گھر درخت کے جھنڈوں کے درمیان نہیں بناتے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جو گھنے جنگلوں کو چھوڑ کر دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پانی اور جنگل کے درمیان تنگ پٹی پر وہ اپنے لکڑی کے حجرے بناتے تھے۔

جنگل کے مقابلے میں دریا کے کنارے زیادہ جگہ تھی لیکن یہاں بھی رہنا سہنا جنگل کی طرح دشوار تھا۔

دریا ایک بےچین پڑوسی تھا۔ جب بہار میں اس میں سیلاب آتا اور وہ اپنے کناروں سے اوپر بہہ نکلتا تو اکثر برف کی چٹانوں اور گرے پڑے درختوں کے ساتھ آدمیوں کے گھر بھی بہا لے جاتا۔ سیلاب سے بھاگ کر لوگ قریب کے درختوں پر چڑھ جاتے تھے اور غضب‌ناک دریا کے اترنے تک وہیں انتظار کرتے تھے۔ جب دریا پھر اعتدال پر آجاتا تھا تو وہ کنارے پر پھر اپنا گھر بنانا شروع کر دیتے تھے۔

پہلے پہل تو ہر سیلاب ان کے لئے اچانک آتا تھا۔ لیکن جب انھوں نے دریا کے رویے کا بغور مطالعہ کیا تو سیلاب سے بچنے لگے۔

وہ کئی درخت کاٹتے اور ان کے تنے ایک ساتھ باندھ کر بیڑا بنا لیتے اور اس کو دریا کے کنارے ڈال دیتے۔ پھر وہ لٹھوں کی پہلی تہہ پر لٹھوں کی دوسری تہہ ڈالتے۔ اس طرح تہہ بہ تہہ وہ ایک اونچا چبوترہ سا بنا لیتے اور اس پر اپنی جھونپڑی بناتے۔ اب وہ سیلاب سے نہیں ڈرتے تھے کیونکہ جب طوفانی دریا چڑھتا تو وہ ان کی چوکھٹ تک بھی نہ پہنچتا۔

یہ آدمی کی بڑی جیت تھی کیونکہ اس نے نیچے کنارے کو اونچا کر دیا تھا۔ گویا یہ چبوترہ ان تمام بندوں اور پشتوں کی ابتدا تھی جو اب ہم دریاؤں کو روکنے کے لئے بناتے ہیں۔

قدیم زمانے کے آدمی نے دریاؤں سے لڑنے میں کافی وقت صرف کیا۔

لیکن وہ دریا کے کنارے کیوں بسا اور اس نے پانی کے قریب کیوں رہنا چاہا؟

یہ ان مچھیروں سے پوچھو جو اپنی زندگی دریا کے کنارے ہی گذارتے ہیں اور اپنی بنسیوں پر بڑے صبر کے ساتھ آنکھ لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔

دریا آدمی کے لئے کشش رکھتا تھا کیونکہ اس میں مچھلیاں تھیں۔

شکاری نے مچھیرا بننا کیسے سیکھا؟ بہر حال، اس کو ماھی گیری اور جانوروں کے شکار کے لئے مختلف اوزاروں کی ضرورت تھی۔

جب واقعات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے تو ہم اس کی کھوئی کڑیاں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ھیں۔ کوئی شکاری ایک دن میں تو ماھی گیر نہیں بن گیا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ مچھلی پکڑنا سیکھنے سے پہلے وہ مچھلی کا بھی شکار ھی کرتا تھا۔ اور یہی واقعی ہوتا تھا۔ ماھی گیری کا سب سے پہلا اوزار ماھی برچھا تھا جو بہت کچھ شکار کھیلنے والے برچھے سے مشابہ تھا۔

چینی مچھیرے (ڈرائنگ)

قدیم زمانے کا آدمی کمر کمر پانی میں جا کر ان مچھلیوں کو برچھے سے شکار کرتا تھا جو چٹانوں کے درمیان چھپی ہوتی تھیں۔ پھر اس نے دوسرے طریقوں سے ماھی گیری سیکھی۔ وہ جال کے ذریعہ چڑیوں کو پکڑنا سیکھ چکا تھا اور اس نے پانی میں بھی جال کے ذریعہ کوشش کی۔ اس طرح لوگ مچھلیاں پکڑنے کے لئے بھی جال استعمال کرنے لگے۔

ماھرین آثار قدیمہ نے ماھی گیری کے نیزے اور برچھیاں، مچھلیوں کے جال کے پتھر کے لنگر اور ھڈی کے بنے ہوئے مچھلی پکڑنے کے کانٹے کھود کر نکالے ھیں۔

شکاری ماھی گیروں کا گھر

سوویت ماھر آثار قدیمہ تولستوف اور ان کے ساتھیوں نے قزل قوم کے ریگستان میں قدیم زمانے کے شکاری ماھی گیروں کا ایک پڑاؤ اس جگہ دریافت کیا جہاں آمودریا بحیرۂ ارال میں گرتا ہے۔

ایک ریتیلے ٹیلے کی چوٹی پر ، ریت اور مٹی کی تہہ میں ان کو بہت ھی اچھے پتھر کے اوزار، مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ملے ۔ ان میں جنگلی سوروں، بارہسنگھوں اور ہرنوں کی بہت سی ھڈیاں تھیں ۔ لیکن ان ڈھیروں میں زیادہ مچھلیوں کے کانٹے اور ھڈیاں تھیں ۔ وھاں کے لوگوں کی خاص غذا مچھلی ھی معلوم ہوتی تھی ۔

ایک جلے ہوئے گھر کے نشانات بھی یہاں ملے ۔ اس میں صرف راکھ اور کوئلے، سرکنڈے کے جلے ہوئے ٹکڑے اور کوئلے کے سیاہ خطوط جو ایک حلقے کے مرکز میں ملتے تھے باقی رہ گئے تھے ۔ اس گھر کے بیچ میں صاف، سفید راکھ کی ایک موٹی تہہ تھی جس کے نیچے خوب تپی ہوئی چمکیلی سرخ ریت کی تہہ تھی ۔

اس مرکزی چولھے کے چاروں طرف اور بھی چولھے تھے جن میں کالی، گندی راکھ اور باورچی‌خانے کا کوڑا بھرا تھا ۔

پڑاؤ میں بس یہی ملا ۔ اب یہ سائنس دانوں کا کام تھا کہ وہ اس گھر اور اس کے ساز و سامان کو اصل کے مطابق بحال کریں اور چند جلے ہوئے کھنڈرات کے ذریعہ اس کے رہنے‌والوں کی زندگی کے متعلق بیان کریں ۔

جو لوگ آثار قدیمہ کے علم سے ناواقف ھیں ان کے لئے یہ مسئلہ حل کرنا ممکن نہ ہوتا لیکن ماھرین آثار قدیمہ فوراً سمجھ گئے کہ کوئلہ اور راکھ ان گڈھوں میں بھر گئی ھے جہاں پہلے چھت کو روکنے‌والے لکڑی کے کھمبے تھے ۔ اور جلے ہوئے سرکنڈوں نے انہیں بتایا کہ چھت سرکنڈوں کی تھی ۔ سیاہ خطوط جو مرکز میں ملتے تھے ان کھمبوں کے زمین پر گرنے کے نشانات تھے جو گھر کو تباہ کرنے‌والی آگ کے دوران گرے تھے ۔

مرکزی چولھے پر کھانا نہیں پکایا جاتا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس کی راکھ اتنی صاف اور سفید نہ ہوتی ۔ وھاں راکھ کی تہہ بہت موٹی تھی کیونکہ مرکزی چولھے میں قدیم رسم کے مطابق دن رات ابدی آگ جلتی رہتی تھی ۔

گھر کی عورتیں دوسرے چولھوں پر کھانا پکاتی تھیں جو چھت کو روکنے‌والے کھمبوں کے درمیان تھے ۔ اسی لئے وھاں کی راکھ اتنی گندی تھی اور زمین پر ھڈیاں پھیلی ہوئی تھیں ۔

وھاں بہت سے چولھے تھے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بھی تھیں ۔ یہ تمام عورتیں، ان کے شوھر اور بچے قرابت کی بناء پر ایک برادری میں منسلک تھے ۔

برادری بڑی ہوتی تھی، کوئی سو یا اس سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل ۔ اس لئے گھر بھی بڑا تھا ۔ پھر بھی یہ گھر اپنے جد سے مشابہ تھا، نوکیلی چھت‌والے گول خیمے سے ۔

کھمبوں کی دو قطاروں کے درمیان داخلے سے لیکر مرکزی چولھے تک ایک لمبی گذرگاہ تھی۔ گذرگاہ کے دائیں طرف کھانا پکانے کے چولھے تھے اور بائیں طرف خالی جگہ۔

گھر کے اندر ان لوگوں کو خالی جگہ کی کیا ضرورت تھی؟

اِس کا حل ہمیں جزائر انڈمان میں، جو وسط ایشیا سے بہت دور واقع ہیں، پنچائتی جھونپڑیوں سے ملتا ہے۔ ان جزیروں کے لوگ یہ خالی جگہ جادو ٹونےوالی ریت رسموں کے لئے استعمال کرتے تھے۔

یہاں بھی گذرگاہ کے بائیں طرف ماہرین آثار قدیمہ نے دیوار کے پاس چھوٹے چھوٹے چولھے پائے۔ یہ غالباً وہ جگہ تھی جہاں برادری کے غیرشادی‌شدہ لوگ رہتے تھے۔

اس طرح ماہرین آثار قدیمہ نےاپنی نگاہوں کے سامنے اس گھر کا نقشہ کھینچا جس میں یہ ماھی گیر رہتے تھے۔

بہرحال، کھنڈرات سے یہ پتہ تو چلا نہیں کہ وہ مچھلیاں کیسے پکڑتے تھے اور ان کے پاس ڈونگیاں تھیں یا نہیں۔

روس میں اس طرح کی ایک ڈونگی جھیل لادوگا کے کنارے ملی ہے۔

سب جہازوں کا نگردادا

کوئی ساٹھ سال پہلے لوگ جھیل لادوگا سے قریب ہی ایک نہر کھود رہے تھے۔ دلدلی کوئلے اور ریت کے درمیان کھودتے ہوئے ان کو آدمیوں کی کھوپڑیاں اور پتھر کے اوزار ملے۔

ماہرین آثار قدیمہ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے دلدل سے ہر قسم کی چیزیں ڈھونڈ نکالیں جیسے یہ کسی میوزیم کا شوکیس تھا۔ انہوں نے پتھر کی کلہاڑی، پتھرکا چاقو، مچھلی پکڑنے کے پتھر کے کانٹے اور تیر، مچھلی کے شکار کے لئے ایک دندانےدار برچھا اور سیل مچھلی کی طرح تراشا ہوا ہڈی کا ایک تعویذ پایا۔ ان تمام پتھر اور ہڈی کی چیزوں کو برآمد کرنے کے بعد ان کو سب سے اہم چیز ملی یعنی ایک ثابت ڈونگی۔ وہ اتنی ٹھیک تھی کہ آدمی اس میں بیٹھ کر فوراً اس کو کھے سکتا تھا۔

اس کی صورت شکل بالکل ہمارے زمانے کی ڈونگیوں جیسی نہ تھی۔ یہ تو تمام کشتیوں، دخانی جہازوں، ڈیزل جہازوں کی نگردادی تھی اور کسی بڑے شاہ بلوط کے تنے کو کھوکھلا کرکے تیار کی گئی تھی۔

اگر اس کھوکھلی ڈونگی کو تم دیکھو تو تمہیں پتہ چل سکے گا کہ کس طرح پتھر کی کلہاڑی نے بلوط کے تنے کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹے تھے۔

ایسی جگہوں پر جہاں کلہاڑی سے لکڑی کے ریشے کے مطابق کاٹا گیا تھا کام آسان تھا اور سطح کافی چکنی تھی لیکن ڈونگی کے ماتھے اور دنبالے پر جہاں کلہاڑی کو ریشے کے خلاف کاٹنا تھا کام سخت جاں‌فشاں تھا۔
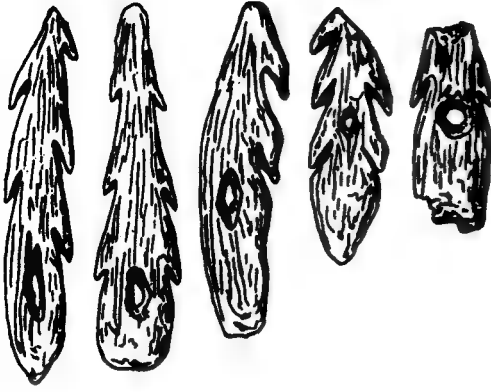
مچھلی کے شکار کے نیزے جو سینگوں سے بنائے گئے ھیں

یہاں لکڑی کو ہر طرف سے کاٹا گیا ہے۔ ہر طرف ناھموار ہے اور اس میں گڈھے دکھائی دیتے ھیں جیسے پتھر کے دانتوں نے بلوط کو کاٹا ھو۔ بعض جگہوں پر جہاں لکڑی میں گرھیں تھیں یا ٹیڑھا میڑھاپن تھا کلہاڑی کارگر نہیں ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں لکڑی کے خلاف کلہاڑی کی لڑائی میں آگ نے مدد دی تھی۔

ڈونگی کا پورا دنبالہ جلا ھوا ہے اور کوئلے کے چٹخے ہوئے پرت سے ڈھکا ہے۔

قریب ھی سائنس دانوں کو وہ پتھر کی کلہاڑی بھی مل گئی جس نے ڈونگی کو کاٹ کاٹ کر کھوکھلا کیا تھا۔ اس کی دھار کو چمکایا اور تیز کیا گیا تھا اور قریب ھی دلدلی کوئلے میں پتھر کو تیز کرنے کا اوزار بھی مل گیا۔ اس کا یہ مطلب ھوا کہ پہلے کی طرح اس وقت پتھر کے اوزار صرف کاٹ کاٹ کر نہیں بنائے جاتے تھے بلکہ ان پر پالش بھی ہونے لگی تھی اور ان کو تیز بھی کیا جاتا تھا۔

کیا کوئی کند کلہاڑی مضبوط شاہ بلوط کو کاٹ سکتی تھی؟

آدمی کو بلوط کو کھوکھلا کرکے ڈونگی بنانے میں بڑا وقت لگتا تھا۔

آخرکار جب یہ کام ختم ھوتا تھا تو کشتی پانی میں اتاری جاتی تھی۔ مچھیرے جھیل پر روانہ ھو جاتے تھے۔ ان کے پاس مچھلی کے شکار کے لئے طرح طرح کے برچھے، نیزے، کانٹے اور جال ھوتے تھے۔

جھیل لادوگا بہت بڑی تھی اور اس میں مچھلیوں کی بھی کثرت تھی لیکن لوگ کنارے سے دور تک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے کیونکہ پانی ان کے لئے نئی اور انجانی دنیا تھا۔ ان کو کیا پتہ تھا کہ وہ کیسا ہے اور آئندہ کیا کریگا؟ ایک دن وہ پرسکون رھتا اور اس کی سطح ھموار رھتی۔ دوسرے دن اس میں بڑی بڑی غضب‌ناک لہریں اٹھنے لگتیں۔

قدیم زمانے کی اندر سے کھوکھلی کشتی جو تمام کشتیوں کی نگردادی ہے۔

زبردست شاہ‌بلوط جس کو کوئی طوفان اور آندھی نہیں گرا سکتی تھی ان لہروں پر ایک لکڑی کے ٹکڑے کی طرح ڈگمگاتا۔ لوگ ڈر کر کنارے کی طرف کشتی لاتے۔ وہاں ٹھوس خشک زمین تھی اور ان کے پیر اس پر چلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ زمین تو جھولتی نہ تھی، نہ ان کے خیرمقدم کے لئے اوپر اٹھتی تھی اور نہ ان کو ادھر ادھر جھولا کر پھینکتی تھی۔

اس طرح قدیم زمانے کا آدمی بچے کی طرح دھرتی ماتا کے کلیجے سے چمٹا رہتا جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ خطرناک پانی میں جو آسمان تک پھیلتا چلا گیا تھا مچھلی کے شکار کے لئے جانے کے بجائے اس کا انتظار کرتے تھے کہ مچھلی خود کنارے تک آئے۔

رفتہ رفتہ اور بڑی احتیاط سے آدمیوں نے اعتماد حاصل کرنا شروع کیا اور کچھ زیادہ آگے جانے کی ہمت کرنے لگے۔

ایک زمانہ تھا جب آدمی کی دنیا وہاں ختم ہو جاتی جہاں پانی شروع ہوتا تھا۔ ہر دریا کا کنارا ایک نظر نہ آنےوالی دیوار تھا جس پر لکھا ہوتا تھا ''آگے بڑھنے کی اجازت نہیں''۔

آدمی نے اس نظر نہ آنےوالی دیوار کو توڑدیا۔ لیکن ابھی وہ اپنی نئی دنیا، پانی کی دنیا کی سرحدوں سے قریب رہتا تھا۔ کسی بھی کام میں پہلے قدم سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ وہ وقت آنےوالا تھا جب وہ کنارے سے بالکل الگ ہونےوالا تھا۔ اس کو چھوٹی ڈونگیوں میں نہیں جانا تھا بلکہ ایسے جہازوں میں جو اس کو افق کے پار نئے ساحلوں تک، نئے علاقوں تک لے جاتے تھے جہاں اس کے ایسے ہی آدمی رہتے تھے۔
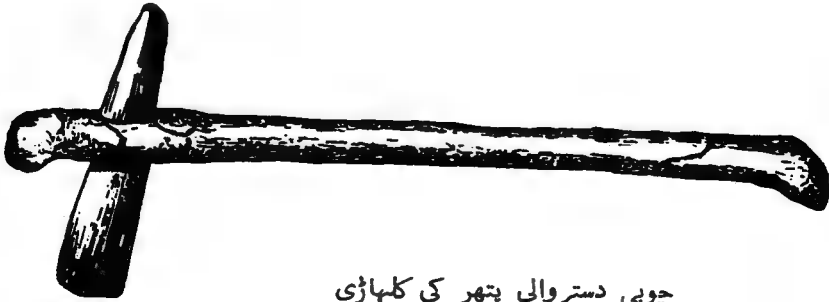
چوبی دستےوالی پتھر کی کلہاڑی

پہلے کاریگر

اے نوجوان کاریگرو، میں تم سے بات کر رہا ہوں جنھوں نے حال ہی میں کلہاڑی، رندے، ہتھوڑی اور برمے کا استعمال سیکھا ہے۔

میں تم سے بات کر رہا ہوں جو مستقبل میں فولادساز، کیمیادان، مشینوں اور ہوائی جہازوں کے ڈیزائن بنانےوالے، مکانات اور جہاز تیار کرنےوالے ہوگے!

یہ کتاب تم لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے جن کو اپنے اوزاروں اور کام سے پیار ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمھارے اوزاروں اور اس لکڑی یا دھات کے درمیان جس پر تم کام کر رہے ہو لڑائی کتنی سخت ہے اور تمھیں کتنی خوشی ہوتی ہے جب تم کوئی کام پورا کر لیتے ہو۔

جب تم کوئی لکڑی کا ٹکڑا لیتے ہو تو تمھارے ذہن میں اس چیز کی شکل ہوتی ہے جو تمھیں اس ٹکڑے سے بنانا ہے۔ یہ بات بالکل آسان معلوم ہوتی ہے۔ تمھیں یہاں ایک ٹکڑا آری سے کاٹنا ہوگا، برمے سے ایک سوراخ وہاں برمانا ہوگا اور دوسرا ٹکڑا ادھر کاٹنا ہوگا۔ لیکن لکڑی اس پر تیار نہیں ہوتی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے اس تیز دھار کی مزاحمت کرتی ہے جو اس کو کاٹنا چاہتی ہے۔

اوزار یکے بعد دیگرے اس لڑائی میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ اگر چاقو سے کام نہیں چلتا تو کلہاڑی میدان میں آتی ہے۔ اگر کلہاڑی بھی ناکام رہتی ہے تو درجنوں دانتوںوالا آرا میدان جنگ میں اترتا ہے۔

اور پھر وہ وقت آتا ہے جب وہ تمام لکڑی جو تمھاری مجوزہ چیز کی شکل و صورت کو چھپائے ہوئے تھی کٹ کر چھیلن، چھپٹیوں اور برادے کی شکل میں نظر آنے لگتی ہے۔

تمھاری جیت ہوئی لیکن یہ صرف تمھاری ہی جیت نہیں ہے۔ تمھاری جیت اس لئے ممکن ہوئی کہ تمام کاریگروں نے بہت سی صدیوں کے دوران ان اوزاروں کو ایجاد کیا اور بہتر بنایا جو تم استعمال کرتے ہو، جنھوںنے ان اوزاروں کو بنانے کے لئے نئی چیزوں کی تلاش کی اور ان کے استعمال کے نئے طریقے نکالے۔

یہاں، اس کتاب کے صفحات سے تم ان پہلے کاریگروں کے بارے میں معلومات حاصل کر چکے ہو جنھوں نے پہلے چاقو، کلہاڑیاں اور ہتھوڑے بنائے تھے۔

تمنے ان کو کام کرتے بھی دیکھا۔ تمھارے کام کی طرح ان کا کام بھی کٹھن تھا لیکن آخر میں ان کو اس سے خوشی بھی ہوتی تھی۔

یہ پہلے بڑھئی، زمین کھودنے والے اور معمار جانوروں کی کھال کے کپڑے پہنتے تھے۔ ان کے اوزار بھدے اور بوَاری تھے۔ ان کو ایک کشتی بنانے میں مہینوں

لگتے تھے۔ ان کو کھانا پکانے والی ایک مٹی کی ھانڈی بنانے میں اس سے زیادہ مشکل پیش آتی تھی جتنی ھمیں ایک مجسمہ بنانے میں ھوتی ھے۔

لیکن یہ بڑھئی، زمین کھودنے والے اور کمھار ان معماروں، کیمیادانوں اور فولادسازوں کی زبردست فوج کے پہلے سپاھی تھے جو اپنی روزانہ کی محنت سے اب دنیا کے خط وخال بدل رھے ھیں۔

مثال کے لئے قدیم زمانے کے کمھاروں کو لے لو۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا نیا مادہ تیار کیا جو قدرت سے انھیں نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے، جب قدیم زمانے کا کاریگر کوئی پتھر کی کلہاڑی یا ھڈی کا نیزہ تیار کرتا تھا تو وہ اس کے مادے کی تخلیق خود نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی صورت بدل دیتا تھا۔ لیکن کمھار کی بات ایسی تھی جو کبھی پہلے نہیں ھوئی تھی۔ آدمی نے مٹی کا برتن بنایا اور اس کو الاؤ میں پکایا۔ آگ نے مٹی کی تمام خاصیتیں بدل دیں۔ اب یہ پہچانی نہیں جا سکتی تھی۔

اس سے قبل مٹی بھیگنے پر پھس پھسی ھو جاتی تھی لیکن آگ میں پکنے کے بعد اس کو پانی سے ڈر نہیں رھا۔ پانی ڈالنے سے نہ تو اس کی شکل بدلتی تھی اور نہ وہ نرم ھوتی تھی۔

قدیم زمانے کے آدمی نے مٹی کو ایک نئی چیز میں تبدیل کرنے کے لئے آگ کا استعمال کیا۔ یہ دوھری جیت تھی — آگ اور مٹی دونوں پر۔ یہ سچ ھے کہ آگ آدمی کی پہلے سے خدمت کر رھی تھی۔ اس کو سردی سے بچاتی تھی، جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھتی تھی، جنگلات کی صفائی میں آدمی کی مدد کرتی تھی اور ڈونگی بنانے میں کلہاڑی کی مدد کرتی تھی۔ اب لوگ آگ بنانے کا راز جان گئے تھے۔ جب بھی یہ دو لکڑی کے ٹکڑوں کو زوروں سے آپس میں رگڑتے تھے آگ نمودار ھوتی تھی۔
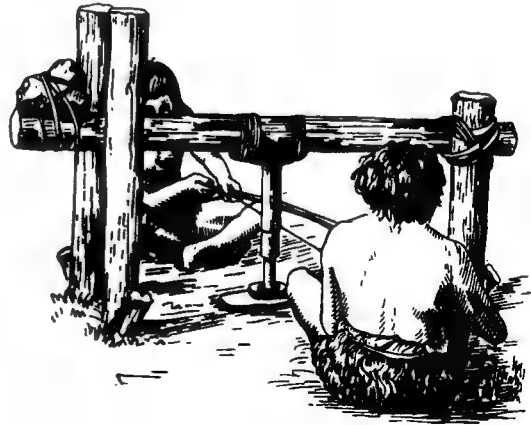
پتھروں میں سوراخ بنانے کے لئے
قدیم زمانے کی مشین

اب آدمی نے آگ کو ایک نیا اور زیادہ مشکل فریضہ سونپا یعنی ایک مادے کو دوسرے میں تبدیل کرنے کا فریضہ۔

جب آدمی کو آگ کی حیرت‌انگیز خوبیوں کا پتہ چلا تو اس نے آگ کو مٹی پکانے، اپنا کھانا تیار کرنے، روٹی پکانے اور تانبے کو پگھلانے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔

آج تم کو دنیا میں کوئی ایسا کارخانہ نہ ملےگا جو ایک مادے کو دوسرے میں تبدیل کرنے کے لئے آگ کا استعمال نہ کرتا ہو۔

آگ ہمیں خام دھات سے لوھا نکالنے، ریت سے شیشہ بنانے اور لکڑی سے کاغذ تیار کرنے میں مدد دیتی ھے۔ فولاد کے کارخانوں میں جو آگ جلتی رھتی ھے اس کو فولادسازوں اور کیمیادانوں کی پوری فوج کی فوج کنٹرول کرتی ھے۔ اور ان سب بھٹیوں کی ابتدا اس چولھے سے ھوئی ھے جس میں قدیم زمانے کے کمھار نے اپنا پھلا، بھدا، تنگ پیندے والا برتن پکایا تھا۔

بیج گواہ ھے

قدیم زمانے کے ایک پڑاؤ سے ماھرین آثار قدیمہ کو بھت سی چیزوں کے درمیان کچھ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے بھی ملے۔

باھر سے یہ ٹکڑے آپس میں گتھے ھوئے خطوط کے سادہ ڈیزائن سے سجے ھوئے تھے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ھے کہ یہ ڈیزائن اس بات کا راز بتاتا ھے کہ قدیم زمانے کے کمھار کس طرح اپنے برتنوں کی شکلیں بناتے تھے اور ان کو پکاتے تھے۔ نرم پودوں کے تنوں سے بنی ھوئی ٹوکری پر اندر سے مٹی کی ایک تہہ چڑھا دی جاتی تھی اور پھر ٹوکری کو آگ میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ٹوکری جل جاتی تھی اور اندر کا برتن باقی رہ جاتا تھا اور ٹوکری کی بناوٹ جو نشان برتن کے باھری حصے پر چھوڑتی تھی وھی اس کے ڈیزائن ھوتے تھے۔

پھر جب کمھاروں نے بنی ھوئی ٹوکریوں کی مدد کے بغیر برتن بنانا سیکھ لئے تو انھوں نے برتنوں کو خانےدار ڈیزائنوں سے سجانا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے برتن ویسے نہ ھوئے جیسے ان کی دادیاں اور پردادیاں استعمال کرتی تھیں تو ان میں کھانا نھیں پک سکےگا۔

قدیم زمانے میں کاریگروں کا خیال تھا کہ ھر شے میں کوئی نہ کوئی پراسرار طاقت اور خوبی چھپی ھوئی ھے۔ کون جانے، ممکن ھے کہ برتن کی اصل مضبوطی
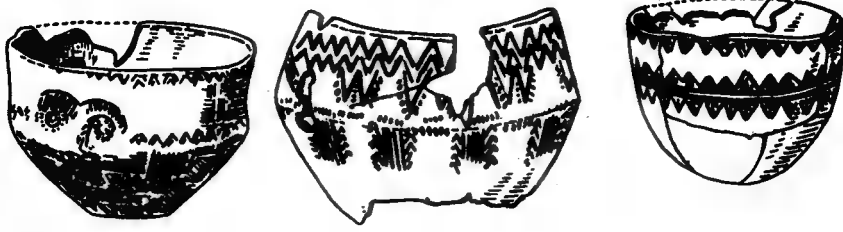
کوزوں اور پیالوں پر ڈیزائن نظر آنے لگے

اس کے ڈیزائن میں ہو! اگر انھوں نے ڈیزائن بدلا تو ممکن ھے کہ ان کو ھمیشہ کے لئے پچھتانا پڑے کیونکہ برتن ان کی بدقسمتی، برے دنوں اور بھوک کا باعث بن سکتا ھے۔ کبھی کبھی برتن کو نظربد سے بچانے کے لئے کمھار اس پر کتے کی صورت بنا دیتا تھا۔

کتا تو آدمی کا مددگار تھا۔ وہ آدمی کے ساتھ شکار میں جاتا تھا اور اس کے گھر کی نگرانی کرتا تھا۔

برتن پر کتے کی شکل بناتے ھوئے کمھار اپنے آپ سے کہتا تھا ''کتا تو نگران ھے، وہ برتن اور اس کے اندر جو کچھ رکھا ھے اس کی نگرانی کریگا۔''

خانےدار ڈیزائنوں سے سجے ھوئے برتنوں کے ٹکڑے بہت سی جگہوں پر پائے گئے ھیں۔ ان میں سے ایک جو فرانس میں شہر کامپینی کے قریب پایا گیا ھے بہت مشہور ھے۔ ماھرین آثار قدیمہ نے اس کا جائزہ لیتے وقت اس پر جو کے ایک دانے کا نشان پایا۔

اس دریافت سے ان میں بڑا جوش پیدا ھوگیا کیونکہ یہ صرف ایک دانے کا سوال نہیں تھا بلکہ یہ تھا ان بڑی بڑی تبدیلیوں کا ننھا گواہ جو قدیم زمانے کے آدمی کی زندگی میں ھوئی تھیں۔

جہاں دانہ تھا وھاں زراعت بھی رھی ھوگی۔ اسی وجہ سے ان کو اسی جگہ اناج پیسنےوالی چکیاں اور پتھر کی کدالیں بھی ملیں۔

ظاھر ھے کہ شکاری اور مچھیرے کاشتکار بھی ھو گئے تھے۔ یہ کیسے ھوا؟

پہلی بات تو یہ کہ قبیلے کے تمام افراد تو شکاری یا مچھیرے نہیں ھوتے

کمھار ھمیشہ ایک ھی طرح کے ڈیزائن اپنے برتنوں پر بناتا تھا

تھے۔ جب مرد شکار کے لئے چلے جاتے تھے تو عورتیں بچوں کے ساتھ ٹوکریاں اور مٹی کے برتن لے کر کھانے کی چیزیں جمع کرنے کے لئے ادھر ادھر جاتی تھیں۔ سمندر کے کنارے وہ سیپیں جمع کرتی تھیں۔ جنگل میں وہ سانپ چھتریاں، بیریاں اور اخروٹ تلاش کرتی تھیں۔ ان کو بلوط کے پھل کھانے سے بھی پرہیز نہ تھا۔ وہ ان کو پیس کر ان کی روٹیاں پکاتی تھیں۔ اسی لئے بہت سی زبانوں میں acorn (بلوط کا پھل) کا لفظ مدتوں تک روٹی کے لفظ کے بجائے استعمال ہوتا رہا۔

جب کوئی قبیلہ کسی شہد کے چھتے کو دیکھ لیتا تو بڑی خوشیاں منائی جاتیں۔ ایک چٹان پر ڈرائنگ پائی گئی ہے جس میں کوئی عورت شہد نکالتی دکھائی گئی ہے۔ وہ درخت پر ہے۔ اس کا ایک ہاتھ درخت کے کھوکھلے میں ہے اور دوسرے میں ایک برتن ہے۔ غصے سے بھری ہوئی شہد کی مکھیاں اس کے چاروں طرف بھن بھنا رہی ہیں لیکن وہ ان کی پروا کئے بغیر چھتے میں سے شہد نکال رہی ہے۔

عام طور پر عورتیں اور بچے جب اپنے دورے سے لوٹتے تھے تو وہ بیریوں، شہد، جنگلی سیبوں اور ناسپاتیوں سے لدے ہوتے تھے۔

اب دعوت اڑانے کا وقت ہوتا تھا لیکن عورتیں اپنے کھانے کے ذخیرے کو جلد نہیں ختم کر دیتی تھیں۔ وہ بچوں کو بھگا دیتی تھیں اور جو کچھ ان سے ممکن ہوتا تھا سب برتنوں، پیالوں اور لکڑی کے پیپوں میں جمع کر لیتی تھیں۔ غذا کے یہ ذخیرے ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتے تھے کیونکہ شکار کوئی یقینی بات نہ تھی۔

اس طرح زیادہ گرم آب وہوا میں لوگ پھر غذا جمع کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پیچھے کی طرف چلے گئے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ آگے کی طرف چھلانگ تھی کیونکہ انھوں نے بوائی شروع کر دی۔ انھوں نے اس لائن کو پار کر لیا جو جمع کرنےوالے کو کاشت کرنےوالے سے الگ کرتی تھی۔

عورتیں اب پھل، بیریاں اور ایسی جنگلی دانےدار گھاسوں کے دانے لانے لگیں جیسے جو اور گیہوں۔ وہ اناج برتنوں اور ٹوکریوں میں جمع کرنے لگیں لیکن اناج تو آسانی سے بکھر جاتا تھا اس لئے گرے ہوئے دانے اگنے لگے۔

پہلے پہل تو آدمی نے اناج اتفاق سے بویا یعنی اس کے ذخیرے سے کچھ دانے گر گئے۔ پھر اس نے جان بوجھکر اناج کو بکھیرنا یا بونا شروع کیا۔

اب بھی بہت سے لوگوں میں دفن اور پھر سے جنم لینےوالے اناج کے بارے میں داستانیں چلی آتی ہیں۔

جب قدیم زمانے میں عورتیں اپنی کدالوں سے زمین کو توڑ کر اس میں اناج دفن کرتی تھیں تو ان کو یہ یقین ہوتا تھا کہ وہ کسی پراسرار دیوتا کو دفن

پتھر کے کونڈے میں اس طرح اناج کو پیسا جاتا تھا

قدیم زمانے کی عورتیں اس طرح کے پتھر کے کونڈے میں اناج پیستی تھیں

کر رہی ہیں جو اناج کی سنہری بالیوں کی شکل میں ان کے یہاں واپس آئیگا۔ خزاں میں جب وہ فصل کاٹتیں تو وہ زمین کے نیچے کی دنیا سے دیوتا کی واپسی پر خوشیاں مناتیں۔

جب وہ آخری گٹھا باندھ کر زمین پر رکھتیں تو اس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر ناچتیں گاتیں۔ یہ محض ناچ نہ تھا۔ یہ جادو کا شگون بھی تھا۔ عورتیں اناج کی تعریف میں گیت گاتی تھیں کہ وہ مردوں کی دنیا سے واپس آیا اور وہ زمین سے یہ التجا کرتیں کہ وہ اسی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کرے۔

نئے میں پرانا

ہماری صدی کی موڑ پر، اکتوبر کے عظیم سوشلسٹ انقلاب سے پہلے، روس میں ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں عورتیں ہر خزاں میں فصل کی کٹائی پر ''کٹائی،، کا تہوار مناتی تھیں۔

وہ آخری گٹھے کو لیکر اس کو رومال اور اسکرٹ پہناتی تھیں۔ پھر ایک دوسرے کے ھاتھ پکڑ کر اس کے گرد گھوم گھوم کر گاتی تھیں:

آج ھے کٹائی
ھمارے کھیت میں
شکر ھے پروردگار کا
ایک کھیت ھے کٹ گیا
دوسرے کی ھوئی جوتائی
شکر ھے پروردگار کا

اس عبادتی گیت کی پراسرار اور یکساں دھن مشکل سے ان خوشکن گیتوں سے مشابه ھوتی تھی جو گاؤں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں شام کو تفریح کے وقت گاتے تھے۔

''کٹائی،، کا تھوار قدیم مذھبی تھوار تھا جو پہلے کاشتکاروں سے اب تک چلا آیا تھا۔ بہت سے ایسے ھی مذھبی تھوار ھم کو کھیلوں اور گیتوں کی صورت میں ملے ھیں۔

بچے ایک دوسرے کے ھاتھ پکڑ کر گاتے ھیں:

ھاں، ھم نے بویا باجرا، باجرا
ھاں ھم نے بویا باجرا، باجرا

کھیل کا یه گیت بھی قدیم زمانے میں مذھبی رسوم کے مطابق ھوتا تھا۔ بس ھزاروں برسوں کے دوران اس کا ساحرانه اثر بالکل ختم ھو گیا۔ تفریح اور مذاق باقی رہ گیا۔

اور صنوبر کے درخت کو لیجئے۔ کسی زمانے میں اس کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس کے چاروں طرف یه سوچکر ناچتے تھے که ان کے جادو بھرے حرکات سوتے ھوئے جنگلوں اور میدانوں کو پھر سے نیا جیون دینگے اور جاڑے کے بعد بھار آئے گی۔

ان بچوں سے جو نئے سال کے موقع پر صنوبر کے درخت کو سجاتے ھیں اگر یه کہا جائے که صنوبر کا درخت مقدس ھے تو وہ اس کو مذاق سمجھینگے۔ ان کے لئے تو یه نشان ھے جاڑے کے دوران خوش گوار چھٹیوں کا جو مھینوں کی پڑھائی کے بعد آتی ھیں۔

بہت سے قدیم مذھبی رسوم اور جادومنتر اب صرف بچوں کے کھیل اور گیت بنکر رہ گئے ھیں۔

بارش، بارش، جاؤ، جاؤ !
پھر اور کسی دن آؤ !

جب بچے یہ گیت گاتے ھیں تو اس کا مقصد بارش کو روکنا یا بادلوں کو بھگانا نہیں ھوتا وہ اچھی طرح جانتے ھیں کہ ان کا یہ گیت بارش پر کوئی اثر نہ ڈالے گا۔ وہ محض دلچسپی کے لئے یہ گیت گاتے ھیں۔

اور بڑے لوگ بھی ایسے گیت گانا اور کھیل کھیلنا برا نہیں سمجھتے جو کسی زمانے میں دوسرا مطلب رکھتے تھے۔

اس طرح خوشگوار کھیلوں کے ذریعہ قدیم عقیدے اور جادو منتروالے مذھبی تہوار ھم تک پہنچے۔

بہرحال، ان کو کھیلوں کے علاوہ کسی اور جگہ بھی محفوظ رکھا گیا ھے۔

جب گرجا گھروں میں ایسٹر کی عبادت ھوتی ھے تو دعاؤں میں قدیم ساحرانہ گیتوں کا رنگ جھلکتا ھے۔

قدیم زمانے کے کاشتکاروں کے گیت کی طرح ان دعاؤں میں بھی موت اور قیامت کا ذکر ھوتا ھے۔

ایسی باتیں جو عام طور پر دنیا میں کھیلوں اور ناچوں کی شکل اختیار کر چکی ھیں گرجا گھر میں مقدس مذھبی رسوم کی حیثیت سے باقی ھیں۔

بہت سے توھمات اور تعصبات ھمارے یہاں بڑے قدیم زمانے سے آئے ھیں۔

اب بھی ایسے کافی لوگ ھیں جن کو یہ یقین ھے کہ گھوڑے کی نعل کا پانا نیک شگون ھے اور اگر نیا چاند ان کو بائیں طرف دکھائی دے تو بدشگونی ھے۔

اوگلچ ضلع کی ایک پنچائتی کسان عورت نے ھمیں بتایا کہ انقلاب سے پہلے کے زمانے میں اس کے گاؤں کی عورتیں اپنے مرغیوں کے ڈربوں پر ایک ''مرغیوں کا دیوتا،، لٹکا دیتی تھیں۔ یہ ''دیوتا،، پتھر کا ھوتا تھا جس کے بیچ میں سوراخ ھوتا تھا۔ اس کو ڈربے پر لٹکانے کا مقصد یہ تھا کہ مرغیاں زیادہ انڈے دیں۔

اس طرح واھمے صدیوں تک زندہ رھتے ھیں۔ یہ پتھر کا ''مرغیوں کا دیوتا،، پتھر کے زمانے کی نشانی ھے۔ پھر بھی یہ بیسویں صدی کی ابتدا تک زندہ تھا۔

انوکھا ذخیرہ

جب عورتیں اپنی کدالوں سے زمین کھودنے گوڑنے کا کام کرتی تھیں تو مرد بھی بےکار نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ شکار میں وقت گذارتے تھے اور شام کو دیر میں اپنی حاصلات سے لدے پھندے لوٹتے تھے۔

جب بچے اپنے بڑے بھائیوں اور باپوں کو واپس آتے دیکھتے تو وہ ان سے ملنے کے لئے اور یہ جاننے کے لئے دوڑ پڑتے کہ شکار کامیاب رہا یا نہیں۔ وہ خونیں جنگلی سور کے سر کو جس کے ٹیڑھے دانت منہ سے باہر نکلے ہوتے یا بارہسنگھے کی شاخدار سینگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے۔ لیکن سب سے زیادہ وہ تب خوش ہوتے تھے جب شکاری زندہ جانور لاتے تھے خصوصاً چھوٹے موٹے میمنے یا کوئی سیدھا سادہ بے سینگ والا بچھڑا۔

شکاری اپنے شکار کو فوراً نہیں مار ڈالتے تھے۔ ان کو باڑ کے اندر رکھ کر کھلایا پلایا جاتا تھا تاکہ وہ بڑے ہوجائیں۔ جب گھر کے قریب میمنوں اور بچھڑوں کے ممیانے کی آواز آتی تو شکاریوں کو بڑا سکون ہوتا۔ ان کو یقین ہوتا کہ وہ بھوکے نہیں رہینگے چاہے وہ شکار سے خالی ہاتھ ہی کیوں نہ لوٹیں۔ اس طرح وہ باڑ میں ذخیرہ کرتے اور یہ ذخیرہ خود سے بڑھتا اور اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا۔

پہلے پہل تو لوگ مویشیوں کو گوشت اور کھال کے لئے رکھتے تھے۔ وہ اس زبردست فائدے سے واقف نہ تھے جو مویشی پالن سے ہو سکتا تھا۔ وہ ان کھروں والے جانوروں کو محض اپنا شکار سمجھتے تھے اور وہ اپنے شکار کو مارنے کے عادی تھے۔ ان کے لئے یہ سمجھنا آسان نہ تھا کہ کسی گائے یا بھیڑ کو مارنے سے زیادہ اس کا پالنا مفید تھا۔

گائے کو مارا تو ایک ہی بار جا سکتا ہے لیکن اس کا دودھ برسوں تک پیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ گائے کو نہ ماریں تو آخر میں ان کو زیادہ گوشت بھی ملے گا کیونکہ گائے ہر سال بچہ دیتی ہے۔

یہی صورت بھیڑ کی بھی تھی۔ مردہ بھیڑ کی کھال نکالنا کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ لیکن بھیڑ کی کھال تو اتنی مفید نہ تھی۔ بھیڑ کی کھال رہنے دینا اور اس کا اون کتر لینا زیادہ مفید تھا کیونکہ ہر مرتبہ کترنے کے بعد کھال پر نیا اون نکل آتا تھا۔ اس طرح لوگ ایک بھیڑ سے دس کوٹ حاصل کر سکتے تھے۔ یہ اچھا تھا کہ وہ اپنے چوپایہ قیدیوں کی جان بخشی کر دیں اور ان سے خراج وصول کر لیا کریں۔

جب آدمی گائے، بھیڑ اور گھوڑے کو پالنے لگا تو اس نے ان کو اپنی مرضی کے مطابق پرورش کرنا شروع کیا۔ وہ اس بات کی دیکھ بھال کرتا کہ ان کو اچھی طرح چارہ پانی ملے اور وہ سردی سے بچے رہیں۔ لیکن گائے کے لئے زیادہ دودھ دینے کی ضرورت تھی کیونکہ اس کو اب صرف اپنے بچھڑے کو نہیں بلکہ مالکوں کے لئے بھی دودھ دینا تھا۔ رفتہ رفتہ گھوڑے نے بھی بھاری بوجھ لے جانا سیکھ لیا۔ اب بھیڑ سے بھی اتنا کافی اون ملنے لگا جو خود اس کے لئے اور اس کے مالکوں کے لئے کافی ہو۔

صرف سب سے زیادہ دودھ دینےوالی گائیں، سب سے زیادہ مضبوط گھوڑے اور سب سے لمبے اون‌والی بھیڑیں گلے میں رکھی جاتیں ۔ اس طرح پالو جانوروں کی نئی نسلیں وجود میں آئیں ۔

لوگ یہاں تک یکدم نہیں پہنچ گئے ۔ شکاری کو مویشی پالنے والا بننے میں صدیوں لگے ۔

اور پھر آخرکار کیا ہوا؟

آدمی نے ایک انوکھا ذخیرہ دریافت کیا ۔ جمع کیا ہوا اناج وہ زمین میں چھپا دیتا اور زمین ان کو ہر ہر دانے کے لئے بہت سے دانے واپس کر دیتی ۔

اب آدمی ان سب جانوروں کو نہیں مارتا تھا جو وہ پکڑتا تھا ۔ جو جانور باقی رہ جاتے تھے وہ بڑھتے تھے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا ۔

اب آدمی زیادہ آزاد ہو گیا ۔ قدرت کا وہ اتنا محتاج نہ رہا ۔ پہلے اس کو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آیا وہ کسی جانور کا پتہ لگاکر اس کو مار بھی سکےگا یا نہیں، آیا اس کو اپنی ٹوکریاں بھرنے کے لئے کافی اناج مل سکیگا یا نہیں ۔ قدرت کی پراسرار طاقتیں اس کو کھانا دینگی بھی یا نہیں ۔ اب آدمی نے قدرت کی مدد کرنا سیکھ لیا یعنی اس نے خود اناج اگانا، اپنی گائیں اور بھیڑیں پالنا سیکھ لیا ۔ اب عورتوں کو دانےوالی گھاسوں کی تلاش میں جانا نہیں پڑتا تھا ۔ شکاریوں کو جنگلوں کی کئی کئی دن تک خاک چھان کر جنگلی جانوروں کی تلاش نہیں کرنی پڑتی تھی ۔

اب اناج کی بالیاں گھر کے قریب جھومتی تھیں اور گائیں اور بھیڑیں بھی پڑوس میں چرتی رہتی تھیں ۔
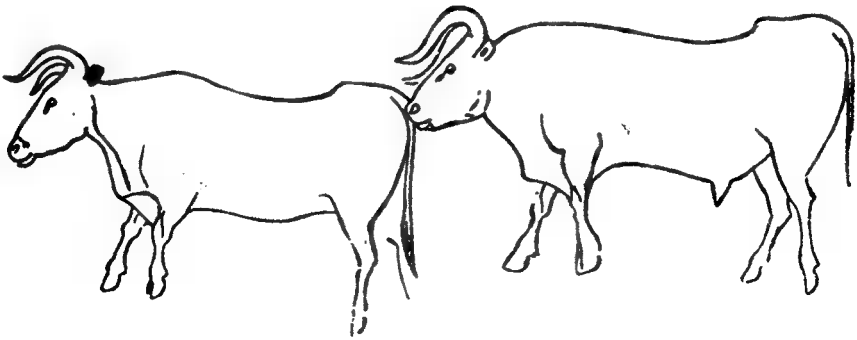
چار پیروں‌والے قیدی (غار کی دیوار پر ایک نقش)
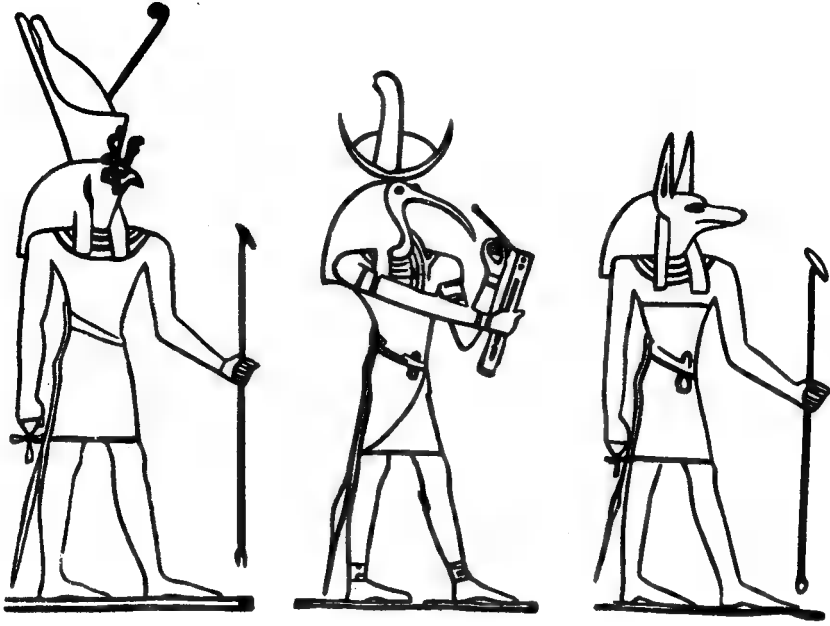
قدیم رسم کے مطابق مصری لوگ اپنے دیوتاؤں کی تصویریں ایسے آدمیوں
جیسی بناتے تھے جن کے سر جانوروں اور چڑیوں کے ہوتے تھے

آدمی نے ایک انوکھا ذخیرہ دریافت کر لیا تھا۔ لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ سب یکدم نہیں ہوا تھا۔ اس کے لئے اس کو محنت کرنی پڑی تھی۔

اس کو اپنے کھیتوں اور چراگاہوں کے لئے زمین کی ضرورت تھی۔ اس زمین کو جنگل سے حاصل کرنا تھا اور اناج بونے سے پہلے اس کو توڑنا تھا۔ کتنی سخت محنت تھی یہ!

آدمی کو قدرت سے اس طرح آزادی اور نجات نہیں ملی کہ وہ محض ٹہل کر باہر نکل آیا۔ اس کو بزور اپنا راستہ بنانا پڑا، ہزاروں رکاوٹوں کو دور کرنا پڑا۔ اس کی نئی محنت اپنی خوشیوں اور فکروں سے بھرپور تھی۔ سورج فصل کو جھلسا دیتا تھا، وہ چراگاہوں میں گھاس کو سکھا سکتا تھا۔ زیادہ بارش اناج کو سڑا دیتی تھی۔

قدیم زمانے کا شکاری ارنے بھینسے یا ریچھ سے اپنا گوشت دینے کی التجا کرتا

تھا اور قدیم زمانے کا کسان زمین، آسمان، سورج اور بارش سے اچھی فصل دینے کی التجا کرتا تھا۔

لوگ نئے نئے دیوتا بناتے تھے۔ یہ دیوتا بھی بہت کچھ پرانے دیوتاؤں کی طرح تھے۔ یہ بھی پرانی روایتوں کے مطابق جانوروں کی شکل میں یا جانوروں کے سر رکھنے والے آدمیوں کی شکل میں بنائے جاتے تھے۔ لیکن ان جانوروں کے نئے نام اور نئے مقاصد ہوتے تھے۔

ایک کا نام آسمان تھا تو دوسرے کا نام سورج اور تیسرے کو زمین کہتے تھے۔ یہ دیوتا روشنی، تاریکی، بارش اور خشک سالی کے ذمے دار تھے۔

دیوزاد آدمی زیادہ بڑا ہو گیا تھا لیکن اس کو ابھی اپنی طاقت کا شعور نہیں تھا۔ اس کو اب بھی یہ یقین تھا کہ اس کی روٹی آسمان کا تحفہ ہے، اس کی اپنی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔

نواں باب

وقت کے قدم آگے بڑھتے رہے

آؤ اب ہم وقت کے ساتھ کئی ہزار سال آگے بڑھ چلیں۔ اس وقت موجودہ دور میں اور اس زمانے میں صرف ۵۰ صدیوں کا فرق رہ جائیگا۔

۵۰ صدیاں! یہ تو بڑی لمبی مدت ہے جب ہم کسی آدمی کی زندگی کا ذکر کرتے ہیں، حتی کہ کسی قوم کی زندگی میں بھی۔ لیکن یہاں ہم کسی ایک آدمی کا ذکر تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہم تو پوری بنی نوع انسان کی بات کر رہے ہیں۔

بنی نوع انسان کی عمر تقریباً دس لاکھ سال ہے۔ اسی لئے ۵۰ صدیاں کوئی بڑی مدت نہیں ہوئیں۔

اس طرح وقت کے قدم آگے بڑھے۔ زمین نے سورج کے گرد کئی ہزار چکر اور کر لئے۔ اس دور میں دنیا میں کیا ہوا؟ دنیا پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوٹی پر وہ ذرا گنجی ہو گئی۔

ایک زمانہ تھا جب اس کی برف کی سفید ٹوپی کے گرد گھنے ہرے بھرے جنگل تھے۔ اب جنگل چھدرے ہو گئے تھے اور بڑے بڑے استیپی میدانوں کے علاقے ان میں گھس آئے تھے۔ دریاؤں اور جھیلوں کے قریب جنگل پیچھے ہٹ گئے تھے اور ان کی جگہ سرکنڈوں اور جھاڑیوں نے لے لی تھی۔

لیکن دریا کی موڑ کے قریب پہاڑی پر کیا چیز ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ڈھلان پر کوئی سنہرا رومال پھیلا ہوا ہے۔

یہ زمین کا وہ قطعہ ہے جس کو آدمی کے ہاتھوں نے بدل ڈالا ہے۔ سنہری بالیوں کے درمیان عورتوں کی جھکی ہوئی کمریں دکھائی دے رہی ہیں۔ ان کی درانتیاں تیزی سے چل رہی ہیں، وہ فصل کاٹ رہی ہیں۔

ہزاروں سال پہلے ہم نے ہتھوڑے کو پہلی بار کام کرتے دیکھا تھا۔ لیکن اب پہلی بار ہم درانتی دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان درانتیوں کی طرح بالکل نہیں ہے جو ہم آج دیکھتے ہیں کیونکہ یہ پتھر اور لکڑی سے بنائی گئی ہے۔ پتھر کی درانتی اور لکڑی کا دستہ۔

اور جو کھیت ہم دیکھ رہے ہیں وہ دنیا کا پہلا کھیت ہے۔ دنیا کے زبردست اور وسیع ویرانے میں ایسے سنہرے رومال شاید چند ہی ہونگے۔

گھاس پھوس اناج کو ہر طرف سے گھیرتا ہے کیونکہ آدمی نے ابھی ان کے خلاف لڑنا نہیں سیکھا ہے۔ پھر بھی اناج کی بالیاں آخر میں جیتتی ہیں۔ وہ وقت بھی آئیگا جب سنہرے کھیت ساری زمین کو سونے کے سمندر کی طرح ڈھک لینگے۔

فاصلے پر دریا کے قریب ہری بھری چراگاہ میں ہم ایک چھوٹے سفید اور رنگ برنگ دھبوں والی شکلوں کا غول دیکھتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر حرکت کرتا ہے، کبھی پھٹ جاتا ہے اور کبھی ایک ہو جاتا ہے۔

بعض شکلیں دوسروں سے بڑی ہیں۔ ہاں یہ گایوں، بکریوں اور بھیڑوں کا گلہ ہے۔ ابھی یہ جانور بہت کم تعداد میں ہیں جن کا آدمی نے پالن پوسن کیا ہے اور اپنی کوششوں سے ان میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ لیکن یہ اپنے جنگلی رشتےداروں کے مقابلے میں تیزی سے بڑھ رہے ہیں جن کو اپنی دیکھ بھال خود کرنی پڑتی ہے۔

دو تین ہزار سال میں دنیا میں پالتو گایوں اور بیلوں کے مقابلے میں جنگلی بھینسوں کی تعداد بہت کم رہ جائیگی۔

اگر یہاں کھیت اور گلہ ہے تو قریب ہی کوئی بستی بھی ضرور ہوگی۔ اور دریا کے اونچے کنارے پر بستی بھی موجود ہے۔ یہ پہلے شکاری پڑاؤں کی طرح نہیں ہے۔ یہاں کھمبوں اور شاخوں کی بنی ہوئی جھونپڑیاں نہیں ہیں۔ ان کے بجائے یہاں سچ مچ کے لکڑی کے گھر اور ڈھلواں تکونی چھتیں ہیں۔ دیواریں مٹی سے لپی ہوئی ہیں۔ دروازے کے اوپر ایک شہتیر نکلا ہوا ہے جس کے سرے پر ایک بیل کا سر بنا ہے، یہ اس گھر کی نگرانی کرنےوالا دیوتا ہے۔ پوری بستی ایک اونچی باڑ اور مٹی کی فصیل سے گھری ہوئی ہے۔

ہوا میں دھوئیں، کھاد اور تازے دودھ کی مہک ہے۔

گھروں کے قریب بچے کھیل رہے ہیں۔ سورنیاں اور ان کے بچے قریب کیچڑ میں لوٹ رہے ہیں۔ کھلے دروازے سے چولھا نظر آتا ہے۔ ایک بوڑھی عورت روٹیاں سینک رہی ہے۔ وہ گندھا ہوا آٹا گرم راکھ پر رکھ کر اس کو مٹی کے برتن سے ڈھک دیتی ہے۔ یہ اس کا تنور ہے۔ اس کے پاس ہی ایک بنچ پر لکڑی کے پیالے اور گلاس رکھے ہیں جو لکڑی کو کھوکھلا کرکے بنائے گئے ہیں۔

آؤ گاؤں سے دریا کی طرف جائیں۔ کنارے کے اتھلے پانی میں لکڑی کو کھوکھلا کرکے بنائی ہوئی ڈونگی ہلکورے لے رہی ہے۔ اس میں پانی بھرا ہے۔ اگر ہم دریا میں اوپر کی طرف اس جھیل کو جائیں جس سے یہ دریا نکلا ہے تو وہاں ایک اور

گاؤں ملیگا لیکن وہ اس گاؤں سے مختلف ہوگا جس سے ہوکر ہم آئے ہیں۔ دوسرا گاؤں ایک جزیرے کی طرح ہے۔

پہلے جھیل کی تہہ میں کھمبے گاڑے گئے۔ پھر ان کھمبوں پر لٹھے لگائے گئے اور لٹھوں پر تختے بچھائے گئے۔ لمبے جھولتے ہوئے پل اس چوبی جزیرے کو کنارے سے ملاتے ہیں۔ گھروں کی دیواروں پر مچھیروں کے جال اور دوسرا سامان وغیرہ سوکھ رہا ہے۔ غالباً جھیل میں مچھلیوں کی افراط ہے۔ لیکن اس گاؤں کے لوگ صرف مچھیرے نہیں ہیں۔ گھروں کے درمیان یہاں وہاں ہم کو اناج کے گول گودام دکھائی دیتے ہیں جن کی چھتیں نوکیلی ہیں۔ یہ گودام شاخوں کو آپس میں بن کر تیار کئے گئے ہیں۔ ان کے قریب گایوں کے باڑے ہیں۔

حالانکہ یہ قدیم بستی ہمارے تصور میں بالکل حقیقی لگتی ہے لیکن یہ زمانہ گذرے غائب ہو چکی ہے۔ پانی گھروں کو ڈبو چکا ہے۔ ان گھروں کے کھنڈرات ہم جھیل کی تہہ میں کیسے پا سکتے ہیں؟ یہ تو بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھیل سوکھ جاتی ہے اور اس کے صدیوں کے راز ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

جھیل کی کہانی

۱۸۵۳ء میں سوئٹزرلینڈ میں زبردست خشک سالی ہوئی۔ وادیوں میں دریا سوکھ گئے، جھیلوں کا پانی خشک ہوکر کناروں سے پیچھے ہٹ گیا اور اس کی ریت اور کیچڑسے بھری تہہ باہر نکل آئی۔ شہر اوبرمیئلین میں جو جھیل زورخ کے کنارے واقع ہے لوگوں نے خشک سالی سے فائدہ اٹھا کر جھیل سے ایک قطعہ زمین حاصل کرنا چاہا۔

اس کا یہ مطلب تھا کہ ان کو اس خشک پٹی کے آر پار ایک بند بنانا تھا جو پانی ہٹ جانے سے ملی تھی اور باقی جھیل سے اس پٹی کو الگ کرنا تھا۔

کام شروع ہو گیا۔ جہاں پہلے لوگ اتوار کے دن نیلی اور ہری کشتیوں میں کشتی رانی کے لئے آیا کرتے تھے وہاں بند بنانے کے لئے قطار در قطار مٹی کے ٹھیلے چلے آ رہے تھے اور گاڑی‌بانوں کا غل‌شور سنائی دے رہا تھا۔ انھوں نے بند کے لئے مٹی بھی جھیل کی تہہ ہی سے حاصل کی جو غیرمتوقع طور پر خشک ہو گئی تھی۔ اچانک ایک پھاوڑا سڑے ہوئے کھمبے پر پڑا۔ اس کے قریب ان کو دوسرا اور تیسرا کھمبا بھی ملا۔ ظاہر تھا کہ لوگوں نے یہاں پہلے بھی کام کیا

تھا۔ کھدائی میں ہر پھاوڑے کی مٹی کے ساتھ پتھر کی کلہاڑیاں، مچھلیاں پکڑنے کے کانٹے اور کوزوں کے ٹکڑے نکلنے لگے۔ ماہرین آثار قدیمہ جلدھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے جھیل کی تہہ سے نکلے ہوئے ہر کھمبے اور ہر چیز کا مطالعہ کرکے کاغذ پر اس گاؤں کا نقشہ تیار کر لیا جو کسی زمانے میں جھیل زورخ کے کنارے پر واقع تھا۔

اس طرح کے گاؤں کے کھنڈرات جو تختوں پر بنے تھے اور چوبی کھمبوں پر ٹکے تھے ماسکو کے قریب دریائے کلیازما اور موروم کے قریب دریائے ویلیتما پر پائے گئے۔ وہاں سے جو چیزیں دستیاب ہوئیں ان میں مچھلیوں کی ہڈیاں، مچھلیوں کے شکار کے لئے برچھے اور کانٹے تھے۔

ماہرین آثار قدیمہ نے حال میں سوئٹزرلینڈ کی جھیل نیوشاٹیل کا بھی جائزہ لیا۔ انھوں نے جھیل کی تہہ کے نمونے لئے اور معلوم کیا کہ یہ تہہ کئی پرتوں پر مشتمل ہے۔

جیسے کسی سموسے میں اوپر کا چھلکا اس چیز سے جدا کرنا آسان ہے جو اس میں بھری ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی جھیل کی تہہ کی پرتوں سے صاف نظر آتا تھا کہ کہاں سے وہ شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔ تہہ کی نیچی پرت ریت کی تھی، اس کے اوپر ریت اور مٹی ملی ہوئی گاد کی تہہ تھی جس میں

نیوگینی میں ابھی تک کھمبوں پر بسے ہوئے گاؤں ملتے ہیں

انسانی رہائش گاہوں، فرنیچر اور اوزاروں کی باقیات پائی گئیں۔ پھر اس کے اوپر ریت کی ایک اور تہہ تھی۔ اسی طرح ان پرتوں کی ساخت کئی مرتبہ دہرائی گئی تھی۔ ایک جگہ ریت کی دو پرتوں کے درمیان کوئلے کی ایک تہہ تھی۔

یہ سب تہیں کیسے بنیں؟

پانی تو صرف ریت ہی جمع کر سکتا تھا۔ یہ کوئلہ کہاں سے آیا؟

یہ تو صرف آگ ہی سے آ سکتا تھا۔

ان تہوں کا کافی غور سے جائزہ لینے کے بعد ماہرین آثار قدیمہ نے جھیل کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کسی بہت دور کے زمانے میں لوگ جھیل پر آئے اور انھوں نے اس کے کنارے ایک بستی بسائی۔ پھر بہت سال بعد جھیل میں سیلاب آیا اور وہ کناروں پر چڑھ آئی۔

اس ڈرائنگ میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے وہ گاؤں بحال کرکے دکھایا ہے جو کسی زمانے میں زورخ جھیل پر تھا

لوگوں نے سیلاب زدہ گاؤں کو چھوڑ دیا۔ مکانات وغیرہ پانی میں سڑکر گر گئے۔ جہاں کبھی شہتیروں کے نیچے ابابیلیں اپنے گھونسلے بناتی تھیں وہاں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ادھر ادھر تیرنے لگیں۔ تیز دانتوں والی پائک وہاں آہستہ آہستہ تیرنے لگی جہاں کسی زمانے میں ایک گھر کا دروازہ تھا۔ کیکڑا اپنے چنگل اس بنچ کے نیچے گھمانے لگا جو کسی زمانے میں چولھے کے پاس پڑی تھی۔ جلدھی یہ کھنڈرات گاد کی ایک تہہ سے ڈھک گئے اور پھر ان پر ریت دوڑ گئی۔

رفتہ رفتہ جھیل بھی بدل گئی۔ پانی کناروں سے ہٹ گیا اور تہہ نکل آئی۔ ریت کا ٹیلا بھی جس پر گاؤں آباد تھا پانی سے نکل آیا۔ لیکن گاؤں کہیں نہیں تھا کیونکہ اس کے کھنڈرات ریت کی گہرائیوں میں دفن ہوچکے تھے۔

اب لوگ پھر جھیل کے کنارے آئے۔ کلہاڑیوں کی آواز ہوا میں گونجنے لگی۔ لکڑی کی چھپٹیاں سنہری ریت پر بکھر گئیں۔ پانی کے قریب یکے بعد دیگرے مضبوط، نئے مکان بلند ہونے لگے۔

لوگوں اور جھیل کے درمیان لڑائی جاری رھی۔ کبھی ایک جیت جاتا تو کبھی دوسرا۔ لوگ مکانات بناتے اور جھیل ان کو تباہ کر دیتی۔

آخرکار لوگ لڑائی سے تھک گئے۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اب پانی کے کنارے مکانات بنانے کے بجائے پانی کے اوپر ان کو بنائیں گے۔ انھوں نے بڑے بڑے کھمبے جھیل کی تہہ میں اتار دئے۔ تختوں کی دراڑوں کے درمیان ان کو پانی دور نیچے ھلکورے لیتا نظر آتا تھا۔ لیکن وہ اب ان کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ وہ چاھے جتنا اوپر اٹھتا لیکن تختوں تک نہیں پہنچتا تھا۔

بہر حال، جھیل کے لوگوں کا ایک اور بھی دشمن تھا۔ یہ تھی آگ۔

قدیم زمانے کا غار کا آدمی آگ سے نہیں ڈرتا تھا کیونکہ اس کے غار کی پتھر کی دیواروں کو آگ جلا نہیں سکتی تھی۔

لیکن پہلے چوبی مکانوں کی تعمیر کے بعد ھی مکانوں میں آگ لگنا شروع ہوئی۔ یہ شعلہ ور جانور جس نے ہزاروں سال انسان کی فرمانبرداری کے ساتھ خدمت کی تھی اب دانت دکھانے لگا تھا۔

جھیل نیوشاٹیل کی تہہ میں کوئلے کی جو موٹی تہہ ملی تھی دراصل کسی قدیم آتشزدگی کا نتیجہ تھی۔

یہ کیسی مصیبت تھی! لوگ اپنے بچوں کو سینے سے لگاکر پانی میں کود گئے۔ مویشی باڑوں میں چلا رھے تھے لیکن ان کو کھول کر نکالنے کا وقت ھی نہ تھا۔

لکڑی کا پورا گاؤں ایک زبردست الاؤ کی طرح جل رہا تھا اور ہر طرف چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

یہ آگ واقعی بڑی تباہ کن تھی۔

لیکن جس آگ نے گاؤں والوں کے گھر تباہ کئے اسی نے ہمارے میوزیموں کے لئے بیش بہا چیزیں محفوظ کر دیں۔ یہ تھے چوبی برتن، مچھلی پکڑنے کے جال، حتی کہ اناج کے دانے اور پودوں کے تنے۔

یہ کیا معجزہ تھا کہ ایسی چیزیں محفوظ رہیں جو سب سے تیزی سے جلتی ہیں؟

ہوا یہ کہ جب بہت سی چیزوں میں آگ لگی تو وہ پانی میں گر گئیں۔ پانی نے ان کو بچا لیا کیونکہ آگ بجھ گئی اور یہ چیزیں بلا کسی نقصان کے تہہ میں بیٹھ گئیں۔ یہاں ان کو ایک نئے خطرے کا سامنا تھا۔ پانی میں سڑجانے کا۔ لیکن وہ اس سے بھی محفوظ رہیں کیونکہ وہ جھلس چکی تھیں اور اوپر کی پتلی، جلی ہوئی، کوئلے کی تہہ نے ان کو سڑنے سے بچایا۔
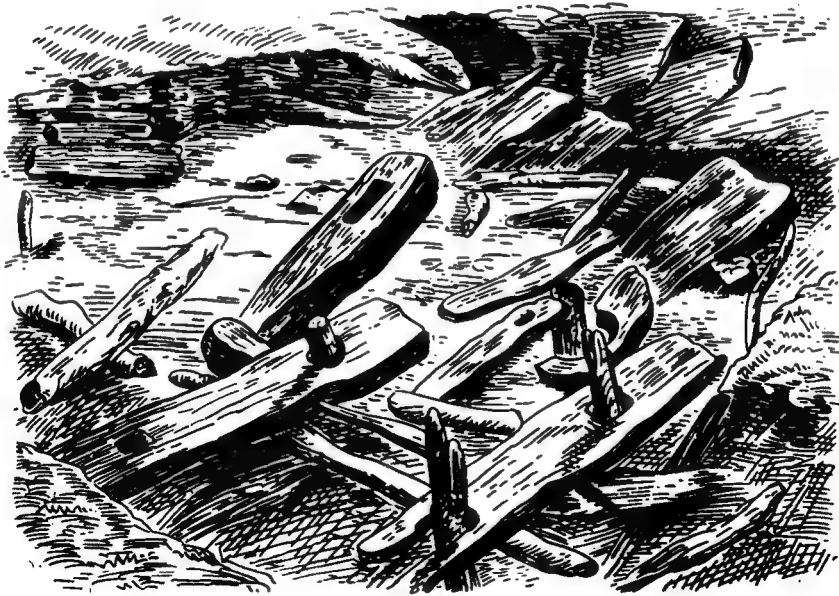
اسکاٹ‌لینڈ میں جہاں قدیم زمانے میں کھمبوں پر آباد گاؤں تھا اس قسم کی چیزیں پائی گئی ہیں

اگر پانی اور آگ نے اپنا کام الگ الگ کیا ہوتا تو یہ چیزیں قطعی تباہ ہو جاتیں ۔ لیکن ایک ساتھ کام کرکے انھوں نے ایسی نازک چیزوں کو جیسے سن سے بنے ہوئے ایک چیتھڑے کو بچا لیا جو ہزاروں سال پہلے بنا گیا تھا ۔

پہلا کپڑا

پہلی بار کپڑا ہاتھ سے بنا گیا ۔

آج بھی اسکیمو لوگ بنائی کے لئے کرگھا نہیں استعمال کرتے ہیں ۔ وہ اپنا کپڑا ہاتھ سے بنتے ہیں ۔ وہ تانے کے لمبے دھاگے ایک فریم میں لگا دیتے ہیں پھر بانے کے دھاگے ان کے بیچ میں ہاتھ سے نکالکر بنتے ہیں ۔ وہ کوئی نلی نہیں استعمال کرتے ۔

دھاگوں کے اس چھوٹے سے چوبی فریم کا مقابلہ جدید کرگھوں سے کرنا ممکن نہیں ہے لیکن جدید کرگھے کی ابتدا اسی سادے چوبی فریم سے ہی ہوئی ۔

جلا اور سیاہ چیتھڑا جو جھیل کی تہہ میں پایا گیا ہمیں آدمی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ بتاتا ہے ۔ جس آدمی نے ابھی تک جانوروں کی کھال کے لباس پہنے تھے اب اس نے اپنے کھیت سے حاصل کئے ہوئے سن سے لباس تیار کیا تھا ۔

اس سوئی کو جو کپڑے کی ایجاد سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوئی تھی اب جاکر زندگی میں صحیح جگہ ملی تھی ۔ اب اس نے جانوروں کی کھالوں کو نہیں بلکہ کپڑے کے ٹکڑوں کو سینا شروع کردیا ۔

خوبصورت نیلے پھولوں والا سنئی کا کھیت اب عورتوں کے لئے زیادہ دیکھ بھال اور فکر کا سبب بن گیا ۔

ان کے ہاتھ کتائی سے تھکے ہوتے لیکن سنئی اکھاڑنے کا وقت آ جاتا ۔ پہلے ان کو ہر پودے کو جڑوں سے اکھاڑنا پڑتا ۔ پھر اس کو سکھایا اور دھویا جاتا اور دوبارہ سکھایا جاتا ۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ سوکھی ہوئی سنئی کو کوٹنا، اس کے ریشے نکالنا اور ان کو سلجھانا پڑتا ۔ اب یہ دھلے اور سلجھے ہوئے ریشے گاؤں کے بچوں کے بالوں کی طرح روپہلے اور تیار ہوتے ۔ اب تکلیاں کتائی کرتیں اور دھاگہ تیار کرتیں ۔ جب دھاگہ تیار ہو جاتا تو کپڑا بنا جاتا ۔

کپڑا تیار کرنے کے لئے بہت کام کرنا پڑتا لیکن عورتوں کو خوبصورت رومال، پیش بند اور لہنگے ملنے لگے جن کی گوٹ کناریاں رنگا رنگ ہوتیں اور یہ سب ان کی مصیبتوں کا معاوضہ بن جاتیں ۔

پہلے کانکن اور دھاتساز

آجکل گھر گھر ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو ایسے مصنوعی مادوں سے بنی ہیں جو قدرتی طور پر نہیں پائے جاتے۔

قدرت کے پاس نہ تو اینٹ تھی اور نہ چینی، نہ ڈھلا لوھا تھا اور نہ کاغذ۔ چینی کے برتن اور ڈھلے ہوئے لوہے کی مصنوعات کے لئے آدمی کو ایسی اشیا استعمال کرنی تھیں جو قدرتی طور پر پائی جاتی ہیں اور ان کو اس طرح تبدیل کرنا تھا کہ وہ پہچانی بھی نہ جا سکیں۔ کیا ڈھلا ہوا لوھا اسی خام لوہے کی طرح ہوتا ہے جس سے وہ صاف کرکے بنایا جاتا ہے؟ کیا ہم کسی نفیس، شفاف چینی کے پیالے کو دیکھ کر اس بھدی مٹی کا تصور کر سکتے ہیں جس سے وہ بنایا گیا ہے؟

تو پھر کنکریٹ، سیلوفین، پلاسٹک، مصنوعی ریشم اور مصنوعی ربر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا پہاڑوں میں تم کو کبھی کوئی کنکریٹ کی پہاڑی بھی مل سکتی ہے؟ اور وہ کون سا ریشم کا کیڑا ہے جو لکڑی سے ریشم بنا سکتا ہو؟

کھمبوں پر بسے ہوئے گھروں سے ایسے کپڑے کا ٹکڑا ملا ہے
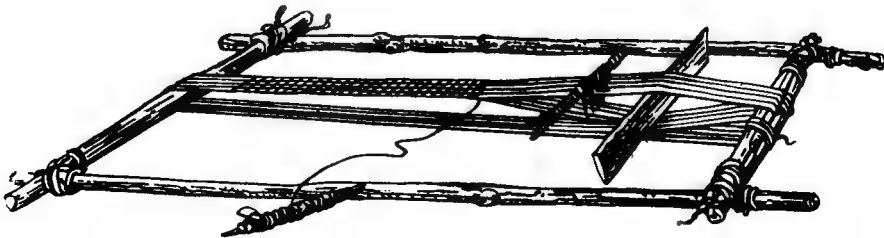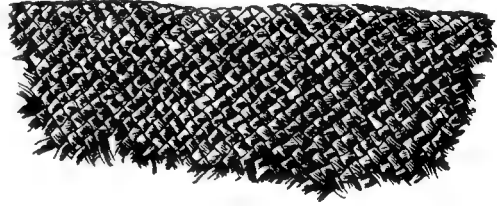
پہلے کرگھے غالباً برازیل کے انڈین لوگوں کے اس کرگھے کی طرح تھے

مادے پر کنٹرول حاصل کرکے انسان نے قدرت کے زیادہ سے زیادہ رازوں کا انکشاف کیا ۔ اس نے ایک پتھر کو دوسرے سے رگڑ کر تیز کرنے سے ابتدا کی اور اب وہ سالموں (molecules) پر حکم چلاتا ھے جو ایسے چھوٹے ذرات ھیں جن کو وہ خود بھی نہیں دیکھ سکتا ۔

یہ عمل مدتوں ہوئے شروع ہوا تھا، اس زمانے سے بہت پہلے جب کیمیا یعنی مادے کی سائنس کے متعلق معلومات حاصل کی گئیں ۔ آدمی نے ٹٹول ٹٹول کر یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ھے مادے کو تبدیل کرنا سیکھا ۔

جب پہلے کمھاروں نے اپنے مٹی کے برتن پکائے تو وہ غیرشعوری طور پر مادے پر کنٹرول حاصل کر رہے تھے ۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا ۔ تم مادے کے انتہائی چھوٹے ذرے کو اپنے ھاتھوں سے تبدیل نہیں کر سکتے یا اس کو کوئی دوسری شکل نہیں دے سکتے جیسا کہ پتھر کو کرتے ہو ۔ یہاں آدمی کو اپنے ھاتھوں کی طاقت کے علاوہ کسی اور طاقت کی ضرورت تھی، ایسی طاقت کی جو مادے کو تبدیل کر سکے ۔

اور جب آدمی نے آگ کو اپنا مددگار بنایا تو اس کو یہ طاقت مل گئی ۔ آگ مٹی کو پکاتی تھی، آٹے کو روٹی میں تبدیل کر دیتی تھی ۔ آگ تانبے کو پگھلاتی تھی ۔

ہم جھیلوں کی تہوں میں پتھر کے اوزاروں کے علاوہ تانبے کے اوزار بھی پاتے ھیں ۔

اس آدمی نے جو ہزاروں سال تک پتھر کے اوزار بناتا رہا یکدم دھات کے اوزار بنانا کیسے سیکھ لئے؟ اور اس کو دھات کہاں سے ملی؟

میدانوں اور جنگلوں میں چلتے چلتے ھمیں خالص تانبے کا کوئی ٹکڑا کبھی نہیں ملتا ۔ خالص تانبا تو آجکل بہت نایاب ھے ۔ لیکن ھمیشہ ایسا نہ تھا ۔ ہزاروں سال پہلے اب سے کہیں زیادہ تانبا تھا ۔ وہ تو دارصل پیروں کے نیچے پڑا رہتا تھا لیکن لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ چقماق پتھر سے اپنے اوزار بناتے تھے ۔

انھوں نے اس تانبے کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں کی جب تک ان کو چقماق پتھر کی کمی نہیں محسوس ہوئی ۔ اس کمی کی ذمےداری خود لوگوں پر تھی کیونکہ انھوں نے چقماق پتھر کو کبھی کفایت سے استعمال نہیں کیا ۔ جب انھیں کوئی نیا اوزار بنانا ھوتا تو وہ چقماق پتھر کا ایک بڑا ٹکڑا لیکر اس کو کاٹنا شروع کرتے یہاں تک کہ اس سے بس ایک چھوٹا سا اوزار بن جاتا ۔ رہائش‌گاھوں کے چاروں طرف پتھر کے ٹکڑوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے رہتے تھے جو اوزار بنانے کے

سوویت یونین کے جنوب میں کھدائی کے دوران قدیم زمانے کا یہ چولھا برآمد ہوا

لئے بیکار تھے۔ آج بھی تم ہر جگہ لکڑی کی چھیلن کے ڈھیر دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ یہاں بڑھئی کی دوکان ہے۔

ہزاروں برسوں کے دوران چقماق پتھر کے بڑے بڑے ذخیرے کم پڑ گئے۔ بہت سے ملکوں میں تو ان کا قحط پڑ گیا۔ یہ بڑی مصیبت تھی۔ ذرا سوچو کہ اگر کافی لوہا نہ ہو تو ہماری فیکٹریوں اور کارخانوں کا کیا حشر ہوگا۔ جب سطح زمین کے قریب والے ذخیرے خرچ ہو جاتے ہیں تو خام دھات کی تلاش میں کان کنوں کو زیادہ گہرائیوں میں کھودنا پڑتا ہے۔

بالکل یہی قدیم زمانے کے لوگوں کو بھی کرنا پڑا۔ انھوں نے کانیں کھودنا شروع کیں جو دنیا کی پہلی کانیں تھیں۔

ہمیں کبھی کبھی کھریامٹی کے ذخیروں میں ایسی قدیم کانیں ملتی ہیں کیونکہ چقماق پتھر اور کھریا مٹی اکثر ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔

اس زمانے میں سطح زمین سے دس یا بارہ میٹر نیچے کام کرنا بہت ہی خوفناک ہوتا تھا۔ لوگ کانوں کے اندر رسی یا کسی دندانے کٹے ہوئے ستون کے ذریعہ اترتے تھے۔ نیچے اندھیرا اور دھواں دھار ہوتا تھا۔ لوگ لکڑی کی مشعل یا کسی چھوٹے سے تیل کے لیمپ کی روشنی میں کام کرتے تھے۔ آج کانوں اور سرنگوں کو

لٹھے لگاکر محفوظ کر دیا جاتا ہے لیکن اس زمانے میں تہہ زمین سرنگوں کی دیواروں اور چھتوں کو مضبوط اور محفوظ بنانے کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں۔ اکثر چٹان کا کوئی زبردست ٹکڑا ڈھیلا ہوکر گر جاتا اور کان کنوں کو دفن کر دیتا۔ چقماق پتھر کی قدیم کانوں میں دبے ہوئے کان کنوں کے ڈھانچے کھریا مٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے نیچے پائے گئے ہیں۔ ڈھانچوں کے قریب ان کے اوزار بھی تھے — بارہ سنگوں کی سینگوں کی کدالیں۔

ایسے دو ڈھانچے ایک ہی سرنگ میں پائے گئے۔ ایک تو بڑے آدمی کا تھا اور دوسرا بچے کا۔ غالباً کوئی باپ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لایا تھا اور وہ دونوں پھر کبھی گھر نہیں لوٹے۔

جوں جوں صدیاں گذرتی گئیں چقماق پتھر کی کمی اور کان کنی سخت ہوتی گئی۔ بہرحال، قدیم زمانے کے آدمی کو چقماق پتھر کی ضرورت تھی۔ اسی سے اسکی کلہاڑیاں، چاقو اور کدالیں بنتی تھیں۔

اس کو چقماق پتھر کی جگہ کسی اور چیز کی دریافت کی سخت ضرورت تھی۔

اور پھر خالص تانبے نے لوگوں کی مدد کی۔ انہوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی۔ یہ سبز پتھر کیا ہے اور کیا یہ کسی چیز کے لئے استعمال ہو سکتا ہے؟

جب لوگوں کو خالص تانبے کا کوئی ٹکڑا مل جاتا تو وہ اس کو ہتھوڑے سے پیٹتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تانبہ بھی پتھر ہے اور وہ اسکو چقماق پتھر کی طرح استعمال کرنا چاہتے تھے۔ پتھر کے ہتھوڑے کی چوٹیں تانبے کو اور سخت کر دیتیں اور اس کی ساخت بدل ڈالتیں۔ لیکن اس کو پیٹنے کا بھی خاص طریقہ تھا۔ اگر چوٹیں بہت سخت ہوتیں تو تانبا بھربھرا ہوکر ٹکڑوں میں ٹوٹ جاتا۔

اس طرح آدمی نے پہلی بار دھات کو پیٹنا اور گڑھنا شروع کیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ ٹھنڈی گڑھائی تھی۔ لیکن ٹھنڈی گڑھائی سے گرم گڑھائی تک زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

کبھی کبھی یہ ہوتا کہ خالص تانبے یا خام تانبے کا کوئی ٹکڑا آگ میں جا گرتا۔ یا شاید آدمی اس کو اسی طرح پکانے کی کوشش کرتا جیسے وہ اپنے مٹی کے برتن پکاتا تھا۔ جب آگ بجھتی تو راکھ اور چولھے کے کنارے لگے ہوئے پتھروں کے درمیان تانبے کا پگھلا ڈلا نظر آتا۔

لوگ حیرت سے اس معجزے کو دیکھتے جو انہوں نے کر دکھایا تھا۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ”آگ کی دیوی“ نے اس سبزی مائل سیاہ پتھر کو چمکدار سرخ تانبے میں بدل دیا ہے اور اس میں ان کا ہاتھ بالکل نہیں ہے۔

اس تانبے کے ڈلے کو ٹکڑوں میں توڑا جاتا اور پھر ان کو پتھر کے ہتھوڑے سے پیٹ پیٹ کر کلہاڑیوں، کدالوں اور خنجروں کی شکل دی جاتی۔

اس طرح آدمی نے حیرت انگیز گودام سے ایک سخت چمکدار دھات حاصل کی۔ اس نے خام دھات کا ایک ٹکڑا آگ میں پھینکا اور اس کو تانبہ مل گیا۔
یہ معجزہ آدمی کی محنت سے ہوا۔

پہلے روسی کسان

انیسویں صدی کے آخر میں ایک روسی ماہر آثار قدیمہ خوائیکونے کیئف کے علاقے میں تریپولئے گاؤں کے قریب قدیم زمانے کی زرعی بستی دریافت کی۔
اس کے بعد جنوبی روس میں اس قسم کے بہت سے گاؤں دریافت کئے گئے۔
سوویت دور میں ماہرین آثارقدیمہ پاسیک اور بوگایفسکی نے یہ تحقیقات جاری رکھی۔ ان کے کام نے ہمارے لئے یہ تصور کرنا ممکن بنایا کہ پانچ ہزار سال پہلے کسان کیسے رہتے تھے۔
قدیم زمانے کا گاؤں اونچی باڑ سے گھرا ہوتا تھا اور بیچ میں ایک چوک معہ احاطے کے ہوتا تھا۔ چوک کے چاروں طرف مٹی کے پلاسٹر کئے ہوئے چوبی مکانات ہوتے تھے اور ان کی چھتیں چار پہل کی ہوتی تھیں۔
ایسے مکان کا چھوٹا سا مٹی کا نمونہ پایا گیا ہے جو ہزاروں سال پہلے بنایا گیا تھا۔ یہ کھلونا تو نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً یہ کوئی ایسی چیز تھی جو کسی مذہبی رسم میں استعمال کی جاتی تھی۔
شاید لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ چھوٹا سا گھر جس کے اندر عورتوں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں تھیں اصلی بڑے گھر کو بدروحوں اور آفتوں سے بچائےگا۔
اس چھوٹے سے نمونے میں داخلے کے دائیں طرف ایک تندور تھا اور بائیں طرف ایک ذرا اونچا چبوترہ جس پر مختلف چیزیں رکھنےوالے بڑے بڑے برتن رکھے تھے۔
چبوترے کے پاس ھی ایک عورت کی مورتی تھی جو ایک اناج کی چکی پر جھکی ہوئی تھی۔ داخلے کے سامنے ایک کھڑکی پر قربان‌گاہ تھی۔ ایک اور عورت کی مورتی جو چولھے کی نگراں ہے تندور کے قریب دکھائی گئی تھی۔
اس قسم کے گھر کو تو گھر کہنا بالکل بجا ہے۔ اس کی چھت میں شہتیر پڑے ھیں۔ چولھا معہ چولھےدان کے ہمارے دیہاتی چولھے کی طرح ہے۔ فرش کو جو مٹی کا ہے مکان بناتے وقت آگ بچھا کر پکالیا گیا تھا۔ مٹی کے پلاسٹر کی دیواروں پر طرح طرح کے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔
ہر گھر میں کئی کمرے ہوتے تھے جو اوٹ کے ذریعہ ایک دوسرے سے علحدہ ہوتے تھے۔

لیکن گاؤں میں ایسے بڑے غارنما گھر بھی تھے جو زمین کو کھود کر بنائے گئے تھے۔
اب کاریگر کمہار، لوہار اور ٹھٹھیرے بھی تھے۔
کمہاروں نے تین تین فیٹ تک اونچے برتن بنانا اور ان کو رنگ برنگے ڈیزائنوں سے سجانا سیکھ لیا تھا۔ ماھرین آثارقدیمہ نے ایسے برتن پائے ھیں جو گلابی مٹی کے بنے ھیں اور ان پر فیتوں، حلقوں اور چھلوں کے ڈیزائن ھیں جو بعض جگہ بڑی بڑی آنکھوں‌والے آدمیوں کے چہروں، جانوروں اور سورج سے مشابہہ ھیں۔
زمین نے جو اوزار محفوظ رکھے ھیں ان کا جائزہ لیکر ھم اس تبدیلی کو سمجھ سکتے ھیں جو چقماق پتھر کے اوزاروں سے لیکر تانبے کے اوزاروں تک ھوئی۔
انتہائی قدیم اوزار یعنی کٹار، رندا اور تیر سب کے سب چقماق پتھر یا ھڈی کے ھوتے تھے۔
کدالیں یا تو پتھر کی ھوتی تھیں یا بارہ‌سنگھے کی سینگوں کی۔ کدال میں ایک سوراخ بنایا جاتا تھا تاکہ اس میں لکڑی کا دستہ لگایا جا سکے۔
اناج ایسی درانتیوں سے کاٹا جاتا تھا جو یا تو گائے کے مونڈھے کی ھڈیوں سے بنائی جاتی تھیں یا لکڑی سے۔ چونکہ لکڑی کی درانتی کاٹ نہیں سکتی تھی اس‌لئے اس میں چقماق پتھر کے تیز دانت لگائے جاتے تھے۔
انھیں گاؤں میں ھمیں ایسے سانچے بھی ملے جو تانبے کے پہلے اوزار ڈھالنے میں استعمال ھوتے تھے — چوڑے پھل‌والی کلھاڑیاں۔
ھم یہ بھی جانتے ھیں کہ‌کون سے اناج بوئے جاتے تھے۔ ماھرین آثار قدیمہ نے کولومیئشچینو گاؤں کے گھروں کی دیواروں کی پلاسٹر کی مٹی میں گیہوں، جو، رئی اور باجرے کے دانے اور بالیاں پائیں۔
ھمارے کسان زراعت کی سائنس میں زبردست مہارت حاصل کر چکے ھیں۔ ان کو تھوڑا بہت تجربہ ھے یعنی پانچ ھزار سال کا تجربہ ھے۔

انسانی محنت کا کیلنڈر

ھم وقت کو برسوں، صدیوں اور ھزارسالہ عہدوں میں شمار کرنے کے عادی ھیں لیکن جو لوگ زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کی زندگی کا مطالعہ کرتے ھیں ان کو مختلف قسم کا کیلنڈر، مختلف قسم کا وقت کا پیمانہ استعمال کرنا پڑتا ھے۔ یہ کہنے کے بجائے کہ ”اتنے ھزار سال گزرے،، ھم کہتے ھیں ”قدیم پتھر کے زمانے

میں،، ، ''نئے پتھر کے زمانے میں،، ، ''تانبے کے زمانے میں،، یا ''کانسے کے زمانے میں،،۔ یہ کوئی سالانہ کیلنڈر نہیں ہے بلکہ انسانی محنت کا کیلنڈر ہے۔ یہ ہمیں ٹھیک ٹھیک بتاتا ہے کہ آدمی ارتقا کی کن منزلوں سے گزرا ہے، راستے میں وہ کہاں پہنچا ہے۔

عام کیلنڈر میں وقت کی بڑی یا چھوٹی ناپ ہوتی ہے — صدی، سال، مہینہ، دن اور گھنٹہ۔

انسانی محنت کا کیلنڈر بھی اپنی بڑی اور چھوٹی ناپیں رکھتا ہے۔ ہم یہ کہہ کر وضاحت کر سکتے ہیں کہ ''پتھر کا وہ زمانہ جب اوزاروں کو کاٹ کاٹ کر بنایا جاتا تھا،، یا ''پتھر کا وہ زمانہ جب اوزاروں کو چکنا اور چمکدار بنایا جانے تھا،،۔

اب ہماری کہانی انسانی تاریخ کے اس زمانے تک پہنچ گئی ہے جب پتھر کے اوزاروں کی جگہ دھات کے اوزاروں نے لے لی، جب زراعت اور مویشیوں کے پالن پوسن کی ابتدا ہوئی۔ محنت کی اس تقسیم کے ساتھ سامان کا تبادلہ ہونے لگا۔ اگر تانبے کی کلہاڑیاں ایک جگہ بنتیں تو رفتہ رفتہ وہ دوسرے قبیلوں تک پہنچنے لگیں۔

لوگ دریاؤں پر اپنی ڈونگیوں کے ذریعہ گاؤں گاؤں جاتے، اناج کا چمڑے سے یا کپڑے کا مٹی کے برتنوں سے تبادلہ کرتے۔ کسی قبیلے کے پاس بہت سا تانبہ ہوتا اور دوسرے کے پاس کاریگر کمہار۔ کہیں جھیل میں کھمبوں پر بسے گاؤں کے رہنےوالے اپنے پڑوسیوں سے ملتے جو سامان تبادلے کےلئے لاتے۔ سامان کے تبادلے سے تجربے کا، کام کے نئے طریقوں کا تبادلہ بھی ہوتا۔

یہاں لوگوں کو اشاروں کی زبان استعمال کرنی پڑتی کیونکہ ہر قبیلے کی الگ الگ اپنی بولی تھی۔ بہرحال جب ملاقاتی جب لوٹتے تو وہ دوسروں کا بنایا ہوا سامان ہی اپنے ساتھ نہ لےجاتے بلکہ ان کے کچھ الفاظ بھی لےجاتے جو وہ سیکھ لیتے تھے۔ اس طرح قبیلوں کی بولیوں کا تبادلہ اور میل جول ہوا۔ اس طرح ہر نئے لفظ کے ساتھ اس کے مطلب کو بھی اس سے منسلک کیا گیا۔ قبیلے کے اپنے دیوتاؤں کے برابر پڑوسی قبیلے کے دیوتاؤں کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ بہت سے عقیدوں سے ایسے عقیدے پیدا ہوئے جو آئندہ چلکر پوری پوری قوموں کےلئے مشترک بن گئے۔

دیوتا تیزی سے سفر کرتے تھے۔ نئی جگہوں پر ان کو نئے نام دئے جاتے لیکن ان کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

جب ہم قدیم قوموں کے مذہبوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پہچان لیتے ہیں کہ بابل کا تاموز، مصر کا اوسیرس اور یونان کا اڈونیس دراصل ایک ہی دیوتا ہیں۔

لوگ کشتیوں میں گھوم گھوم کر اپنی بنائی ہوئی چیزوں کا دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں سے تبادلہ کرتے ھیں۔یہ اسکینڈی‌نیویا کی قدیم کشتی کی ڈرائنگ ھے

یہ وھی زراعت کا دیوتا ھے جو خزاں میں مرجاتا تھا اور پھر بہار میں نیچے کی دنیا سے واپس لایا جاتا تھا۔

کبھی کبھی تو ھم کسی دیوتا کے سفر کا نقشہ تک تیار کر سکتے ھیں۔ مثلاً اڈونیس یونان میں شام سے پہنچا، ان ملکوں سے جہاں سامی رہتے تھے۔ اس کا نام ھی اس کا ثبوت ھے کیونکہ سامیوں کی زبان میں اڈونیس کا مطلب ھے ''مالک،،۔ یونانیوں کو پتہ نہیں تھا کہ یہ ایک لفظ ھے۔ انھوں نے اس کو ذاتی نام کی حیثیت سے اپنایا۔

اس طرح سامان، الفاظ اور مذھبوں کا تبادلہ ھوتا تھا۔

یہ کہنا غلط ھوگا کہ ایسا تبادلہ ھمیشہ پرامن طریقے سے ھوتا تھا۔ اگر ''ملاقاتیوں،، کو وہ تانبا، اناج یا کپڑا بزور مل سکتا تھا جو دوسروں نے پیدا کیا ھے تو اس میں باک نہیں کرتے تھے۔ اس طرح یہ تبادلہ جو اکثر ایماندارانہ نہ ھوتا تھا بالکل لوٹ کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ ملاقاتی اور میزبان ایک دوسرے پر حملہ کردیتے تھے اور جو زیادہ طاقتور ھوتا تھا میدان اسی کے ھاتھ رھتا تھا۔ کسی اجنبی کو لوٹ لینا یا مار ڈالنا ذرا بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

پھر اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ھر گاؤں جلد ھی ایک گڑھ کی صورت بن گیا۔ ناخواندہ مہمانوں کے اچانک ریلے کو روکنے کےلئے گاؤں کے گرد مٹی کی فصیل اور باڑ بنائی جانے لگی۔

لوگوں میں دوسرے قبیلےوالوں پر اعتبار نہیں تھا۔ ھر قبیلہ اپنے کو ''آدمی،، کہتا تھا مگر دوسرے قبیلے کے لوگوں کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اپنے کو تو ''سورج کا بیٹا،، یا ''آسمان کے لوگ،، کہتے تھے لیکن دوسرے قبیلوں کو برے ناموں سے پکارتے جو کبھی کبھی ان قبیلوں کے ساتھ ایسے چپک جاتے تھے کہ بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ھوجاتے تھے۔

جب موٴرخوں اور کھوج کرنےوالوں کی کتابوں میں دوسرے قبیلوں سے اس قدیم نفرت کے بارے میں ھم پڑھتے ھیں تو ھمارے سامنے وہ نفرت آجاتی ھے جو

ہمارے زمانے میں نسل‌پرست دوسری قوموں کےلئے پھیلاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے کو ''آدمی،، سمجھتے ہیں اور ان کی رائے میں دوسرے لوگ آدمی نہیں بلکہ ان سے حقیر درجے کے ہیں۔ صرف وہی لوگ غیر قوموں کے خلاف دشمنی کا ایسا پرچار کر سکتے ہیں جو اپنی تاریخی تباہی محسوس کرتے ہوئے دنیا کو پھر وحشیانہ ماضی کی طرف لوٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تاریخ نے ہمیں سکھایا ہے کہ برتر نسل جیسی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ایسی قومیں ہیں جو تمدن کے لحاظ سے زیادہ ترقی‌یافتہ ہیں اور دوسری قومیں پچھڑی ہوئی ہیں۔ انسانی محنت کے کیلنڈر کے مطابق تمام ہم‌عصر قومیں ایک ہی تاریخی دور کی نہیں ہوتیں۔

اکتوبر کے عظیم سوشلسٹ انقلاب سے پہلے روس کی تمام قومیں ارتقا کی ایک ہی منزل پر نہ تھیں۔ کچھ مشینی دور تک پہنچ گئی تھیں اور کچھ اب بھی قدیم لکڑی کے ہل سے کاشتکاری کا کام کر رہی تھیں اور قدیم کرگھوں سے کپڑا بنتی تھیں۔ حتی‌کہ ایسی بھی قومیں تھیں جو ہڈی سے اوزار بناتی تھیں اور ان کو لوہے کے وجود تک کا علم نہ تھا۔

اب سوویت یونین کی زیادہ ترقی‌یافتہ قومیں ان لوگوں کی مدد کرتی ہیں جو ماضی میں پچھڑی ہوئی تھیں۔ تین دہائی برسوں میں وسط ایشیا، سائبیریا اور شمال بعید کی قوموں نے کئی صدیوں کے برابر ترقی کی ہے۔

انسانی محنت کے کیلنڈر کے مطابق ہمارے ملک کی تمام قومیں سوشلسٹ دور کی ہیں اور ہمارے ملک کی سب قومیں برابر ہیں۔

قدیم مصر میں اشیا کا تبادلہ

دسواں باب

دو قانون

اکثر ایسا ہوا ہے کہ سمندروں سمندروں کھوج کرنےوالوں نے نہ صرف نئے ملکوں کی بلکہ ایسے تاریخی زمانوں کی بھی دریافت کی ہے جو مدتوں ہوئے بھلائے جا چکے تھے۔

جب یورپ کے لوگوں نے آسٹریلیا کو ڈھونڈ نکالا تو یہ بڑی کامیابی سمجھی گئی کیونکہ انھوں نے ایک پورا براعظم تلاش کیا تھا اور اس پر قبضہ جمایا تھا۔

لیکن ان کی یہ کامیابی آسٹریلیا کے لوگوں کےلئے بڑی بدنصیبی تھی۔ انسانی محنت کے کیلنڈر کے مطابق وہ ابھی تک دوسرے زمانے میں رہتے تھے۔ وہ یورپی رسم و رواج کو نہیں سمجھتے تھے اور ان کے طور طریقے اپنانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا یہ ''قصور،، معاف نہیں کیا گیا اور ان کو جنگلی جانوروں کی طرح شکار بنایا گیا اور ان پر ظلم توڑے گئے۔ جب یورپ کے شہروں میں عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں اسی وقت آسٹریلیا کے لوگ خیموں میں رہتے تھے۔ آسٹریلیا کے لوگ نجی ملکیت کے مطلب سے بھی واقف نہ تھے جبکہ یورپ میں اگر کوئی شخص کسی امیر جاگیردار کے جنگل میں کوئی ہرن شکار کرلیتا تو اس کو جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔

جو چیز آسٹریلیا کے باشندے کےلئے قانون تھی وہ یورپی باشندے کےلئے جرم تھی۔

جب آسٹریلیا کے شکاری کوئی بھیڑوں کا گلہ دیکھتے تو وہ اس کو گھیر لیتے اور خوشی کے نعرے لگاتے۔ وہ بھیڑوں پر برچھے اور boomerang پھینکتے۔ لیکن یورپی فارم‌والوں کی رائفلیں ایسے وقت میں مداخلت کرتیں۔

یورپی فارمر بھیڑوں کو اپنی نجی ملکیت سمجھتا تھا لیکن آسٹریلیا کے ابتدائی زمانے کے شکاری کے لئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ یورپ کے لوگوں کا قانون یہ تھا ''بھیڑ اس کسان کی ہے جس نے اس کو خریدا ہے یا پرورش کیا ہے۔،، آسٹریلیا کے باشندوں کا قانون یہ تھا ''جانور اس شکاری کا ہے جس نے اس کو پکڑا ہے۔،،

اور چونکه آسٹریلیا کے لوگوں نے اپنے زمانے کے قانون کی پیروی کی اس‌لئے یورپ کے لوگوں نے ان کو گولی کا نشانه بنایا جیسے وہ آدمی نہیں تھے بلکه بھیڑئے تھے جو ان کی بھیڑوں کے گلے میں گھس آئے تھے۔
ان دو مختلف قوانین کا ٹکراؤ پھر ھوتا جب آسٹریلیائی عورتیں اتفاق سے کسی آلو کے کھیت تک پہنچ جاتیں۔ بلاتوقف وہ مزیدار جڑیں کھودنے لگتیں اور کھیت میں ان کی افراط بھی ھوتی۔ سب ایک جگه پر! یہاں جتنی جڑیں وہ ایک گھنٹے میں جمع کر سکتی تھیں اتنی دوسری جگه ایک مہینے میں بھی نه جمع کرپاتیں۔
لیکن ان کی یه اچانک خوش نصیبی ھی ان کےلئے آفت بن‌جاتی۔ گولیاں سنسنانے لگتیں۔ عورتیں معه اپنے آلوؤں کے زمین پر گرتیں اور ان کی سمجھ میں نه آتا که ان کو کس نے مارا ھے اور کیوں۔
امریکه کی دریافت نے بھی ان دو مخالف دنیاؤں کی جنگ کو جنم دیا۔

پرانی ”نئی دنیا،،

یورپی لوگوں نے امریکه کو دریافت کرکے یه سوچا که ان کو نئی دنیا ملی ھے۔
کولمبس کو اس واقعه کی یادگار کے طور پر ایک نشان بھی عطا کیا گیا جس پر یه عبارت لکھی تھی:

کاستیلیا اور لیون کے لئے
کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی

لیکن دراصل یه ”نئی دنیا،، پرانی تھی۔ یورپی لوگوں نے جانے بغیر امریکه میں اپنے ماضی کو ڈھونڈ نکالا تھا جس کو وہ بالکل بھول چکے تھے۔
انھوں نے انڈین لوگوں کے رسم و رواج کو وحشیانه اور عجیب خیال کیا۔ انڈین لوگوں کے مکانات، کپڑے اور طور طریقے بالکل یورپی لوگوں جیسے نه تھے۔
شمال کے انڈین اپنے برچھے اور تیر پتھر اور ھڈیوں سے بناتے تھے۔ ان کو لوھے کے بارے میں کوئی علم نه تھا۔ وہ زراعت سے واقف تھے۔ وہ مکئی، کدو، سیم اور تمباکو کی کاشت کرتے تھے۔ لیکن ان کا خاص پیشه شکار تھا۔ وہ چوبی گھروں میں رھتے تھے اور اپنے گاوؤں کو اونچی باڑوں سے گھیرتے تھے۔
جنوب کی طرف میکسیکو میں، انڈین لوگوں کے پاس تانبے کے اوزار اور سونے

کے زیور تھے۔ ان کے بڑے بڑے مکانات کچی اینٹوں کے بنے ہوتے تھے اور ان پر جپس کا پلاسٹر ہوتاتھا۔

امریکہ کے پہلے نوآبادکاروں اور فاتحوں نے ان تمام باتوں کو تفصیل کے ساتھ اپنے روزنامچوں میں لکھا ہے۔

لیکن چیزوں کے متعلق بتانے کے مقابلے میں طرز زندگی کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔

یورپی لوگوں کے لئے امریکہ کا طرز زندگی انوکھا تھا، وہ اس کو سمجھ نہیں پاتے تھے اور اس کے بارے میں وہ بہت مبہم اور گڈمڈ طریقے سے لکھتے تھے۔

''نئی دنیا،، میں نہ تو پیسہ تھا اور نہ سوداگر، نہ غریب تھے اور نہ امیر۔ بعض انڈین قبیلے ایسے تھے جو سونے کی چیزیں بنانا جانتے تھے لیکن وہ سونے کی بیش‌قیمتی سے لاعلم تھے۔
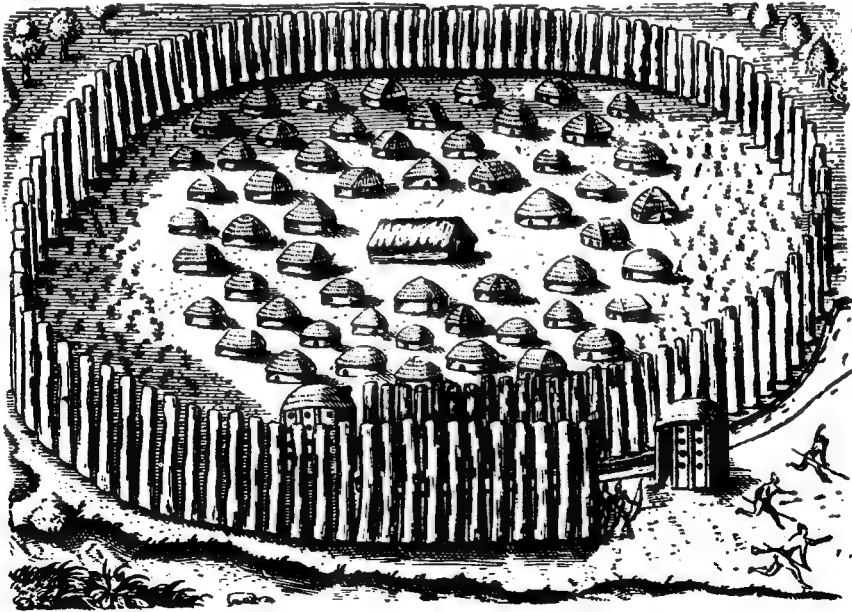
انڈین لوگ لکڑی کے گھروں میں رہتے تھے اور اپنے گاؤں کو اونچی اونچی باڑوں سے گھیرتے تھے (۱۶ ویں صدی کا نقش)

پہلے انڈین جو کولمبس کے ملاحوں نے دیکھے ان کی ناکوں میں سونے کی کیلیں تھیں اور گلوں میں سونے کے ہار، لیکن انھوں نے شیشے کے دانوں اور معمولی زیوروں کے بدلے میں یہ سونے کے زیورات فوراً دے دئے۔

سمندر پار سے آئے ہوئے اجنبی بخوبی جانتے تھے کہ دنیا کے تمام لوگ مالکوں اور خادموں، جاگیرداروں اور کسانوں میں تقسیم ھیں۔ لیکن یہاں کے سب لوگ برابر تھے۔ جب کوئی قبیلہ کسی دشمن کو گرفتار کرلیتا تھا تو اس کو غلام یا ملازم نہیں بناتا تھا۔ یا تو اس کو فوراً قتل کردیا جاتا تھا یا اس کو قبیلے میں شامل کرلیا جاتا تھا۔

یہاں کوئی بھی محل، گھر یا جاگیر کا مالک نہ تھا۔ لوگ برادری کے مکانوں میں رہتے تھے جو ''لمبے مکان،، کہلاتے تھے۔ پورے کے پورے جرگے ایک ساتھ رہتے تھے اور سارے بڑے خاندان کو کھلانے اور پہنانے کے مساوی طور پر ذمےدار ہوتے تھے۔ زمین کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ پورا قبیلہ اس کا مالک ہوتا تھا۔ مالک کے لئے اس کی آراضی پر کام کرنےوالے غلام کسان نہیں ہوتے تھے۔ یہاں سب لوگ آزاد تھے۔

صرف یہی بات یورپی لوگوں کو پریشان کرنے کےلئے کافی تھی جو جاگیردارانہ دور میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں غلام کسانوں کا عام رواج تھا۔ لیکن یہی حد نہ تھی۔

یورپ میں ہر ایک جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی ایسی چیز لےلی جو دوسرے کی ملکیت ھے تو عمال شہر اس کی گردن پکڑکر جیل میں ڈال دینگے لیکن امریکہ میں اس وقت نہ تو ایسا عملہ تھا، نہ نجی جائداد اور نہ جیل۔ پھربھی تمام چیزوں میں نظم تھا۔ لوگ خود یہ باقاعدگی رکھتے تھے حالانکہ یورپ کے مقابلے میں اس کا طریقہ مختلف تھا۔

یورپ میں قوانین اس طرح بنائے گئے تھے کہ غریب اس چیز کو قطعی نہ لے سکے جو امیر کی ملکیت ہو، کہ ملازم ہمیشہ آقا کے فرمانبردار رھیں اور غلام کسان ساری عمر اپنے جاگیرداروں کےلئے محنت مشقت کرتے رھیں۔

لیکن یہاں، امریکہ میں ہر ایک شخص کی حفاظت اس کا خاندان اور قبیلہ کرتا تھا۔ اگر کوئی آدمی مار ڈالا جاتا تو مقتول کا سارا جرگہ اس کا انتقام لیتا۔ مگر ایسا بھی ہوتا تھاکہ قتل کا معاملہ پرامن طریقے سے طے ہوجاتا تھا۔ قاتل کے رشتےدار مقتول کے عزیزداروں سے معافی کی درخواست کرتے اور ان کو اس صلح کےلئے خون بہا دیتے۔

یورپ میں شہنشاہ، بادشاہ اور شہزادے تھے۔ لیکن یہاں نہ تو بادشاہ تھے

اور نہ تخت۔ پورے قبیلے کی موجودگی میں سرداروں کی پنچایت قبیلے کے سارے معاملات طے کرتی تھی۔ سردار اپنی خوبیوں کی بنا پر چنے جاتے تھے اور اگر اپنے عہدے کے لائق نہیں ثابت ہوتے تھے تو برطرف کر دئے جاتے تھے۔ سردار قبیلے کا مالک نہیں ہوتا تھا۔ بعض انڈین زبانوں میں ''سردار'' کا لفظ محض ''مقرر'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

پرانی دنیا میں بادشاہ قوم کا سردار ہوتا تھا اور باپ خاندان کا۔ ریاست لوگوں کا سب سے بڑا جتھ تھی اور خاندان سب سے چھوٹا۔ بادشاہ اپنی رعایا کا انصاف کرتا تھا اور سزا دیتا تھا۔ باپ اپنے بچوں کا انصاف کرتا تھا اور سزا دیتا تھا۔ بادشاہ ملک کا وارث اپنے بیٹے کو بناتا تھا اور باپ اپنی جائداد بیٹے کےلئے چھوڑتا تھا۔

لیکن یہاں، نئی دنیا میں باپ کو اپنے بچوں پر کوئی اختیار نہ تھا۔ بچے ماں کے ہوتے تھے اور اسی کے پاس رہتے تھے۔ عورتیں ''لمبے مکانوں'' کا انتظام کرتی تھیں۔ یورپی خاندانوں میں بیٹے گھر پر رہتے تھے اور بیٹیاں اپنے شوہروں کے خاندانوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہاں اس کے بالکل برعکس تھا۔ بیوی شوہر کو اپنی ماں کے گھر لاتی تھی اور بیوی ہی خاندان کی سردار ہوتی تھی۔

ابتدائی دور کے ایک سیاح نے لکھا ہے ''عام طور پر عورتیں گھر کا انتظام کرتی تھیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں۔ ان کے ذخیرے مشترک ہوتے تھے۔ لیکن وہ شوہر بہت بدقسمت ہوتا تھا جو ٹھیک سے کفالت نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں اس کے چاہے جتنے بچے یا ملکیت ہوتی اس کو فوراً حکم دیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنا بوریا بسترا لپیٹے اور روانہ ہوجائے۔ اگر وہ اس پر احتجاج کرتا تو اس کو تلخ تجربہ ہوتا، اس کی زندگی اجیرن ہوجاتی۔ اگر کوئی چچی یا دادی س کی سفارش نہ کرتی تو اس کو اپنے جرگے واپس جانا پڑتا یا کسی دوسرے جرگے کی عورت سے شادی کرنا پڑتا۔ اس وقت عورتیں بہت بااختیار تھیں۔ وہ ایک لمحہ بھی تامل نہیں کرتی تھیں اگر وہ کسی سردار کی ''سینگیں اکھاڑنا'' چاہتی تھیں (جیسا کہ ان کا محاورہ تھا) اور اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ سردار نہیں رہتا تھا بلکہ قبیلے کے کسی اور فرد کی سی حیثیت اس کی بھی ہوجاتی تھی۔ اسی طرح نئے سردار کا انتخاب بھی عورتوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔''

پرانی دنیا میں عورت اپنے شوہر کی ملازمہ ہوتی تھی۔ لیکن انڈین قبیلوں میں عورت گھر کی سردار ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ قبیلے کی بھی سردار ہوجاتی تھی۔ مشہور روسی شاعر پوشکن نے ایک کہانی ایک امریکی جان ٹینر کی بابتہ لکھی تھی۔ اس امریکی کو انڈین پکڑ لیتے ہیں اور اس کو ایک انڈین عورت جس کا نام نیٹ۔نو۔کوا ہے گود لے لیتی ہے۔ یہ ایک سچا قصہ ہے۔ نیٹ۔نو۔کوا اوٹاوا قبیلے

”لمبے مکان،، کے اندر - جو آدمی ھاتھ میں پائپ لئے ہے وھی سردار ہے

کی سردار تھی اور اس کی ڈونگی پر ہمیشہ جھنڈا لہراتا تھا۔ جب وہ برطانوی قلعے کو جاتی تھی تو اس کو توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ اس طرح صرف انڈین ہی نہیں بلکہ گورے لوگ بھی اس عورت کی عزت کرتے تھے۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان خاندانوں میں شجرہ ماں کی طرف سے چلتا تھا باپ کی طرف سے نہیں۔ یورپ میں بچوں کے نام کے آخری حصہ میں باپ کا نام ہوتا تھا لیکن یہاں وہ ماں کا نام لیتے تھے۔ اگر باپ ''ہرن،، قبیلے کا ہوتا اور ماں ''ریچھ،، قبیلے کی تو بچے ''ریچھ،، قبیلے کے ہوتے۔ ہر قبیلہ عورتوں، ان کے بچوں، ان کی بیٹیوں کے بچوں اور ان کی نواسیوں کے نواسوں نواسیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

یہ سب باتیں یورپی لوگوں کےلئے بہت ہی عجوبہ تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ انڈین لوگوں کے طریقے وحشیانہ ہیں اور یہ لوگ خود بھی وحشی ہیں۔

وہ اب تک یہ بات بھول چکے تھے کہ ان کے اجداد بھی تیر کمان کے زمانے میں، پہلی ڈونگیوں اور پہلی کدالوں کے زمانے میں اسی طرح کے رسم و رواج رکھتے تھے۔

پہلے نوآبادکاروں اور فاتحوں نے اپنی تحریروں میں انڈین قبائل کے سرداروں کو نواب یا جاگیردار کی طرح پیش کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سردار کا خطاب کسی شاہی خطاب کی طرح تھا اور ان کا نشان کوئی سرکاری اعزازی نشان۔ وہ کہتے تھے کہ سرداروں کی پنچایت سینیٹ کی حیثیت رکھتی تھی اور جنگی سردار بادشاہ کی طرح ہوتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہوگی اگر ہم آجکل کسی فوج کے کمانڈر کو بادشاہ کہیں۔

صدیاں گزر گئیں لیکن امریکہ میں گورے بسنےوالوں نے وہاں کے دیسی باشندوں کے رسم ورواج نہیں سمجھے۔ یہ غلط فہمی اس وقت تک رہی جب تک ایک امریکی لیویس ایچ مورگن نے اپنی کتاب ''قدیم سماج،، کے ذریعہ امریکہ کو دوبارہ نہیں دریافت کیا۔ اس کتاب میں مصنف نے ثابت کیا کہ آزٹیک اور ایروکووئیس انڈین کا طریقۂ زندگی ارتقا کی ایسی منزل تھی جس کو یورپی لوگ مدتوں ہوئے بھول چکے ہیں۔

لیکن مورگن کی کتاب ۱۸۷۷ء میں شایع ہوئی تھی اور ہم امریکہ کے پہلے فاتحوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

گوروں نے انڈین لوگوں کو نہیں سمجھا اور انڈین لوگوں نے بھی جواباً گوروں کو نہیں سمجھا۔ انڈین لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ گورے مٹھی بھر

سونے کےلئے ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کو کیوں تیار رہتے ہیں ۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ گورے امریکہ کیوں آئے ہیں اور ''کسی اور کے علاقے کو فتح کرنے کے،، کیا معنی ہیں ۔

قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ زمین سارے قبیلے کی ہے اور اس کی حفاظت سرپرست روحیں کرتی ہیں ۔ کسی دوسرے کی زمین پر قبضہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے قبیلے کے دیوتاؤں کا عتاب مول لیا جائے ۔

انڈین بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے ۔ لیکن جب ایک قبیلے کو شکست ہوجاتی تھی تو فاتح قبیلہ لوگوں کو غلام نہیں بناتا تھا، ان کو اپنے رسم ورواج اپنانے پر مجبور نہیں کرتا تھا یا ان کے سرداروں کو برطرف نہیں کرتا تھا ۔ وہ مفتوح قبیلے سے صرف خراج وصول کرلیتے تھے ۔ کسی سردار کو صرف اس کا قبیلہ یا جرگہ برطرف کر سکتا تھا ۔

دو دنیاؤں، دو سماجی نظاموں میں ٹکر ہو گئی ۔ امریکہ کی فتح کی تاریخ دو دنیاؤں کی جدوجہد کی تاریخ ہے ۔

میکسیکو پر اسپین کے لوگوں کی فتح اس کی ایک اچھی مثال ہے ۔

میکسیکو کے انڈین pueblos میں رہتے تھے

غلطیوں کا سلسلہ

۱۵۱۹ء میں تین بادبان‌والے گیارہ جہازوں کا بیڑا میکسیکو کے ساحل پر نمودار ہوا۔ جہازوں کے پہلو گول پیپوں کی طرح تھے۔ ان کے اگلے اور پچھلے حصے پانی سے بہت اونچے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور چوکور سوراخوں سے توپوں کے دھانے باہر نکلے تھے۔ پہلوؤں میں سپاہیوں کے نیزے اور بندوقیں چمک رہی تھیں۔ علمبردار جہاز کے اگلے حصے پر ایک چوڑے شانوں اور داڑھی‌والا آدمی ٹوپی آنکھوں تک گھسیٹے کھڑا تھا۔ اس کی تیز آنکھیں ہموار ساحل اور ان نیم عریاں انڈین لوگوں کو گھور رہی تھیں جو کنارے جمع ہو گئے تھے۔

اس آدمی کا نام کورٹیز تھا۔ یہ اس مہم کا سربراہ تھا جو اسپین سے میکسیکو کو فتح کرنے کےلئے بھیجی گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ایک خط اس کو مل چکا تھا جس میں اسپین کے گورنر نے اس کی تقرری کو منسوخ کر دیا تھا لیکن کورٹیز جیسے مہم‌باز کےلئے یہ برخاستگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اب اسپین اور اس کے درمیان ایک زبردست سمندر حائل تھا۔ یہاں وہ اپنے جہازوں کا بادشاہ تھا۔

جہازوں نے لنگر ڈالا۔ انڈین غلام جن کو کورٹیز نے راستے میں جزیروں میں گرفتار کرلیا تھا توپیں، توپوں کی گاڑیاں، کھانے‌پینے کے سامان کے بکس اور بندوقیں کشتیوں میں اتارنے لگے۔ نیچے تہہ‌خانے سے گھوڑے لائے جانے لگے جو ڈرکر الف ہو رہے تھے۔ ان کو کشتیوں پر لانا اور پھر کنارے تک پہنچانا بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔

انڈین ان تیرتے ہوئے مکانوں اور گورے چہرے‌والے آدمیوں اور ان کے اسلحہ کو حیرت سے تک رہے تھے جو اپنے جسم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لیکن ان کو سب سے زیادہ حیرت ان پھنکارتے ہوئے جانوروں پر تھی جن کے ایال اور دمیں اوپر اٹھی اڑ رہی تھیں۔ انھوں نے ایسے وحشی اور بڑے جانور کبھی نہیں دیکھے تھے۔

گوروں کی آمد کی خبر جلد ھی سارے ساحل اور خاص ملک میں پہاڑوں تک پھیل گئی۔ بلند پہاڑوں کی دیوار کے پیچھے وھاں pueblos یعنی آزٹیک لوگوں کے گاؤں تھے۔ تینوخ‌تیتلان ان میں سب سے بڑا گاؤں تھا۔ یہ ایک جھیل کے بیچوں‌بیچ واقع تھا اور پلوں کے ذریعہ خشکی سے ملایا گیا تھا۔ اس کے چمکتے، سفیدی کئے ہوئے گھر اور مندروں کی سنہری چھتیں دور سے نظر آتی تھیں۔ مونٹے‌زوما جو آزٹیک لوگوں کا جنگی سردار تھا اپنے سپاہیوں کے ساتھ سب سے بڑے مکان میں رہتا تھا۔

تینوخ تیتلان کا نقشہ

جب گوروں کی آمد کی خبر مونٹے زوما کو ہوئی تو اس نے جنگی کونسل کا جلسہ طلب کیا۔ سرداروں نے دیر تک اس بات پر غور کیا کہ کیا کیا جائے۔ وہ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ آخر یہ گورے ان کے ملک کو کیوں آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔

سرداروں نے یہ افواہ سنی تھی کہ گوروں کو سونا بہت پسند ہے۔ اسلئے کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ گوروں کو سونا بطور تحفہ بھیجا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے ملک کو واپس جائیں۔

یہ زبردست غلطی تھی۔ سونا گوروں کو لالچ سے پاگل ھی بنا سکتا تھا۔ لیکن آزٹیک لوگوں کو نہ تو اس کا پتہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ انڈین اور گورے لوگ مختلف دوروں کے لوگ تھے۔

مونٹےزوما نے اپنے سفیروں کو سونے کی ایسی پلیٹوں کا تحفہ دے کر بھیجا جو گاڑیوں کے پہیوں کے برابر تھیں۔ ان کے علاوہ سونے کے زیورات اور مورتیاں بھی تھیں۔ اس سے کہیں زیادہ عقلمندی کی بات یہ ہوتی کہ اس خزانے کو دفن کردیتے۔

جب کورٹیز اور اس کے سپاھیوں نے یہ سونا دیکھا تو گویا آزٹیک لوگوں کی قسمت پر مہر لگ گئی۔

کورٹیز کے پاس سفیروں کی تحفوں کے ساتھ حاضری (میکسیکو کی ڈرائنگ)
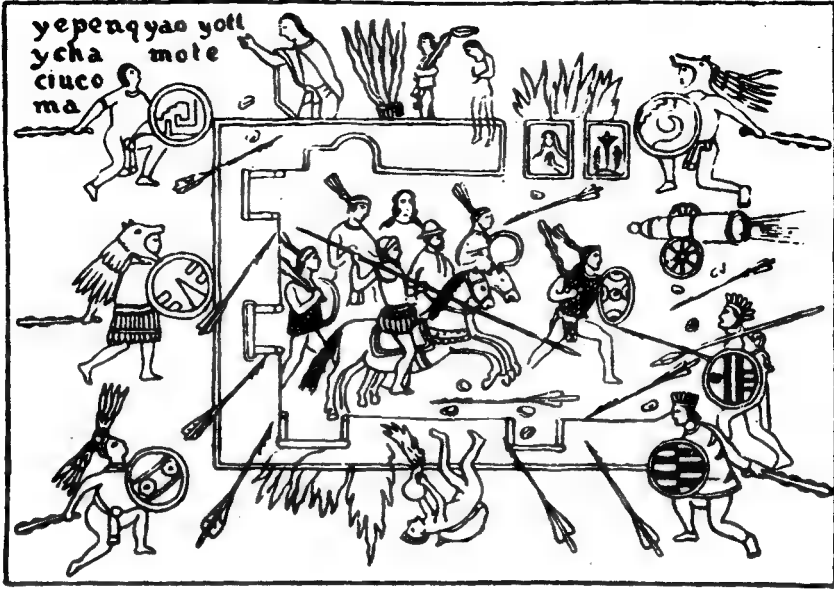
مونٹےزوما نے مکان کی چھت پر کھڑے ہوکر آزٹیک لوگوں کو خطاب کیا
(اس دور کی ڈرائنگ)

سفیروں کی یہ تمام التجائیں بےسود ثابت ہوئیں کہ ہسپانوی سمندر پار لوٹ جائیں، انھوں نے ان ناخوانده مہمانوں کو ان مشکلات اور خطرات سے بےسود ڈرانے کی کوشش کی جو ملک کے اندر کے سفر میں ان کو پیش آنےوالی تھیں۔

پہلے تو ہسپانوی لوگوں نے میکسیکو کے سونے کی کہانیاں سنی تھیں لیکن اب تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں لالچ سے چمکنے لگیں کیونکہ یہ کہانیاں سچی تھیں۔

سفیروں کی باتیں ان کو احمقانہ معلوم ہوئیں۔ جب ان کی منزل اتنی قریب تھی تو انھیں سمندر پار کیوں واپس جانا چاہئے! یہ تو پاگل پن ہوتا کیونکہ انھوں نے طویل بحری سفر کے دوران بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں! انھوں نے پتھر جیسے سخت بسکٹ کھائے تھے، ریل پیل والی کیبنوں میں چوبی تختوں پر سوئے تھے اور طوفانوں اور سمندر کے اندر پہاڑی چٹانوں سے بچاؤ کےلئے تارکول سے لتھڑے ہوئے رسوں پر کمرتوڑ کام کیا تھا۔ یہ سب اسیلئے تو تھا کہ آگے چل کر دولت ملےگی۔

کورٹیز نے حکم دےدیا کہ پڑاؤ اٹھایا جائے اور آگے روانگی ہو ۔ انھوں نے اپنے غلاموں کی پیٹھوں پر اپنے اسلحہ اور کھانے پینے کا سامان لاددیا اور یہ آدمی جو باربرداری کا جانور بنائے گئے تھے ھانپتے کانپتے، آہوزاری کرتے روانہ ہوگئے۔ لیکن وہ مزاحمت بھی کیا کر سکتے تھے؟ ان میں جو پیچھے رہجاتے ان کو گوروں کی تلواریں کچوکے دےکر آگے بڑھاتیں اور جو مزاحمت کرتے ان کے سر دھڑ سے الگ کر دئے جاتے۔

ایک آزٹیک ڈرائنگ ملی ہے جس میں اس سفر کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لنگوٹیاں باندھے ہوئے آدمی تین راستوں پر سفر کر رہے ہیں۔ ایک آدمی توپ‌گاڑی کا پہیہ اپنی پیٹھ پر لادے ہے اور دوسرا بندوقوں کا بنڈل، تیسرے کی پیٹھ پر کھانے پینے کے سامان کا ایک بڑا بکس ہے۔ ایک ھسپانوی افسر اپنا ڈنڈا ایک انڈین کے سر پر اٹھائے ہے۔ اس نے انڈین کے بال پکڑ لئے ہیں اور اس کے پیٹ پر لاتیں مار رہا ہے۔ قریب ہی ایک پہاڑی پر حضرت عیسی کی مصلوب تصویر ہے۔

فاتح اپنے کو ''نیک کیتھولیک،، سمجھتے تھے اور اپنے ساتھ مفتوح ملکوں کو صلیب لے جاتے تھے۔

ڈرائنگ میں انڈین لوگوں کے کٹے ہوئے سر اور ھاتھ پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس طرح پہلی بار آزاد انڈین لوگوں نے جانا کہ انسان کے ھاتھ انسان کی غلامی کیسی ہوتی ہے۔

آہستہ آہستہ لیکن استقلال کے ساتھ ھسپانوی آگے بڑھتے گئے۔ اور پھر ایک اونچے پہاڑی درے سے انھوں نے ایک جھیل اور اس کے بیچ میں ایک شہر دیکھا۔

چونکہ آزٹیک لوگوں نے مزاحمت نہیں کی اسلئے ''مہمان،، شہر میں داخل ہوگئے۔ اور پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ اپنے میزبان جنگی سردار مونٹےزوما کی گرفتاری تھی۔

کورٹیز کے حکم سے مونٹےزوما کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ کورٹیز نے مطالبہ کیا کہ قیدی شاہ اسپین سے وفاداری کا عہد کرے۔ قیدی نے بڑی فرماں‌برداری سے وہ الفاظ دھرائے جو اس سے کہے گئے تھے۔ اس کو نہ تو یہ پتہ تھا کہ بادشاہ کیا ہوتا ہے اور نہ حلف کی اہمیت معلوم تھی۔

کورٹیز نے خیال کیا کہ اس کی جیت ہوگئی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس نے میکسیکو کے بادشاہ کو قید کرلیا ہے اور چونکہ قیدی بادشاہ نے اپنی حکومت شاہ اسپین کے سپرد کردی ہے اسلئے سب کچھ ٹھیک ہے۔ یہ تھا کورٹیز کا خیال۔ لیکن اس نے بڑی غلطی کی تھی۔ میکسیکو کے طریقوں سے ایسے ہی ناواقف تھا

جیسے مونٹےزوما ہسپانوی طریقوں سے۔ کورٹیز نے سوچا کہ مونٹےزوما بادشاہ ہے حالانکہ وہ محض جنگی سردار تھا جس کو اپنے ملک پر حکومت کا کوئی اختیار نہ تھا۔

کورٹیز نے اپنی فتح کی خوشی منانے میں ذرا عجلت سے کام لیا۔

اب آزٹیک لوگوں نے وہ اقدام کیا جس کی کورٹیز کو کبھی توقع نہ تھی۔ انھوں نے مونٹےزوما کے بھائی کو نیا سردار منتخب کرلیا۔ نئے سردار نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس بڑے گھر پر حملے کی رہنمائی کی جس میں ہسپانوی ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہسپانوی توپوں اور بندوقوں سے لڑے۔ آزٹیک لوگوں کے اسلحہ پتھر، تیر اور کمان تھے۔

ہسپانوی انڈین لوگوں کو قیدی بنا کر لئے جا رہے ہیں

توپ کا گولا اور بندوق کی گولی تیر اور پتھر سے کہیں زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ لیکن آزٹیک لوگ تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے اور وہ رکنے والے نہ تھے۔ اگر دس مرکر گرتے تو سو ان کی جگہ لے لیتے۔ بھائی بھائی کا بدلہ لیتا، چچا بھتیجے کا۔ کوئی موت سے ڈر نہیں رہا تھا۔ کسی آزٹیک کے لئے زندگی کوئی چیز نہ تھی جب اس کا جرگہ اور قبیلہ خطرے میں ہو۔

جب کورٹیز نے حالت گڑبڑ دیکھی تو اس نے آزٹیک لوگوں سے بات‌چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ مونٹے‌زوما اس کے لئے سب سے بہتر ثالثی ہوگا کیونکہ وہ تو میکسیکو کا بادشاہ ہے۔ اس نے مونٹے‌زوما سے کہا کہ وہ اپنے لوگوں کو ہتیار ڈال دینے کا حکم دے۔

ہسپانوی لوگوں نے اس کی زنجیریں کھول دیں اور اس کو ایک مکان کی ہموار چھت پر لے جایا گیا۔ لیکن لوگوں نے اس کا سواگت بزدل اور غدار کی طرح کیا۔ اس پر پتھروں اور تیروں کی بارش ہوئی۔ ہر طرف سے شور ہوا:

''چپ رہ، پاجی! تو سپاہی نہیں ہے! تو عورت ہے۔ تیرا کام بنائی کتائی کرنا ہے! تو ان کتوں کی قید میں ہے! تو بزدل ہے!،،

مونٹے‌زوما سخت زخمی ہوکر گر پڑا۔

کورٹیز بڑی مشکل سے حملہ‌آوروں کی صفوں کو توڑ سکا۔ اس کے آدھے آدمی مارے جا چکے تھے۔ خوش‌قسمتی سے آزٹیکوں نے اس کا پیچھا نہیں کیا ورنہ وہ تینوخ تیتلان سے زندہ بچکر نہ جاتا۔ لیکن آزٹیکوں نے یہ بڑی غلطی کی کہ اس کو نکل جانے دیا کیونکہ کورٹیز نے ایک اور فوج اکٹھا کرکے تینوخ‌تیتلان کا محاصرہ کرلیا۔

آزٹیک لوگ بہادری سے لڑے اور انھوں نے ہسپانوی لوگوں کے خلاف کئی مہینے تک اپنے شہر کا دفاع کیا۔ لیکن ان کے تیر اور کمان توپوں کے خلاف کیا کرتے؟ تینوخ‌تیتلان بالآخر فتح کرکے لوٹ لیا گیا۔

لوہے کے زمانے کے لوگوں نے تانبے کے زمانے کے لوگوں پر فتح پائی۔ ترقی یافتہ نئے نظام کے مقابلے میں پرانے برادری کے نظام کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

گیارھواں باب

جادو کے جوتے

انیسویں صدی کی ایک کہانی ہے جس میں ایک نوجوان کے ھاتھ معمولی جوتوں کے بجائے جادو کے جوتوں کا جوڑا آگیا۔ یہ نوجوان ذرا کھویا رہتا تھا اسلئے اس کو جوتوں کی خوبی کا فوراً پتہ نہیں چلا۔ وہ میلے سے گھر آ رہا تھا اور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کو سخت سردی لگی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تو وہ برف سے گھرا ہوا تھا اور دھندلا لال سورج افق کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک قدم میں سات میل چلنےوالے ان جادو کے جوتوں کے ذریعہ وہ جانے بغیر دائرہ قطب شمالی میں پہنچ گیا۔

کوئی اور ہوتا تو وہ اس جادو کی چیز سے بڑے کام لیتا۔ لیکن اس کہانی کے نوجوان کو دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کو سائنس سے دلچسپی تھی۔ اسلئے اس نے اپنی خوش قسمتی سے فائدہ اٹھانے کےلئے ساری دنیا دیکھنے اور امکان بھر سب کچھ سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے جادو کے جوتوں کے ذریعہ دنیا بھر میں شمال سے جنوب تک اور جنوب سے شمال تک بھاگتا دوڑتا۔ سردیوں میں وہ سائبیریائی تائیگا کے جاڑے سے بھاگ کر افریقی ریگستان کی گرمی میں چلاجاتا اور رات میں وہ مشرقی نصف کرے سے مغرب میں آجاتا۔

وہ اپنی پھٹی پرانی سیاہ جیکٹ پہنے اور چیزیں جمع کرنے کےلئے ایک تھیلا کاندھے پر لٹکائے ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر اس طرح کودجاتا جیسے وہ پانی سے نکلے قدم رکھنے کے پتھر ہوں اور اس طرح وہ آسٹریلیا سے ایشیا اور ایشیا سے امریکہ پہنچتا۔

آسانی سے ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر، دھکتے ہوئے آتش‌فشانوں سے برف‌پوش چوٹیوں پر قدم رکھتے ہوئے معدنیات اور جڑی‌بوٹیاں جمع کرتا، قدیم مندروں اور غاروں کا جائزہ لیتا، زمین اور اس کی ہر جاندار چیز کا مطالعہ کرتا۔
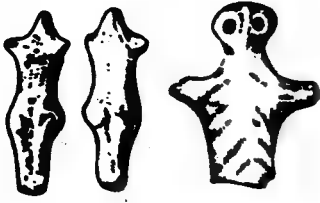
مٹی کی مورتیاں جو چولھے کی نگراں، عورت
کو پیش کرتی ھیں (پتھر کا دور)

اس مؤرخ کو بھی جو آدمی کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے ایسے جادو کے جوتوں کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کے صفحات کے ذریعہ ھم ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک، ایک دور سے دوسرے دور تک گئے ھیں۔

کبھی کبھی تو ھم نے اتنے بڑے بڑے فاصلے تیزی سے طے کئے ھیں اور وقت نے اتنی تیزی سے پرواز کی ہے کہ ھمارا سر چکرا گیا۔ لیکن ھم چلتے رہے، رکے نہیں۔ ھم راستے میں رک کر تمام تفصیلات کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے جیسا کہ عام جوتے پہننے والے لوگ کرتے ھیں۔

صدیوں کی چھلانگیں لگانے میں شاید ھم بعض چیزوں کو نظرانداز کر گئے۔ لیکن اگر ھم اپنے جادو کے جوتے ذرا دیر کے لئے بھی اتار دیتے اور عام رفتار سے چلتے تو ھم تمام تفصیلات میں الجھ کر اپنا راستہ صاف نہ دیکھ سکتے۔ اگر تم جنگل کے ھر درخت کا تفصیل سے مطالعہ کرو تو تمھیں پتہ چلے گا کہ تم درختوں کی وجہ سے جنگل نہیں دیکھ سکتے ھو۔

ھم صرف ایک دور سے دوسرے دور تک ھی نہیں گئے بلکہ اپنے جادو کے جوتوں کی وجہ سے طرح طرح کی سائنسوں تک بھی ھماری پہنچ ھوگئی۔

ھم پودوں اور جانوروں کی سائنس سے زبان کی سائنس تک، زبان کی سائنس سے اوزاروں کی تاریخ تک، اوزاروں کی تاریخ سے عقیدوں کی تاریخ تک اور مذھبوں کی تاریخ سے زمین کی تاریخ تک پہنچے۔

یہ کوئی معمولی کام نہ تھا۔ انسان نے سائنس کو اپنی خدمت کے لئے بنایا ہے اور جب ھم زمین پر آدمی کی زندگی، دنیا میں اس کے مقام کے بارے میں بات کرتے ھیں تو تمام سائنسیں ضروری ھوتی ھیں۔

ھم ابھی ابھی ھسپانوی فتوحات کے زمانے میں امریکہ میں تھے۔

آؤ، اب ھم چار ھزار سال سے تین ھزار سال قبل مسیح تک والے یورپ کو واپس چلیں۔ ھم یہاں بھی ایروکوئیس اور آزٹیک قسم کے قبائل پائیں گے۔ ھمیں یہاں بھی برادری کا ”لمبا مکان“ ملے گا جہاں عورتیں سب انتظام کرتی ھیں۔

یہاں عورتوں کی عزت ہوتی ہے کیونکہ وہ گھروں کی بنانےوالی اور جرگے کی بانی ہیں۔ عورتیں جاڑوں کےلئے غذا کے ذخیرے کرتی ہیں، وہ زمین گوڑتی ہیں، فصل بوتی اور کاٹتی ہیں۔

عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ کام کرتی ہیں لیکن عورتوں کی عزت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر گاؤں، ہر گھر میں عورت کی پتھر یا ہڈی کی مورتی ہوتی ہے جو جرگے کی ماں کی نشانی ہے۔ لوگ اس کے سامنے دعا کرتے ہیں، اس سے بافراط فصل کی التجا کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں سے پناہ چاہتے ہیں۔

صدیاں گزرنے کے بعد یہ گھر کی محافظ ماں یونان کے شہر ایتھنز آئی اور یونانی دیوی ایتھینا بن گئی۔ وہ شہر کی محافظ تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔ اب ایتھنز میں عورت کی چھوٹی سی مورتی نہیں بلکہ اس دیوی کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا جو اپنے نام کے شہر کی محافظ تھی۔

شہر کی محافظ دیوی ایتھینا

پرانی عمارت میں پہلی دراڑیں

ہماری زبانوں میں اب بھی پرانے زمانے کے برادری والے طریقۂ زندگی کی باقیات پائی جاتی ہیں حالانکہ اب ہماری یاد میں اس کا کچھ بھی نہیں باقی رہ گیا ہے۔

جب روس میں بچے اجنبیوں کو ”چچی،، یا ”چچا،، یا بزرگ اجنبیوں کو ”دادا،، یا ”دادی،، کہتے ہیں تو یہ بات اس سماج کی باقیات میں سے ہے جس میں جرگے کے تمام ممبر ایک دوسرے کے رشتےدار ہوتے تھے۔

اکثر ہم آدمیوں کے کسی جتھے کو خطاب کرتے ہوئے ”بھائی،، کہتے ہیں یا کسی چھوٹے لڑکے کو جو ہمارا بیٹا نہیں ہوتا ”بیٹا،، کہہ کر پکارتے ہیں۔

دوسری زبانوں میں بھی ماضی کی ایسی باقیات ھیں۔ جرمن زبان میں ''میری بھانجیاں اور بھانجے'' کہنے کے بجائے ''میری بہن کے بچے'' کہتے ھیں کیونکہ اس زمانے میں جو بہت دن ھوئے بھلایا جا چکا ھے بہن کے بچے جرگے میں ھی رھتے تھے اور بھائی کے بچے اس کی بیوی کے جرگے کے ھوتے تھے۔ بہن کے بچے رشتے دار ھوتے تھے اور بھائی کے بچے ایسے نہیں ھوتے تھے کیونکہ وہ دوسرے جرگے کے ھوتے تھے۔

سیکسے کی قدیم ریاست میں بادشاہ کا وارث اس کی بہن کا بیٹا ھوتا تھا اپنا بیٹا نہیں۔

ابھی پچھلی صدی تک افریقہ میں آشانتی ریاست تھی جس کا بادشاہ ''نانے'' کہلاتا تھا۔ اس لفظ کے معنی ھیں ''ماؤں کی ماں''۔

وسط ایشیا میں سمرقند میں بادشاہ کو ''افشین'' کہتے تھے۔ قدیم زمانے میں اس کے معنی ھوتے تھے ''گھر کی مالکہ یا رانی''۔

ھمیں بہت سی ایسی مثالیں مل سکتی ھیں کہ لوگوں کے ذھن میں کس طرح مادری سماج کی، جہاں ماں گھر کی مالکہ اور گھر کی رانی ھوتی تھی، یاد باقی رہ گئی۔

اگر لوگوں کے ذھن میں یہ یاد اتنے دن تک باقی رھی تو اس کا مطلب یہ ھوا کہ جرگہ بہت مضبوط ھوتا تھا۔ لیکن اس کو کس نے تباہ کردیا؟

امریکہ میں تو یہ یورپی فاتحوں کی آمد کے ساتھ تباہ ھوا اور یورپ میں، امریکہ کی دریافت سے ھزاروں سال پہلے، وہ خود سے ڈھیر ھوگیا، اس گھر کی طرح جس کو دیمک کھا جاتی ھے۔

اس کی ابتدا اس طرح ھوئی کہ مرد جرگے کے کام زیادہ سے زیادہ اپنے ھاتھ میں لینے لگے۔

ابتدا سے عورتیں زمین کاشت کرتی تھیں اور مرد گلہ‌بانی کرتے تھے۔ جب گلے بہت چھوٹے ھوتے تھے اس وقت تک عورتوں کا، زمین کاشت کرنے والیوں کا کام سب سے اھم تھا۔ گوشت اور دودھ سب کےلئے کافی نہیں ھوتا تھا۔ اگر عورتیں اناج جمع نہ کرتیں اور فصل نہ پیدا کرتیں تو کھانے کو کچھ نہ رہ جاتا۔ کبھی کبھی تو مٹھی بھر خشک اناج یا جو کی ایک روٹی ھی پورا کھانا ھوتی تھی۔ اس میں جنگلی شہد یا بیریوں کا اضافہ ھوا۔ یہ بھی اناج کی طرح عورتیں ھی جمع کرتی تھیں۔ عورتیں گھر کا انتظام کرتی تھیں اور اسی لئے وہ حاکم بھی تھیں۔

لیکن یہ صورت ھمیشہ نہیں ھوتی تھی۔ استیپی میدانوں میں اناج اگانا آسان نہ تھا۔ میدانوں کی گھاسیں اناج کو اپنی جگہ نہیں دینا چاھتی تھیں۔ انھوں نے

اپنی جڑیں زمین میں بہت گہرے تک پہنچا دی تھیں۔ اور جب کدال سے زمین گوڑی جاتی تو اس کو اوپری پرت نرم نہ ملتی بلکہ ٹھوس گھاس اور اچھوتی زمین اس کو روکتی جو بہت سخت تھی۔

اسلئے تین چار عورتیں ملکر کدال کو چلاتی تھیں پھر بھی وہ سطح کو ہی کرید پاتی۔

اتھلے کونڑوں میں بوئے ہوئے بیجوں کو سخت دھوپ سکھا دیتی یا چڑیاں چن لیتیں۔ نئے پودوں کی کونپلیں دور دور اور چند ہی دکھائی دیتیں۔ پھر خشک سالی بھی کھیت میں اپنے کرتوت دکھاتی۔ وہ نازک اناج کے پودوں کو جلا دیتی اور مضبوط اور سخت جان گھاس پھوس باقی رہ جاتے۔

جب فصل کی کٹائی کا وقت آتا تو عورتوں کے پاس کام ہی نہ ہوتا۔ لمبی لمبی گھاس میں مشکل سے ہی کوئی اناج کی بالی نظر آتی۔ استیپی میدان کی گھاسیں پھر دشمن کی اس فوج کے نشانوں کی طرح لہراتیں جس کو ہرادیا گیا لیکن وہ پھر جیتنے کے لئے آگئی ہو۔

اناج کے بجائے گھاس پھوس! کیا اسی کےلئے ساری مصیبت اور کمرتوڑ کام کیا گیا تھا؟

لیکن آدمی کےلئے جو گھاس پھوس ہے وہی مویشیوں کےلئے چارہ ہے۔ میدانوں میں گایوں اور بھیڑوں کی زندگی اچھی تھی۔ ہر ہر قدم پر ان کےلئے دسترخوان بچھا تھا۔

سال بسال گلوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جرگے کے آدمی اپنی پیٹیوں میں خنجر ڈالے ان کے ساتھ ساتھ ہوتے۔ گلہ‌بان کا بہترین دوست، اس کا کتا گلے کو
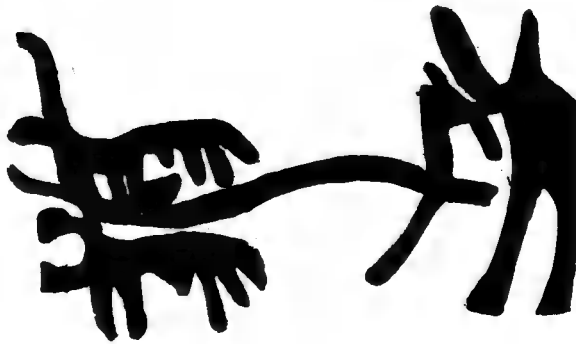
سویڈن کی ایک پہاڑی پر ہل کش کی ڈرائنگ

منتشر نہ ہونے دیتا اور اس کو یکجا رکھتا۔ گلے اور زیادہ تیزی سے بڑھتے گئے۔ ان سے لوگوں کو سال بسال زیادہ دودھ، گوشت اور اون ملنے لگا۔

اب گھر میں کافی اناج تو نہیں ہوتا تھا لیکن بھیڑ کے دودھ سے بنے ہوئے پنیر کی افراط تھی اور بھیڑ کا گوشت ہانڈیوں میں ابلتا رہتا تھا۔

استیپی میدانوں میں مرد کا کام، گلہ‌بانی کا کام زیادہ اہم ہوگیا۔

جلد ہی شمالی جنگلوں میں بھی مرد نے جرگے کی سربراہی شروع کردی۔

سویڈن میں ایک چٹان پر ایک ہل‌کشی کرنے‌والے کی قدیم ڈرائنگ پائی گئی ہے۔ یہ ڈرائنگ بڑی بھدی اور بری طرح بنائی گئی ہے اور یہ ہل‌کش ان لوگوں کی تصویروں کی طرح ہے جو بچے بناتے ہیں۔ لیکن ہم اس تصویر کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنائی گئی ہے کیونکہ ہم اس کو گواہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں ڈرائنگ کی طرح نہیں۔ یہ گواہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ہل‌کش اس ہل کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے جس کو بیلوں کی جوڑی کھینچ رہی ہے۔

غالباً تاریخ انسانی میں یہ پہلا ہل تھا۔ یہ بہت کچھ کدال سے ملتا جلتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس میں بیل جتے ہیں، آدمی اس کو نہیں کھینچ رہے ہیں۔

اس طرح آدمی نے اپنا پہلا ''موٹر،، دریافت کیا۔ ہل میں جتا ہوا بیل یقیناً ایک زندہ موٹر ہے، ہمارے فولادی ٹریکٹر کا زندہ جدامجد۔ جب آدمی نے بیل کی گردن پر جوا رکھا تو اس نے اپنا بوجھ جانور کی طرف منتقل کردیا۔ اس طرح مویشی جو اس کو گوشت، دودھ اور چمڑا دیتے تھے اب اس کو قوت بھی دینے لگے۔

سست رفتار لیکن طاقتور بیلوں نے چوبی جوے اپنی گردنوں پر رکھ کر پہلے چوبی ہل کھینچنا شروع کئے۔ یہ ہل کدالوں کے مقابلے میں زمین کو زیادہ گہرائی تک کھودنے لگے۔ اب جوتی ہوئی زمین ایک سیاہ فیتے کی طرح ہل کے پیچھے پھیلنے لگی۔

پہلا ہل‌کش ہل کے دستے کو اپنی پوری طاقت سے دباتا تھا۔ اب بیل نے اس کا بوجھ سنبھال لیا۔ وہ جوتتا، اناج گاہتا اور اس کو گھر پہنچاتا۔ خزاں میں بیل کھلیان جاکر اپنے کھروں سے اناج گاہتے۔ پھر وہ ایک گاڑی میں جوتے جاتے اور اناج سے لدے ہوئے بورے کھیت سے گھر پہنچاتے۔

مویشی پالن زراعت میں اضافہ کرتا۔ اب گلہ‌بان ہل‌کش بھی ہوگیا اور اس طرح اس کو گھر میں اور زیادہ اختیارات حاصل ہوگئے۔

یہ سچ ہے کہ عورتوں کے پاس کام کا کافی حصہ تھا۔ وہ کتائی بنائی کرتیں، فصل کاٹتیں اور بچوں کی پرورش کرتیں۔

لیکن ان کے پہلے جیسے اختیارات نہیں رہے تھے اور نہ وہ عزت تھی۔ اب مرد چراگاہوں اور کھیتوں دونوں کا مالک تھا۔

اب گھروں میں عورتیں مردوں پر غصہ نہیں دکھاتی تھیں جیسے پہلے ہوتا تھا۔ اور اب مرد بھی اپنی صفائی دینے کے بجائے برابر سے جواب دینے لگے تھے۔ پہلے ساسوں، خالاؤں اور نانیوں کےلئے مرد کو گھر سے نکال باہر کرنا بہت آسان تھا لیکن اب انھوں نے اس کی دیکھ بھال شروع کردی۔ کیونکہ یہ اجنبی جو دوسرے جرگے کا ہوتا تھا اور ان کے خاندان میں شادی کرتا تھا سب کےلئے کام کرتا تھا اور پورے جرگے کو کھانا فراہم کرنے میں مدد دیتا تھا۔ اب لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے مرد دوسرے جرگوں میں جائیں۔

جرگوں پر اختیارات حاصل کرنے کےلئے مردوں نے آپس میں فوجی معاہدے شروع کردئیے۔

پہلے جب کوئی آدمی مرتا تھا تو اس کی بہن کے بچے اس کے جائز وارث ہوتے تھے۔ اب مردوں نے یہ قبائلی قانون بدلنے کی کوشش کی۔

توآریگ قبیلے کے خانہ‌بدوش افریقیوں کے درمیان وراثت کی تقسیم ''جائز،، اور ''ناجائز،، حصوں میں ہوتی تھی۔ وراثت کا ''جائز،، حصہ بہن کے بچوں کو
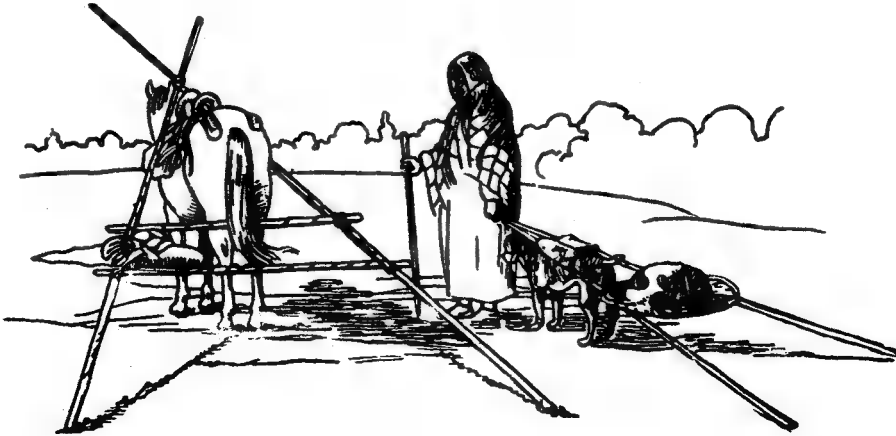
کناڈا کے انڈین لوگوں کی گھوڑاگاڑی
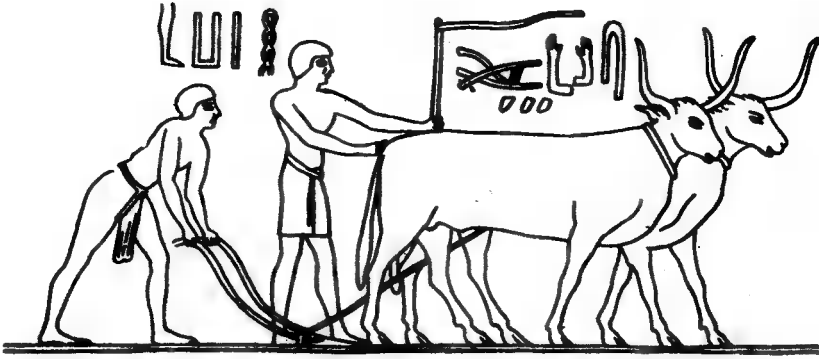
ہل میں بیل جوتے جانے لگے (مصری ڈرائنگ)

ملتا تھا اور اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہوتی تھیں جو متوفی کو اپنی ماں سے ملتی تھیں اور وہ سب کچھ جو اس نے مشترک گھر میں کام کرکے کمایا تھا۔ ''ناجائز'' حصے میں جنگ کی حاصلات اور تجارت کی کمائی ہوتی تھی۔ یہ متوفی کے اپنے بچوں کو ملتی تھی۔

مادری سماج ہزاروں سال تک رہا۔ پھر پرانے طریقۂ زندگی میں دراڑیں پڑنے لگیں جیسے کسی پرانے شاہبلوط میں پڑ جاتی ہیں۔

جرگے کے لوگ روزافزوں پرانے طریقوں کی مخالفت کرنے لگے۔ پہلے بیوی شوہر کو اپنے خاندان میں ملاتی تھی۔ اب شوہر بیوی کو اپنے گھر لانے لگا۔

چونکہ یہ پرانے طریقے کے خلاف تھا اسلئے رواج کے خلاف کرنےوالے کو مجرم سمجھا جانے لگا۔

کوئی نوجوان کسی جرگے سے بیوی کو لے کر آسانی سے نہیں جا سکتا تھا۔ اس کو لڑکی کو چرانا یا اغوا کرکے لانا پڑتا تھا۔

آدھی رات کو نوجوان اور اس کے مرد رشتےدار برچھوں اور خنجروں سے مسلح ہوکر اس لڑکی کے گھر کی طرف چپکے سے جاتے جس کو جرگے نے نوجوان کی بیوی کی حیثیت سے منتخب کیا ہوتا۔ کتے بھونک بھونک کر سارے گھر کو جگا دیتے۔ دولھن کے سفید بالوں والے نانا دادا اور جوان بھائی اپنے ہتیار سنبھال لیتے، مردوں کے جنگی نعروں میں عورتوں کی رونے پیٹنے کی آواز ڈوب جاتی۔ آخرکار دولھا اپنے جرگےوالوں کی حفاظت میں اپنی لوٹ یعنی دولھن کو لیکر لوٹتا۔

وقت گزرتا گیا اور پھر قبائلی قانون کی یہ خلاف‌ورزی ایک قبائلی رواج بن گئی۔ اب دولہا دولہن کے رشتے داروں کے درمیان یہ ''لڑائی،، ایک مذہبی رسم بنکر رہ گئی۔

ماردھاڑ کی جگہ تحفوں اور چڑھاوے نے لےلی۔ دولہن کی روتی ہوئی ماں، بہنیں اور سہیلیاں بھی اس رسم میں حصہ لینے لگیں جس کا خاتمہ دعوت پر ہونے لگا۔

اب بھی ایسے لوگ ھیں جن کو وہ قدیم، غمگین گیت یاد ھیں جن میں نوجوان دولہن ایک اجنبی جرگے اور اجنبی گھر میں آکر اپنی قسمت کو روتی ھے۔

اور اس کی قسمت بھی کوئی قابل رشک نہ تھی۔ اجنبی گھر میں نوجوان عورت بالکل اپنے شوہر کے رحم وکرم پر ہوتی تھی۔ وہ کسی سے بھی اپنی تکلیفوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ اس کے ساس سسر اور شوہر کے سب رشتےدار تو ہمیشہ شوہر ھی کی طرفداری کرتے تھے۔ جب کوئی مرد اپنے گھر دولہن لاتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ خاندان میں ایک اور کام کرنےوالے کا اضافہ ہوا اور ہر شخص اس بات کی نگرانی کرتا تھا کہ وہ ایک لمحہ بیکار نہ بیٹھے یا وہ اپنے حصے سے ایک لقمہ بھی زیادہ نہ کھائے۔ اب خاندان جہاں ماں کی ہر چیز پر حکومت ہوتی تھی ایسا خاندان بن گیا جہاں باپ ہر چیز کو کنٹرول کرتا تھا۔

اب بچے ماں کے خاندان کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ وہ اپنے باپ کے خاندان کے ساتھ رہنے لگے اور رشتےداری کا تعین بھی ماں کے خاندان سے نہیں بلکہ باپ کے خاندان سے ہونے لگا۔ روس میں ناموں میں ''ابن،، کا اضافہ ہوا یعنی نام میں یہ جوڑا جانے لگا کہ کوئی شخص کس باپ کا بیٹا ھے۔

یہی باپوں کے نام کے استعمال کا سبب ہوا اور اسی وجہ سے ہم لوگوں کو اس طرح پکارنے لگے مثلاً ''پیوتر ایوانوویچ،،۔ پرانے زمانے میں اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ پیوتر ابن ایوان۔

کوئی شخص اپنے نام میں اپنی ماں کا نام اضافہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچتا تھا مثلاً کوئی ''پیوتر ماریاویچ،، نہیں کہلاتا تھا۔

پہلے خانہ‌بدوش

آدمی نے جو حیرت‌انگیز گودام دریافت کیا تھا اس سے اس کو اور زیادہ تحفے ملتے گئے۔ استیپی میدانوں میں ہزاروں بھیڑیں چرتی تھیں۔ کھیتوں میں نرم، سیاہ مٹی کو جوتتے ہوئے ہل‌کش اپنے بیلوں کو شورمچامچا کر ھانکتا تھا۔

زرخیز وادی میں پہلے باغات اور انگوروں کے چمن پھول پھل رہے تھے اور شام کو لوگ انجیر کے درختوں کے نیچے جمع ہوکر بات‌چیت کرتے تھے۔

آدمی کی محنت نے اس کو بہت سی نعمتیں دی تھیں لیکن اب اس کو زیادہ سخت اور دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ انگور کا ہر گچھا، گیہوں کی ہر بالی انسانی محنت کا نتیجہ تھی۔

انگور کے چمنوں کی دیکھ بھال بڑا کٹھن کام تھا۔ انگور کے بھاری بھاری گچھے توڑ لئے جاتے اور پتھر کے کولھوؤں میں ڈالکر ان کا رس نچوڑ لیا جاتا اور پھر ان کا گاڑھے خون جیسا یہ رس مشکوں میں بھرلیا جاتا۔ لوگ اس حیرت انگیز دیوتا کے بارے میں پراسرار گیت گاتے جس کا لباس بکری کی کھال کا ہوتا۔ ان گیتوں میں دیوتا کی ان تکلیفوں کا ذکر ہوتا جو اس نے اس شراب کی شہرت کےلئے اٹھائی ہوتیں۔

دریاؤں کی نشیبی ڈھالوں پر جہاں ہر بہار کے زمانے میں سیلابی پانی زمین کو زرخیز بنا دیتا تھا قدرت خود اچھی فصل پیدا کرنے میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

لیکن یہاں بھی کسان کے ہاتھ نچلے نہیں ہوئے۔ لوگوں نے تالاب کھودنا اور بند بنانا شروع کئے تاکہ پانی کھیتوں کو ملے اور ضرورت کی جگہ پر پہنچایا جا سکے۔

لوگ دریا کو پوجنے لگے جو ان کی زمین کو زرخیز بناتا تھا اور اس دوران میں یہ بھول گئے کہ اگر وہ خود کمرتوڑ محنت نہ کرتے تو زمین پر گھاس پھوس کے سوا کچھ اور نہ اگتا۔
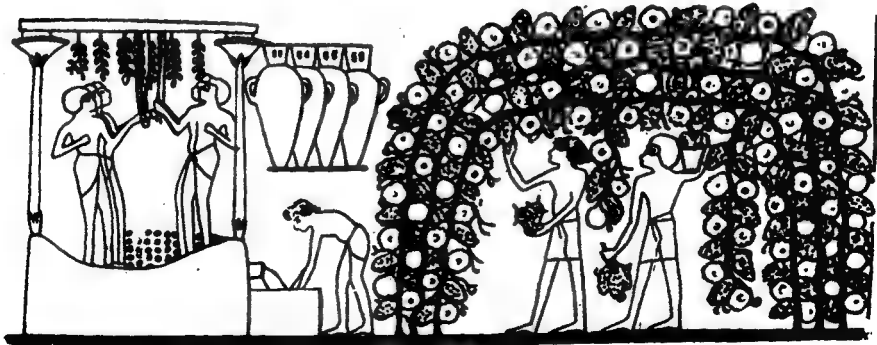
انگور کے بھاری بھاری گچھے جمع کرکے پتھر کے کولھوؤں میں ڈالے جاتے تھے (مصری ڈرائنگ)

وقت کے ساتھ ساتھ کسان کی فکریں بڑھتی گئیں۔ مویشی پالن کرنے والے کو بھی چین نہ تھا۔ استیپی میدانوں کی سرسبز چراگاہوں پر اس کی آنکھوں کے سامنے گلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گلہ جتنا بڑا ہوتا گلہ‌بان کےلئے اتنا ہی زیادہ کام بھی ہوتا۔ دس پندرہ بھیڑوں کی دیکھ بھال کرنا اور بات ہے اور ایک ہزار بھیڑوں کے گلے کی نگرانی دوسری بات۔ بڑا گلہ کسی چراگاہ کا جلدی سے صفایا کردیتا اور اس کو اپنے گاؤں سے اور آگے دور تک چراگاہوں کو لےجانا پڑتا تھا۔

منگول خانہ‌بدوش (قدیم چینی ڈرائنگ)

آخر میں پورے کے پورے گاؤں اپنی رہائش‌گاہیں اکھاڑ کر گلوں کے پیچھے روانہ ہوجاتے۔ لوگ اپنے خیمے اور سازوسامان اونٹوں کی پیٹھ پر لادکر اپنے گلے آگے آگے ہانکتے چلتے۔ وہ اپنے کھیت چھوڑ جاتے جن پر جلد ہی گھاس پھوس کا قبضہ ہوجاتا۔ لیکن دراصل ان کو ان کھیتوں کے چھٹنے کا غم نہ ہوتا کیونکہ خشک استیپی میدانوں میں اچھی فصل کمیاب تھی۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ محنت کی تقسیم صرف ایک قبیلے کے لوگوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ متعدد قبیلوں کے درمیان ہوئی۔

استیپی میدانوں میں ایسے قبیلے ابھرے جو مویشی پالتے تھے اور ان کا تبادلہ اناج سے کرلیتے تھے۔ وہ ایک جگہ پر کبھی نہیں رہتے تھے بلکہ جگہ بجگہ ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ جاتے رہتے تھے۔

خانہ بدوشوں کی زندگی وحشیانہ اور آزاد تھی۔

وہ کھلے میدانوں میں اپنے خیمے لگاتے تھے جہاں سروں پر سوائے کھلے آسمان کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ استیپی ہی ان کا گھر تھا۔ طویل سفروں میں ان کے بچے اونٹوں کی پیٹھوں پر جھولتے ہوئے سوجاتے کیونکہ اس کے سوا ان کےلئے کوئی دوسرا پالنا نہ تھا۔

زندہ اوزار

کسی خانہ بدوش قبیلے کی زندگی پرامن اور پرسکون نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی آوارہ گردی میں کسانوں کے کھیتوں اور گنوں تک پہنچ جاتے تھے تو وہ اکثر کسانوں کے اناج پر قبضہ کرلیتے تھے۔ دریا کی کسی وادی کی طرف جاتے ہوئے یا جنگل کے کنارے تک استیپی میدان میں سفر کرتے ہوئے وہ راستے میں پڑنےوالے گاوؤں کو لوٹ لیتے تھے اور جلا کر راکھ کردیتے تھے، فصلوں کو روند ڈالتے تھے، مویشی اپنے ساتھ لےجاتے تھے اور گاوؤں والوں کو قیدی بنالیتے تھے۔

ان کو قیدیوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی کیونکہ ان لوگوں سے کام لیا جا سکتا تھا، یہ لوگ گلوں کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔

یہ تھی خانہ‌بدوش گلہ بانوں کی زندگی۔ لیکن کسان بھی خاص طور سے امن پسند نہیں تھے۔

خزاں میں جب فصل اکٹھا کی جا چکتی تو وہ اپنے پڑوسیوں پر حملہ کرکے ان کے اناج کے گودام، کپڑے، زیور اور ہتیار لوٹنے میں باک نہ کرتے۔ یہاں بھی سب سے زیادہ قیمتی لوٹ قیدی تھے کیونکہ کسانوں کو تالاب کھودنے، بند بنانے اور بیلوں کو ہنکانے کےلئے مزید آدمیوں کی ضرورت تھی۔

ابتدا میں قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا کیونکہ کسی آدمی سے کوئی خاص فائدہ نہیں مقصود ہوتا تھا۔ حالانکہ آدمی کام کرتا تھا لیکن وہ اپنی کمائی کے مطابق کھاتا بھی تھا۔

مصریوں کا لڑائی میں جیتا ہوا مال غنیمت
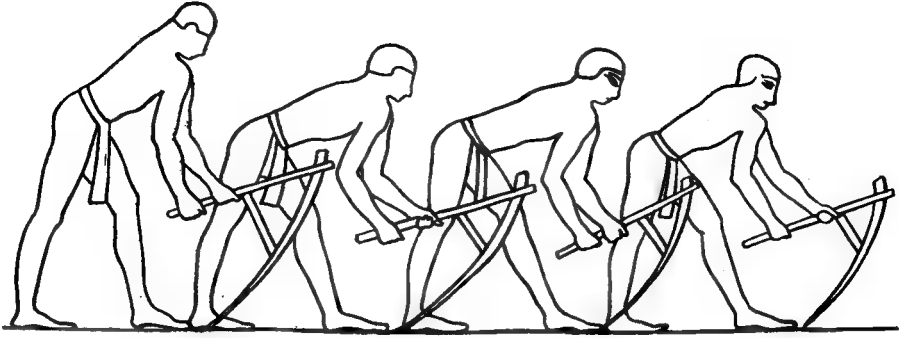
غلام زمین گوڑ رہے ہیں (مصری ڈرائنگ)

جب گلے بڑے بڑے ہونے لگے، جب آدمی کے کام سے، اس کے استعمال سے زیادہ اناج، گوشت اور اون پیدا ہونے لگا تو سب کچھ بدل گیا۔ اب کسان اپنی ضرورت سے زیادہ اناج بونے لگے تاکہ وہ اناج کا تبادلہ اون سے کرسکیں۔ اسی طرح گلہ‌بان اپنے کپڑوں کی ضرورت سے زیادہ بھیڑوں کے گلے پالنے لگے تاکہ فاضل اون کے بدلے اناج اور ہتیار حاصل کر سکیں۔

اس تبادلے اور اکثر لوٹ‌مار نے بعض جرگوں اور خاندانوں کو دوسروں سے زیادہ امیر بنادیا۔ ان کے گلے بڑے ہوگئے اور وہ زیادہ اناج بونے لگے۔ لیکن ان گلوں کو دیکھنے بھالنے کےلئے اور کاشت‌کاری کےلئے کافی کام کرنےوالے نہیں تھے۔ اب لوگوں نے دوسروں کو غلام بنانا شروع کیا۔ غلام کے کام سے مالک اور خود اس کا پیٹ بھرتا تھا۔ بس مالک کو یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ غلام کام زیادہ کرے اور کھائے کم۔ اس طرح سے ایک آدمی کے ہاتھ میں دوسرا آدمی زندہ اوزار بن گیا۔

ایک انسان ذلیل کر دیا گیا۔ اس کی گردن پر اس طرح جوا رکھ دیا گیا گویا وہ کوئی بیل ہو۔

آزادی کی سڑک پر، قدرت کی طاقتوں کو قابو میں لانے کے دوران آدمی خود اپنے ساتھی آدمی کا غلام بن گیا۔

پہلے زمین تمام کاشتکاروں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔ اب غلام نے اس زمین کی کاشتکاری شروع کردی جو اس کی اپنی نہیں تھی، جو بیل وہ ہنکاتا تھا وہ اس کا اپنا بیل نہ تھا، جو فصل وہ کاٹتا تھا اس کی اپنی نہ تھی۔

قدیم مصر میں غلام بیلوں کو ھنکاتے ھوئے گاتا ھے:

بیلو، کچل دو گیہوں کی بالیاں!
کچل دو گیہوں کی بالیاں!
فصل تو ھے میرے مالک کی۔

اب انسانیت کی تاریخ میں پہلی بار مالکوں اور غلاموں کا ظہور ھوا۔

حافظه اور یادگار

ماضی میں ھمارا سفر ذرا دشوار تھا کیونکه ھم غاروں میں محض سیاح کی حیثیت سے نہیں بلکه کھوج کرنےوالوں کی طرح گھومے پھرے۔ ھر نئی چیز جو ملی وہ پراسرار تھی اور اس کے راز کو حل کرنا تھا۔ راستے میں نه تو کوئی نشان تھے اور نه ھماری کھوج میں رھنمائی کرنےوالے تیر بنے تھے۔ اور قدیم زمانے کا آدمی جو پتھر کے زمانے میں رھتا تھا ھمارے لئے نشان ھی کیا چھوڑ سکتا تھا؟ وہ تو لکھنا بھی نہیں جانتا تھا!

بھر صورت ھم آخرکار اس سڑک تک پہنچ گئے جہاں نشان‌راہ ھیں۔ ھمیں پہلی تحریریں مزاروں کی لوحوں اور مندروں کی دیواروں پر ملتی ھیں۔ وہ اس جادو کے نشانات نہیں ھیں جن کا مقصد بدروحوں سے بچاؤ تھا۔ یه تصویروں کی زبان میں پوری کہانیاں تھیں، لوگوں کے بارے میں لوگوں کےلئے کہانیاں۔

پھربھی وہ ھمارے حروف سے ذرا بھی نہیں ملتی تھیں۔ بیل کے لئے ▪ بیل کی تصویر بناتے تھے اور درخت کے لئے پورے درخت کی معه شاخوں کے تصویرکشی کرتے تھے۔

تحریر کی تاریخ تصویری الفاظ سے شروع ھوتی ھے۔ صدیاں گزرنے پر ان تصویروں کو آسان بناکر ان کو نشانوں میں تبدیل کیا گیا۔

اب ھمارے حروف تہجی میں ان تصویروں کے بارے میں قیاس کرنا مشکل ھے جن سے وہ نکلے ھیں۔ کون یه سوچ سکتا ھے که ''A'' کا حرف دراصل بیل کا سر ھے، لیکن اگر تم ''A'' کو الٹ کر دیکھو تو وہ سینگ دار سر سے مشابہه نظر آئےگا۔ قدیم سامیوں کی زبان میں سینگ‌دار سر حرف ''A'' کے مترادف تھا جو پہلا حرف تھا اور جس کو ''الف'' کہتے تھے جس کا مطلب تھا بیل۔

اسی طرح ھم سارے حرف تہجی کی تاریخ کا پته بتا سکتے ھیں۔ ھم دیکھتے ھیں که حرف ''O'' آنکھ کےلئے تھا اور ''P'' ایک لمبی گردن والے سر کےلئے۔

لیکن ہم اپنے جادو کے جوتوں کے ذریعہ بہت دور نکل آئے ہیں۔
دراصل ہم اپنی کہانی میں یہاں تک پہنچے تھے کہ پہلے پہل تصویری الفاظ کب ظہور میں آئے۔
آدمی نے بہت ہی جھجک کر سست رفتاری سے لکھنا شروع کیا۔ پھر بھی، اس کے لئے لکھنا سیکھنے کا وقت آگیا تھا۔
جب بہت زیادہ مفید معلومات اور واقعات نہیں تھے تو آدمی ہر بات کو اپنے حافظے میں رکھتا تھا۔ داستانیں اور قصے وغیرہ ایک آدمی کے ذریعہ دوسرے تک پہنچتے تھے۔ ہر بڈھا آدمی ایک جیتی جاگتی کتاب ہوتا تھا۔ لوگ کہانیاں، داستانیں اور عام سوجھ بوجھ کی باتیں یاد کرلیتے تھے اور انھیں اپنے بچوں کو ایک قیمتی ورثے کی حیثیت سے سپرد کرتے تھے تاکہ ان کے بچے وقت آنے پر ان کو اپنے بچوں کی طرف منتقل کردیں۔ لیکن یہ ورثہ جتنا زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی اس کو یاد رکھنا بھی مشکل ہوتا گیا۔
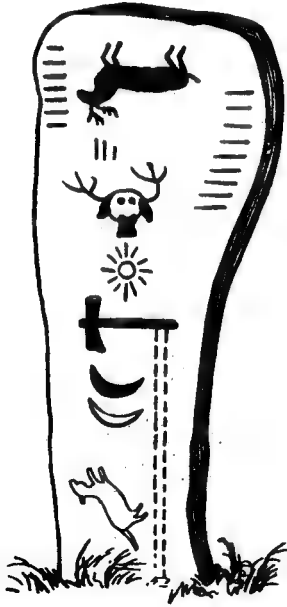
انڈین سردار کی لوح مزار

اور پھر حافظے کی مدد یادگار نے کی۔ تجربے کو منتقل کرنے میں بولنے والی زبان کو تحریری زبان مدد دینے لگی۔ کسی سردار کی لوح مزار پر اس کی مہموں اور لڑائیوں کے کارنامے کندہ ہوتے تھے تاکہ وہ آنے والی نسلوں کو یاد رہیں۔
جب دوسرے اتحادی قبیلوں کے سرداروں کو پیغامبر بھیجے جاتے تھے تو ان کی یاد داشت کے لئے متعدد تصویری الفاظ درخت کی چھال کے ٹکڑے یا مٹی کی تختی پر نقش کر دئے جاتے تھے۔
لوح مزار پہلی کتاب تھی۔ برچ کی چھال پہلا لکھنے والا کاغذ بنی۔
ہمیں اپنے ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر پر فخر ہے جو سب ہم کو وقت اور فاصلے کی مشکلات سے بچاتے ہیں۔ ہم نے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے تک آوازوں کو بھیجنا سیکھ لیا ہے۔ ہماری آواز ٹیپ اور ریکارڈوں میں محفوظ ہوکر آج سے صدیوں بعد تک سنی جا سکے گی۔ ہم نے زبردست ترقی کی ہے لیکن ہم کو اپنے سے پہلے کے لوگوں کے کارنامے نہیں بھولنا چاہئے۔ ہمارے پیدا ہونے سے بہت

پہلے ہمارے اجداد نے برچ کی چھال پر خط لکھ کر پہلےپہل فاصلے پر اور پتھر کی یادگاروں پر پیغامات لکھ کر وقت پر فتح حاصل کی۔

ان میں سے بہت سی یادگاریں باقی رہ گئی ہیں جو ہم کو ہزاروں سال پہلے کی زبردست مہموں اور لڑائیوں کے بارے میں بتاتی ہیں۔ تلواریں اور نیزے تانے ہوئے سپاہیوں کی تصویریں پتھروں پر نقش ملتی ہیں۔ یہ ہیں وہ فاتح جو جیت کر گھر لوٹ رہے ہیں اور ان کے پیچھے سر جھکائے اور ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ان کے قیدی گھسٹتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہاں تصویری الفاظ میں ہمیں ہتکڑی کی ڈرائنگ ملتی ہے جو غلامی اور نابرابری کا نشان ہے۔ یہ نشان ہم کو آدمی کی تاریخ میں ایک نئے باب کے آغاز کا پتہ دیتا ہے، غلامی کی ابتدا کا۔

ہمیں بعد کو مصری مندروں کی دیواروں پر اس قسم کے بہت سے تصویری گواہ ملیں گے۔

ایک میں غلاموں کی لمبی قطار اینٹوں کو کھینچ کر جائے تعمیر تک لا رہی ہے۔ ایک غلام نے کچھ اینٹیں اپنے کندھے پر لاد لی ہیں اور دونوں ہاتھوں سے
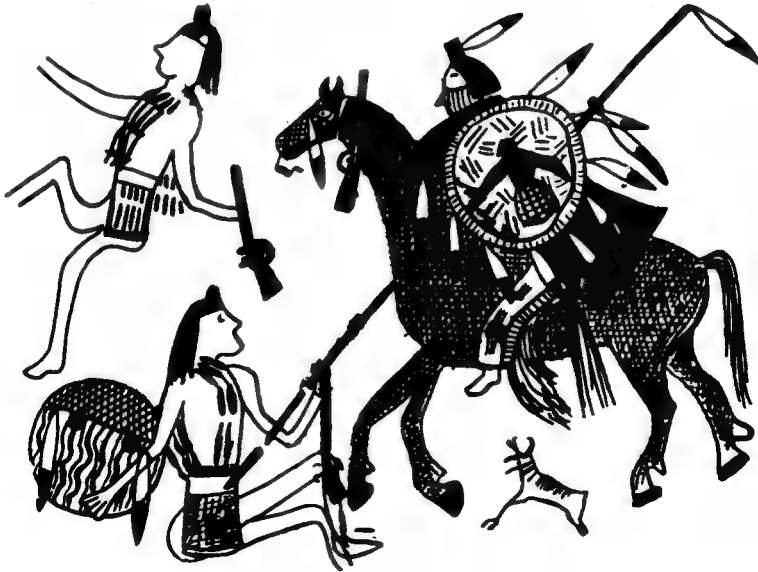
شمالی امریکہ کے انڈین لوگوں کی تصویری کہانی
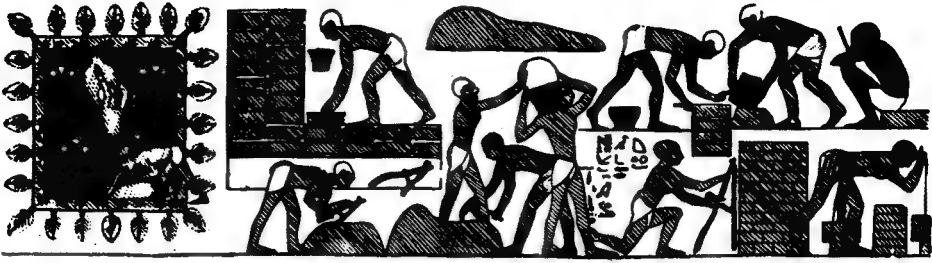
غلام معمار پتھر کا مندر بنا رہے ہیں۔ نگران اوپر دائیں طرف ڈنڈا لئے بیٹھا ہے
(مصری ڈرائنگ)

انبار کو پکڑے ہے۔ دوسرا ایک بھنگی کے ذریعہ اینٹیں لئے جا رہا ہے جیسے لوگ پانی کے دو ڈول لیکر چلتے ہیں۔ معمار ایک دیوار بنا رہے ہیں۔ ایک نگران اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔ وہ اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹیکے ہے اور اس کے ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا ہے۔ اس کو کام نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا کام دوسروں سے کام لینا ہے۔ ایک اور نگراں جائے تعمیر پر ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ اس نے ایک غلام کے سر پر بڑے زور سے ڈنڈا تانا۔ شاید غلام نے کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف کی ہوگی۔

غلام اور آزاد آدمی

کہیں ہوا ہے پیدا آنڈی سے گلاب
ممکن نہیں کہ بچۂ غلام ہو مرد آزاد

یہ یونانی شاعر تھیوگنیس نے اس وقت لکھا تھا جب سماج میں غلامی کا رواج پوری طرح پختہ ہوچکا تھا۔

بہرحال، شروع میں غلاموں کو حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آزاد اور غلام آدمی دونوں ساتھ ملکر کام کرتے تھے اور ایک خاندان یا برادری کی طرح ہوتے تھے۔

باپ یعنی سرقبیلہ اس خاندانی برادری کا سربراہ اور حکمران ہوتا تھا۔ اس کے بیٹے، ان کی بیویاں اور بچے اور اس کے غلام سب اسی کے گھر میں رہتے تھے اور اس کے قطعی ماتحت ہوتے تھے۔ باپ اپنے نافرمانبردار بیٹے کو بھی اسی طرح مارپیٹ سکتا تھا جیسے اپنے نافرمانبردار غلام کو۔

کوئی بڈھا غلام اپنے مالک سے بات کرتے وقت صرف اس کو ''بیٹا،، کہتا تھا جبکہ رواج کے مطابق مالک بڈھے غلام کو ''باپ،، کہہ کر پکارتا تھا۔

اگر تم نے مشہور یونانی نظم ''اوڈیسی،، پڑھی ہے تو تمھیں غالباً بڈھا ایومیئس یاد ہوگا جو سور چرانےوالا ہے اور اپنے مالک کی میز پر کھاتا پیتا ہے اور ایومیئس بھی قبیلے کے سردار کی طرح ''خدا کے برابر،، کہا جاتا ہے۔

لیکن گیتوں کے الفاظ پر ہمیشہ یقین نہیں کیا جا سکتا۔ سورچرانےوالا ایومیئس نہ تو خدا کے برابر تھا اور نہ اپنے مالک کے برابر۔ وہ کام کرنے پر مجبور تھا اور اس کے مالک کےلئے کام اپنی مرضی پر تھا۔ خاندان کے فرد کے مقابلے میں غلام سے زیادہ کام لیا جاتا تھا لیکن غلام کو حصہ بہت کم ملتا تھا۔ غلام کسی کی ملکیت ہوتا تھا اور آزاد آدمی غلام کا مالک تھا۔

جب مالک مرجاتا تو اس کے غلام اور تمام دوسری ملکیت، اس کے سامان کے گودام اور اس کے مویشیوں کے گلے سب اس کے بیٹوں کی ملکیت ہوجاتے تھے۔

اس خاندانی برادری میں مساوات کا کہیں نشان تک نہ تھا۔

یہاں باپ بچوں پر حکومت کرتا تھا، شوہر بیوی پر حکم چلاتا تھا اور ساسیں بہوؤں پر، اور بڑی بہویں چھوٹی بہوؤں پر۔ لیکن غلام تو سب سے نیچے طبقے میں تھا۔ اس پر سبھی حکم چلاتے تھے۔
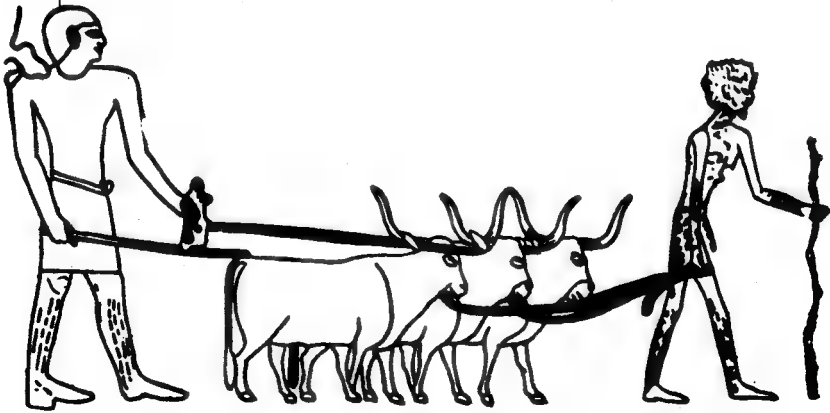
غلام گلہبان اور گلے کا مالک (مصری ڈرائنگ)

مصر میں گرفتارشدہ نیگرو لوگوں کی گنتی

جرگوں اور برادریوں میں جو مساوات پہلے تھی وہ بھی اب غائب ہوگئی۔ کچھ کے پاس زیادہ مویشی تھے اور کچھ کے پاس کم۔ اور مویشی ہی دولت کا پیمانہ تھے۔ بیل کے بدلے میں کپڑے اور ہتیار لئے جا سکتے تھے۔ اسی وجہ سے پہلے کانسے کے سکے بیل کے پھیلے ہوئے چمڑے کی شکل میں ڈھالے گئے۔

پھر بھی غلام بیل سے زیادہ قیمتی تھا۔

غلام سوروں، گایوں اور بھیڑوں کی نگرانی کرتا تھا۔ دن بھر ان کے ساتھ چراگاہ میں رہنے کے بعد شام کو ان کو باڑوں میں لاتا تھا۔ غلام فصل جمع کرنے میں مدد دیتا تھا، انگوروں سے رس نچوڑتا تھا اور زیتون سے تیل۔ سنہرے اناج کے ڈھیر گوداموں کو بھر دیتے تھے۔ خوشبودار تیل بڑے بڑے مٹی کے ظروف میں ٹپک ٹپک کر آتا تھا جو amphorae کہلاتے تھے۔

غلام آزاد آدمی کی مدد کرتا تھا لیکن اس کو سب سے سخت اور سب سے گندا کام کرنا پڑتا تھا۔

اب لڑائیاں نفع بخش ہوگئیں کیونکہ ان سے غلام ملتے تھے اور غلام مالکوں کے لئے بڑی دولت پیدا کرتے تھے۔

اس طرح آزاد آدمی لڑنے چلے جاتے اور غلاموں کو اپنے گلے دیکھنے اور زمین کی کاشت کرنے کے لئے چھوڑ جاتے۔

جنگوں کی وجہ سے کام اور بڑھ گیا۔ دوسرے قبیلے پر حملے کے لئے لوگوں کو

زیادہ تلواروں، برچھوں اور رتھوں کی ضرورت تھی۔ سپاہی اپنے رتھوں میں صبارفتار گھوڑے جوتتے اور میدان جنگ کےلئے روانہ ہوجاتے۔
لیکن جنگی چالوں میں حملہ بھی ہے اور بچاؤ بھی۔ دشمن کی تلواروں اور نیزوں کی ضرب سے بچنے کےلئے سپاہی خود پہننے لگے اور ڈھالیں باندھنے لگے۔ آخرکار، برادری کے مکانات کی حفاظت بڑے بڑے پتھروں کی دیواروں سے کی جانے لگی۔
جرگہ جتنا ہی زیادہ دولت مند ہوتا اتنا ہی زیادہ وقت اور کوشش اپنے دفاع میں لگاتا۔ اب اس کو بہت کچھ بچانا تھا۔
جلد ہی پہاڑیوں پر بڑے بڑے قلعے نظر آنے لگے جن میں درجنوں کمرے اور گودام ہوتے تھے اور فصیلوں پر برج بنائے جاتے تھے۔ داخلے کےلئے بھاری پھاٹک ہوتے تھے۔

خیمہ گھر کیسے بنا اور گھر شہر کیسے بن گیا

ایک سوویت مؤرخ تولستوف نے اپنی کتاب ”قدیم خوارزم“ میں ان قلعوں کے کھنڈرات کا حال لکھا ہے جو اس نے وسط ایشیا کے ریگستان میں پائے۔
یہ عمارتیں اپنی وسعت میں گھر نہیں بلکہ ایک شہر کی طرح تھیں۔
مضبوط مٹی کی دیواریں ایک بہت بڑے قطعۂ زمین کو گھیرتی تھیں اور کئی میل تک پھیلی ہوتی تھیں۔ دیواروں کے اندر محراب‌دار حجروں میں برادری کے ممبر رہتے تھے، جن کی چھتوں میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہوتی تھیں۔
یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ ہزاروں آدمی دیواروں کے اندر تنگ اور نیم تاریک حجروں میں رہتے تھے جبکہ بیچ کا بڑا صحن خالی رہتا تھا۔
تولستوف کا جواب بہت سیدھا سادہ ہے۔ اس زمانے میں خوارزم کے لوگوں کی بڑی دولت ان کے مویشی تھے۔ یہ بڑا صحن دراصل بڑے گلوں کا باڑہ ہوتا تھا اور دیواریں جن میں سوراخ اور نگرانی کےلئے مینار ہوتے تھے اس دولت کو دشمن کے حملوں سے بچاتی تھیں۔
جب دشمن حملہ کرتا تھا تو قلعہ کے سارے باشندے سوراخوں پر جمع ہوکر حملہ‌آوروں پر تیروں کی بارش کرتے تھے۔
لیکن جس دولت کا بچاؤ وہ سب ملکر کرتے تھے اب مشترکہ ملکیت نہیں

رهی تھی کیونکہ حالانکہ سب لوگ ایک دوسرے کے رشتے دار تھے پھربھی کچھ خاندانوں کے پاس بھیڑ، بیل اور گھوڑے وغیرہ دوسروں سے زیادہ تھے۔

پرانی داستانیں ہمیں بتاتی ھیں کہ ان دور دراز زمانوں میں لفظ ''امیر،، جملے کا ایک حصہ ھوتا تھا۔ لوگ صرف یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ شخص ''امیر،، ھے۔ وہ یوں کہتے تھے کہ وہ ''گلوں سے امیر،، ھے یا ''گھوڑوں سے امیر،، ھے۔

پڑوسی قلعے پر ھر نیا حملہ جنگی سرداروں کے گلوں میں اضافہ کرتا تھا اور امیر و غریب کا فرق بھی بڑھاتا تھا۔

تولستوف اور ان کے ساتھیوں نے دوسرے قلعے بھی ڈھونڈ نکالے (گھر اور شہر دونوں) جو بعد میں بنائے گئے تھے۔

ریگستان میں ان کی کھدائی بہت برسوں تک ھوتی رھی۔ یہ بہت ھی مشکل اور سنگین ذمے داری تھی۔ زمانوں کی بھولی بسری تہذیب کی نشانیوں کی تلاش میں سوویت سائنس داں اونٹوں، موٹروں اور موٹر کشتیوں اور ھوائی جہازوں پر سرگرداں رھے۔ کبھی کبھی اونٹ کے کوھان یا ٹیلے پر بیٹھکر ان کو صرف پرانے ٹیکرے نظر آتے جن پر کھاری مٹی کی بھوری پرت جمی ھوتی۔ لیکن ریگستان میں ھوائی جہاز سے اڑتے ھوئے وہ دیواروں، سڑکوں اور بڑے بڑے برادری کے گھروں کے خط و خال دیکھ لیتے تھے۔

ان تمام گھروں اور شہروں کا مقابلہ کرکے انھوں نے آخرکار اس تبدیلی کی کہانی تیار کرلی جو ابتدائی برادرانہ نظام سے غلاموں کی ملکیت والے نظام تک ھوئی تھی۔

جان باس کالا کے قریب مچھیروں کا خیمہ نما گھر تھا۔ وھاں ابھی تک نہ امیر، نہ غریب تھے۔ تمام چولھے ایک سائز کے تھے، سب آدمی برابر تھے کیونکہ وہ سب مساوی طور پر غریب ھوتے تھے۔ گھر قلعہ‌بند نہیں تھا کیونکہ کوئی دولت نہ تھی جس کی حفاظت کی جائے۔

اس پڑاؤ سے قریب ھی سائنس دانوں نے مٹی کے ایک ''لمبے گھر،، کے کھنڈرات پائے۔ چولھوں کی قطار طویل لائن میں ۵۰ میٹر والے دو برآمدوں میں چلی گئی تھی۔ یہ گھر بھی قلعہ بند نہ تھا۔

لیکن صدیاں گزر گئیں۔ کئی ''لمبے گھر،، ایک دوسرے سے منسلک کر دئے گئے تاکہ وسیع خالی صحن کے گرد ایسی دیوار بن‌جائے جس کے اندر آبادی ھو۔

ایسا ھی محصور گھر کوئزیلی گور میں ھے۔ یہاں ھم کو دیواروں میں سوراخ اور نگرانی کےلئے مینار ملتے ھیں۔ لوگ اپنے گلوں کو دشمن کے حملوں سے بچاتے تھے لیکن اپنے پڑوسیوں پر حملہ کرنے اور ان کا سامان لوٹنے میں بھی

باک نہیں کرتے تھے۔ یہاں کچھ خاندان دوسروں سے زیادہ امیر تھے حالانکہ اس کا کوئی صاف ثبوت نہیں ملتا ہے۔ ماھرین آثار قدیمہ دوسرے ملکوں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنےوالے لوگوں کے رواجوں کا مطالعہ کرکے صرف یہی اخذ کر سکے ھیں کہ ایسی نابرابری تھی۔

دوسری منزل جان باس کالا کا قلعہ ہے۔ دیواروں سے محصور صحن خالی نہیں ہے کیونکہ خالی جگہ میں دو بہت بڑے، متعدد کمروں والے برادری کے مکان ھیں۔ دونوں مکانوں کے بیچ میں سڑک ہے جو ''آتش‌خانے،، تک جاتی ہے۔ قدیم زمانے کے مچھیروں کے خیمے کا قدیم چولھا جس میں ھمیشہ آگ جلتی رھتی تھی اب مندر بن گیا ہے۔

اب قلعہ میں ایک جرگہ نہیں رھتا۔ یہاں جرگوں کے دو جتھے رھتے ھیں جن کے الگ الگ اپنے گھر ھیں۔ یہاں باڑ نہیں ہے کیونکہ باشندوں کا خاص پیشہ مویشی پالن نہیں بلکہ زراعت ہے۔ قلعہ کی دیواروں کے باھر کھیت ھیں جن کے درمیان جابجا آب‌پاشی کےلئے نہریں ھیں۔ یہ قلعہ خانہ‌بدوشوں سے ان کھیتوں اور نہروں کو بچاتا ہے۔

ابھی ایک اور بعد کی منزل توپ‌راک کالا ہے۔ یہاں قلعہ کی فصیل کے اندر تقریباً درجن‌بھر بہت سے کمروں والے مکانات ھیں۔

چاروں طرف سے مضبوط میناروں والی دیواریں شہر کو گھیرے ھیں۔ کوئی آنےوالا فوراً شہر میں داخل نہیں ھوسکتا۔ اس کو ایک بھول بھلیاں سے گزرنا ھوتا ہے جو داخلوں کی حفاظت کرتی ہے۔ خاص سڑک جو داخلے کے پھاٹکوں سے شروع ھوتی ہے شہر کے بیچوں بیچ سے، ایک سرے سے دوسرے تک گزرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دونوں طرف بڑے بڑے برادری کے مکانات ھیں جن میں سینکڑوں کمرے، چھوٹے برج اور صحن ھیں۔ خاص سڑک ''آتش‌خانے،، کو اور شہر کے حکمراں کے تین برجوں‌والے شاندار محل تک جاتی ہے۔

اب اس کے کھنڈرات باقی رہ‌گئے ھیں جو جگہ بجگہ مٹی اور ریت میں دفن ھیں۔ ماھرین آثار قدیمہ کو شہر کا نقشہ از سر نو بحال کرنے کےلئے کافی عرصے تک سخت محنت کرنی پڑی۔

دریافتوں کے متواتر سلسلے نے ان کی محنتوں کو بارآور کیا۔ سب سے زیادہ دلچسپ چیزیں تین برجوں‌والے محل میں پائی گئیں جہاں شاندار کمروں کی دیواروں پر ماھر کاریگروں کے شاھکار نظر آتے ھیں۔ یہاں، اس ویران ریگستان میں محل کی دیواروں پر ماضی کے مناظر بالکل جیتے جاگتے معلوم ھوتے ھیں۔ ایک لڑکی بربط بجا رھی ہے، ایک انگور چننےوالا اپنی ٹوکری سر پر اٹھائے ہے، ایک آدمی سیاہ کوٹ

پہنے ہے۔ ان کے علاوہ گھوڑے اور جنگلی مرغیاں ہیں۔ ماہر مجسمہ‌سازوں کے بنائے ہوئے مجسموں کے ٹکڑے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

محل کی ہر چیز اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کے مالک شہر کے دوسرے باشندوں سے زیادہ امیر اور اونچی ذات کے تھے۔

اور محل خود دوسرے گھروں سے سربلند اور بارعب بنکر اس کا ثبوت دیتا تھا کہ اس کے باسی باقی لوگوں سے کہیں زیادہ اچھی حالت میں ہیں۔

اس محل میں اپنے خاندان اور اپنے متعدد غلاموں کے ساتھ خوارزم شاہ رہتا تھا جو شہر اور سارے ملک کا حکمران تھا۔

یہ شہر بجائے خود ایک ریاست تھا۔ حکمران کے پاس ایک فوج تھی جو اس کو غلاموں اور غریبوں کو فرمان‌بردار رکھنے، امیر اور شریف خاندانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور آبپاشی کےلئے نہروں کی تعمیر کی نگرانی میں مدد دیتی تھی۔ آبپاشی کی کسی بڑی نہر کی تعمیر کےلئے غلاموں کی بڑی تعداد درکار ہوتی تھی۔ اور صرف ایک قلعہ نہیں بلکہ بہت سے قلعے اور باقاعدہ فوج کھیتوں، نہروں اور خوارزم کے غیرقلعہ بند کسانوں کے گھروں کی حفاظت کرتے تھے۔

اس طرح ہزاروں برسوں کے دوران سفر کرکے سائنس‌داں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ کس طرح خیمہ گھر میں تبدیل ہوا اور گھر شہر میں اور کیسے مساوی لوگوں کی برادری غلام‌دار ریاست بن گئی۔

ماہرین آثار قدیمہ نے اس قسم کے رہائشی قلعے وسط ایشیا کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی پائے جہاں لوگوں کو اپنی دولت دشمن کے حملوں سے بچانا ہوتی تھی۔

قلعہ کا محاصرہ

قلعہ کی فصیل پر سے تم کو دور دور دکھائی دیتا۔ جب کوئی گرد کا بادل فاصلے پر دکھائی دیتا اور دھوپ میں نیزوں کی نوکیں چمکتیں تو قلعہ میں جلدی جلدی دفاع کی تیاری ہونے لگتی تھی۔ کسان اپنے بیل لیکر قلعہ کے اندر بھاگتا تھا اور گلہ‌بان اپنے گلے بھی قلعہ میں لےآتے تھے۔ جب سب قلعہ میں آجاتے تھے تو بھاری پھاٹک مضبوطی سے بند کرلئے جاتے تھے۔ سپاہی دیواروں اور برجوں پر تعینات کر دئے جاتے تھے۔ وہ دشمن کے قریب آنے کا انتظار کرتے تھے اور پھر صبارفتار اور تیز تیروں سے اس کا خیرمقدم کرتے تھے۔

حملہآور قلعہ کے قریب آ کر پڑاؤ ڈال دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قلعہ کے لوگ آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ بلند دیواروں کے گرنے میں کئی مہینے لگیں گے۔ ہر صبح کو قلعہ کے پھاٹک چرچراتے ہوئے کھلتے۔ سپاہیوں کا مجمع اپنے نیزے بلند کرکے جھپٹتا۔ وہ کھلے میدان میں لڑائی کا تصفیہ کرنے آتے۔ وہ دشمن کے گھوڑے کی دموں کے بالوں سے سجے ہوئے اور چمچماتے خودوں پر تلواروں سے غصے کے ساتھ وار کرتے۔ وہ جان توڑ کر لڑتے، نہ خود دم لیتے اور نہ دشمن کو دم لینے دیتے۔

ایک کو اپنے گھر اور خاندان بچانے کا جوش ہوتا تو دوسرا اس غصے سے آگ بگولا ہوتا کہ دولتیں اتنے قریب ہونے کے باوجود اس کے دست رس سے دور ہیں۔ دفاع کرنےوالے جو زندہ بچ جاتے رات میں قلعہ کو واپس جاتے اور صبح تک کےلئے لڑائی ملتوی ہوجاتی۔

اس طرح دن گزرتے جاتے۔ محصور لوگ حملہآوروں سے بہادری کے ساتھ لڑتے لیکن بھوک کی مار دشمنوں کے نیزوں اور تیروں کی مار سے کہیں زیادہ مہلک ہوتی ہے۔

جب گوداموں میں خاک اڑنے لگتی جو کبھی اناج سے بھرے تھے، جب مٹی کے مٹکوں کا تیل آخریقطرے تک ختم ہوجاتا تو قلعہ میں ماتم برپا ہوجاتا۔ بھوکے بچے روتے اور عورتیں خاموشی سے اپنے آنسو پونچھتیں کہ کہیں مردوں کو ان کے اوپر غصہ نہ آجائے۔

ہر لڑائی کے بعد قلعہ میں دفاع کرنےوالوں کی تعداد گھٹتی جاتی اور آخرکار وہ دن آجاتا جب پیچھے ہٹتے ہوئے سپاہیوں کا پیچھا کرکے حملہآور قلعہ میں داخل ہوجاتے۔ وہ مضبوط دیواروں
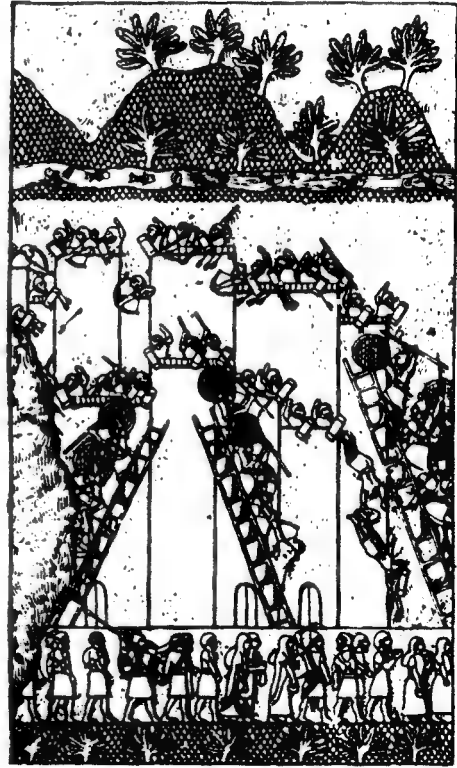
آشوری ایک قلعہ پر دھاوا بول رہے ہیں۔ نیچے: سپاہی اپنے قیدیوں کو لئے جا رہے ہیں

کے اندر اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ جہاں پہلے لوگ رہتے تھے، کام کرتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے وہاں کھنڈروں اور انسانی لاشوں کے ڈھیروں کے سوا کچھ نہ رہ جاتا۔ فاتح زندہ لوگوں کو، خواہ وہ جوان ہوں یا بڈھے، غلام بنا کر لے جاتے۔

زندوں کی کہانی مردوں کی زبانی

روس کے جنوب میں پھیلے ہوئے استیپی میدان میں ایسی جگہیں ہیں جہاں اونچے ٹیلوں کا سلسلہ حد نگاہ تک نظر آتا ہے۔ مقامی باشندوں میں سے کسی کو یاد نہیں ہے کہ ہموار استیپی میں یہ ٹیلے کیسے ابھرے یا ان کو کس نے بنایا۔

اگر آپ زیادہ چھان‌بین کریں تو کوئی بزرگ یہ کہدے گا کہ یہ ''ممائیوں،، یا ''ممائیوں کی بیٹیوں،، کی قبریں ہیں۔ لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکے گا کہ ممائی کون تھے اور کب تھے۔

اگر وہ باتونی ہوگا تو بڑی خوشی سے اس جاگیردار کی بابتہ بتائے گا جو یہاں رہتا تھا اور اس کا مالک تھا اور جس نے چھپے ہوئے خزانے کی تلاش میں باقاعدہ ٹیلے کی کھدائی کرائی تھی۔ لیکن اس کے ھاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ پھر انقلاب آیا، جاگیردار کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی تلاش بھی رک گئی۔

بہرحال، ان بوڑھوں سے ٹیلوں کے بارے میں پوچھ کر وقت ضایع کرنا ہے جبکہ ماہرین آثارقدیمہ وہ باتیں جانتے ہیں جو صدیوں گزرے ہوئی تھیں۔

بوڑھے تو صرف اپنی صدی کی بات جانتے ہیں اور ماہرین آثار قدیمہ کو اپنی پیدائش سے صدیوں پہلے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

پہاڑیاں قدیم زمانے کے قبرستانی ٹیلے ہیں جہاں ان لوگوں کی قبریں ہیں جو کسی زمانے میں استیپی میں رہتے تھے۔

ماہرین آثارقدیمہ کو ان ٹیلوں میں انسانی ڈھانچے ملتے ہیں۔ ان کے ساتھ مختلف قسم کی چیزیں بھی مثلاً مٹی کی صراحیاں، پتھر یا کانسے کے اوزار اور گھوڑے کی کئی ھڈیاں۔ مردہ آدمی کو اپنے طویل سفر کےلئے یہ توشہ ملتا تھا۔

لوگوں کا قاعدہ تھا کہ موت کے بعد بھی آدمی کھاتا پیتا اور کام کرتا ہے اور عورت کی روح کو اپنی تکلی کی اور مرد کی روح کو اپنے نیزے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

انتہائی قدیم قبرستانی ٹیلے ایک طرح کے ہیں۔ مردے کے ساتھ اس کی کئی چیزیں رکھدی جاتی ہیں کیونکہ اس ابتدائی دور میں ملکیت میں بہت کم چیزیں

ہوتی تھیں۔ اس کی اپنی چیزیں کیا ہوتی تھیں؟ وہ تعویذ جو اس کے گلے میں پڑا رہتا تھا یا لڑائیوں میں استعمال ہونےوالا نیزہ۔

گھر کی ہر چیز مشترکہ ملکیت تھی کیونکہ گھر کے امور کا انتظام برادرانہ بنیادوں پر سارا خاندان مجموعی طور سے کرتا تھا۔ اسی وجہ سے قدیم ٹیلوں میں امیروں اور غریبوں کی قبریں نہیں ہوتی تھیں۔ سب مردے برابر ہوتے تھے۔ لیکن آگے چل کر مردے امیر اور غریب ہونے لگے۔

دریائے دون کے کنارے ایلیزاویتوفسکایا گاؤں کے قریب قبرستانی ٹیلے دریافت کئے گئے۔ ان میں تین قسم کی قبریں تھیں: امیروں، متوسط درجے کے لوگوں اور غریبوں کی قبریں۔

سب سے بڑے ٹیلوں کے بیچ میں ایک بڑا گڈھا ہوتا تھا۔ یہ قبر تھی۔ اس کے اندر گل‌کار یونانی گلدان، مرصع زرہ بکتر اور خوبصورت نقوش کے خنجر تھے۔

ان سے چھوٹے ٹیلوں میں مشکل ہی سے سونے کی چیزیں ملتی ہیں اور ان میں گل‌کار گلدان نہیں ہوتے۔ پھر بھی ان کو غریبوں کی قبریں نہیں کہا جا سکتا۔ اگر مردہ غریب ہوتا تو قبر میں اس کے پہلو میں سیاہ روغن کی ہوئی پلیٹ یا دھات کی چادر کے ٹکڑوں سے بڑی مہارت کے ساتھ تیار کی ہوئی زرہ بکتر نہ ملتی۔

سب سے چھوٹے ٹیلوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ غریبوں کی قبریں ہیں۔ تنگ گڈھے میں مردے کے دائیں ہاتھ کے پاس صرف ایک برچھا ملتا ہے اور بائیں ہاتھ کے پاس ایک صراحی تاکہ اگر وہ پیاسا ہو تو پانی پی سکے۔ غریب آدمی اپنی قبر میں بھی غریب ہی رہتا تھا۔

کہاوت ہے ''قبر کی طرح خاموش،،۔ لیکن کیا یہ قبریں واقعی خاموش ہیں؟ کیا یہ ہمیں اس دور دراز زمانے کے بارے میں نہیں بتاتی ہیں جب پہلی بار امیر اور غریب پیدا ہوئے تھے۔ مردے ہمیں زندوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔

اگر ہم قبرستانی ٹیلوں کو چھوڑکر بستی کے کھنڈرات جائیں جو کچھ فاصلے پر نظر آتے ہیں تو ہمیں وہاں بھی سابق دولت اور سابق غربت کی نشانیاں ملیں گی۔ ماہرین آثارقدیمہ نے معلوم کیا ہے کہ بستی میں دو باڑیں تھیں۔ ایک نے بستی کو باہر سے گھیر رکھا تھا اور دوسری بستی کے مرکزی حصے کو محصور کرتی تھی۔ یہاں ان کو نفیس برتنوں اور گلدانوں کے بہت سے ٹکڑے ملے جو دوردراز یونان سے لائے گئے تھے۔ دو باڑوں کی درمیانی جگہ میں ان کو اس طرح

کے بہت کم ٹکڑے ملے۔ یہاں ان کو بہت ھی معمولی قسم کے مٹی کے برتنوں اور صراحیوں کے ٹکڑے دستیاب ہوئے۔ ظاھر ھے کہ بستی کے مرکزی حصے کے لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت امیر تھے جو بستی کے کنارے رہتے تھے کیونکہ وہ ایسے قیمتی پیالے اور کشتیاں وغیرہ خرید سکتے تھے۔

ان ھی امیروں کی قبروں پر وہ اونچے ٹیلے بنائے گئے تھے جو دور سے نظر آتے تھے۔

یہ قبریں ھمیں ان لوگوں کے بارے میں بتاتی ھیں جو ان میں دفن کئے گئے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ ان غلاموں کی ہولناک داستان بتاتے ھیں جو اسلئے قتل کر دئے گئے تھے کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ دفن کردئے جائیں یا ان بیویوں کے بارے میں جن کو اپنے مردہ شوھروں کے ساتھ دفن ہونا پڑتا تھا۔

یہ قبریں کتاب سے بہتر اس ظالمانہ طاقت کے بارے میں بتاتی ھیں جو باپ یعنی کسی امیر جرگے کا سردار رکھتا تھا۔ جب وہ مرتا تو اپنے غلاموں اور بیویوں کو بھی اپنے ساتھ قبر میں کھینچ لےجاتا کیونکہ غلام اور بیویاں تو اس کی ملکیت ہوتی تھیں جیسےکہ کانسے اور سونے کے زیورات ہوتے تھے۔
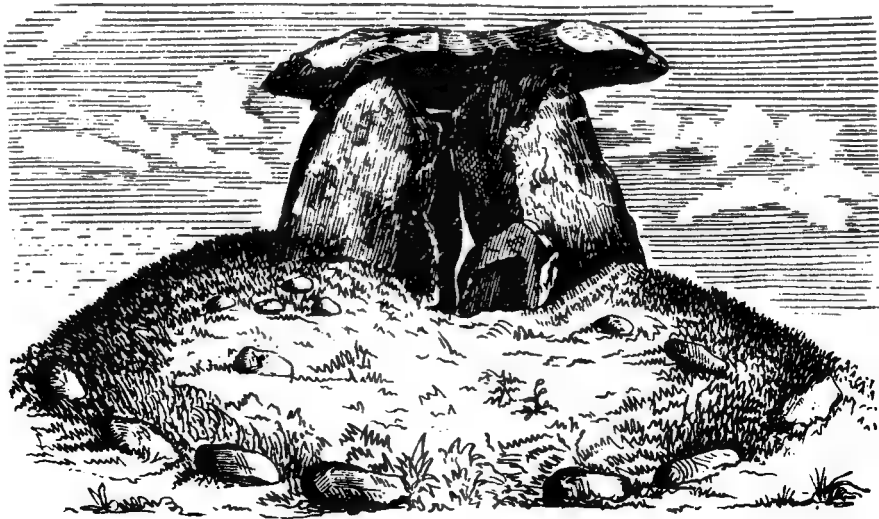
بڑی بڑی پتھر کی چٹانوں سے بنا ہوا قدیم مقبرہ

آدمی نے ایک نئی دھات بنائی

ان قبروں کی تاریکی یا قلعوں کے کھنڈرات میں جو بیش‌بہا چیزیں ہزاروں سال سے دفن تھیں اب میوزیموں میں دیکھی جا سکتی ھیں۔ وہ چیزیں جو صدیوں تک نگاھوں سے چھپی رھیں اب قدیم ماضی سے تمام دلچسپی رکھنے والے ان کو دیکھ سکتے ھیں۔

میوزیموں کو جانے والے ھر شیشے کے کیس کے سامنے رک کر سونے کے دستوں‌والی تلواروں، نفیس زنجیروں، سونے کے بہت ھی چھوٹے سروالے بچھڑوں کی شکل کے بنے ہوئے دانوں کے ھاروں اور ھرن یا بیل کی شکل کے نقرئی ظروف دیکھتے ھیں۔

ان چیزوں میں سے ھر ایک پر کتنی محنت اور کاریگری خرچ کی گئی ھے!

انتہائی سادہ کانسے کا خنجر بنانے میں بھی بہت دن لگتے تھے۔

پہلے تو خام دھات کی کان کنی کرنی پڑتی تھی۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا جب خالص تانبا پیر کے نیچے پڑا رھتا تھا۔ اب خام تانبا حاصل کرنے کےلئے آدمی کو زمین کے سینے میں گہرائیوں تک اترنا پڑتا تھا۔ تاریک کانوں کی تہہ میں کان کن خام دھات کو کدالوں سے توڑکر نکالتے تھے اور چمڑے کی تھیلیوں میں اوپر بھیجتے تھے۔

بڑے بڑے پتھروں کے توڑنے کے کام کو آسان بنانے کےلئے وہ تہہ‌زمین آگ جلاتے تھے۔ جب پتھر سرخ انگارہ ھوجاتے تھے تو وہ ان پر ٹھنڈا پانی ڈالتے تھے۔ پانی سنسناتا اور بھاپ کے بادل بلند ھوتے۔ پتھر چٹخ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ھو جاتے۔ اس طرح آگ اور پانی کان کن کے تیشے کی مدد کرتے۔

اس وقت کان آتش‌فشاں کی طرح ھوجاتی۔ بھاپ کے جو بادل نیچے آگ سے پیدا ھوتے وہ کان کے دھانے سے اس طرح نکلتے جیسے کوہ آتش‌فشاں کے دھانے سے۔ اسی‌لئے ھم ابھی تک آتش‌فشانوں کو volcanoes کہتے ھیں جو کہ آگ کے رومن دیوتا ولکان کے نام پر ھے۔

جب خام دھات کان سے نکال لی جاتی تو اس کو پگھلا کر صاف کیا جاتا۔ اس میں بھی بڑی مہارت کی ضرورت تھی۔ خام تانبے میں ٹین ملایا جاتا تھا تاکہ ٹھنڈی دھات سخت ھوجائے اور پگھلی ھوئی دھات آسانی سے سانچوں میں ڈالی جا سکے۔

پگھلائی نے تانبے اور ٹین کا ایک مرکب پیدا کیا جو محض تانبا نہیں تھا۔ یہ کانسہ تھا، ایک نئی دھات جو نئی خوبیاں رکھتی تھی اور آدمی نے خود یہ نئی دھات بنائی تھی۔
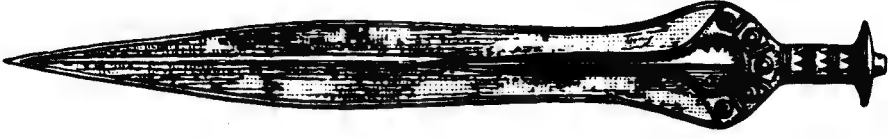
کانسے کی قدیم تلوار

پہلے اس زمانے میں جب آدمی کے بھدے ہتیار صرف پتھر کے ہوتے تھے ایک آدمی دوسرے کا کام بھی ضرورت پڑنے پر کر سکتا تھا۔ قدیم زمانے کے آدمی کو جو انے گنے ہنر معلوم تھے ان کو سیکھنا مشکل نہ تھا۔ قدیم زمانے کے شکاری قبیلے میں ہر آدمی شکاری ہوتا تھا اور خود اپنے تیروکمان تیار کر سکتا تھا۔

لیکن کسی نرم شاخ کو جھکا کر اس کے سروں کو تانت سے باندھ دینا اور بات تھی اور کسی خام دھات کے ٹکڑے کو چمکدار کانسے کی تلوار میں بدل دینا دوسری بات۔

کسی آدمی کو اسلحہ گری کا کام سکھانے میں برسوں لگ جاتے تھے۔ اسلحہ گر اپنے بیٹے کو وہ سب کچھ سکھاتا تھا جو اسے معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہ ہنر تو پورے جرگے کی ملکیت، اس کی وراثت میں ملنےوالی دولت تھی۔ کبھی کبھی تو کمھاروں، ٹھٹھیروں اور اسلحہ گروں کی پوری کی پوری بستیاں ہوتی تھیں اور ان کی شہرت دور دور تک پھیل جاتی تھی۔

میرا اور تیرا

پہلےپہل تو ہر کاریگر صرف اپنی برادری، اپنے گاؤں کےلئے کام کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اسلحہ گروں اور کمھاروں نے اپنی چیزوں کا تبادلہ اناج، کپڑے اور دوسرے کاریگروں کے بنائے ہوئے سامان سے زیادہ کرنا شروع کردیا۔

اب قدیم قبائلی نظام میں دراڑیں پڑنے لگیں جیسے کان میں گرم کئے ہوئے پتھر میں ٹھنڈے پانی سے دراڑیں پڑجاتی تھیں۔

ابتدا میں گاؤں کے تمام لوگ برابر ہوتے تھے۔ اب ایک دراڑ نے امیر خاندانوں کو غریب خاندانوں سے الگ کردیا اور دوسری نے کاریگروں کو کسانوں سے۔ جب تک کاریگر برادری کےلئے کام کرتے تھے برادری ان کو کھانا دیتی

تھی۔ لوگ ساتھ ملکر کام کرتے اور ان تمام چیزوں میں جو وہ بناتے یا زمین سے پیدا کرتے تھے حصے دار ہوتے تھے۔

لیکن جب کاریگروں نے اپنے برتنوں اور تلواروں کی تجارت دوسرے گاؤں سے شروع کردی تو انھوں نے اس اناج اور کپڑے میں اپنے رشتے داروں کو حصے دار نہیں بنایا جو ان کو معاوضے میں ملا۔

بهرحال یہ اناج اور کپڑے خود انھوں نے اور ان کے بیٹوں نے کمائے تھے اور کسی نے ان کی مدد نہیں کی تھی۔

اس طرح آدمی نے ''میرے'' اور ''تیرے'' کے درمیان تفریق شروع کی تاکہ وہ اپنے خاندان کو رشتےداروں کے خاندان سے الگ کر سکے۔

لوگ چھوٹے خاندانی جتھوں میں رہنے لگے۔

قدیم یونان کے میسینائی اور تیرینس نامی شہروں میں ماہرین آثارقدیمہ نے ایسی بستیوں کے کھنڈرات پائے ہیں جو اس تفریق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سب سے دولت مند اور طاقتور خاندان پہاڑی کی چوٹی پر مضبوط دیواروں کے اندر رہتا تھا۔ اور اس خاندان کے پاس پتھر کی دیواروں کے پیچھے چھپانے کےلئے بہت کچھ ہوتا تھا۔ قبیلے کا جنگی سردار یہاں اپنے بیٹوں، بھوؤں اور پوتوں کے ساتھ رہتا تھا۔ نیچے میدان میں غریب کسان اپنی جھونپڑیوں میں گڈمڈ بستے تھے۔ اور قریب کی پہاڑیوں پر کاریگروں یعنی اسلحہسازوں، کمہاروں اور ٹھٹھیروں کے گھر پھیلے ہوتے تھے۔

اس بستی میں لوگ اب ایک دوسرے سے برابر والے کی حیثیت سے نہیں بات کرتے تھے۔ جب امیر اور طاقتور سردار کسانوں کے پاس سے نکلتا تو وہ اس کی تعظیم بجا لاتے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا زبردست کا سرپرست ہوتا ہے۔

مذہبی پیشواؤں نے ان کو یہی سکھایا تھا۔ اس قسم کے خیالات بچپن ہی سے ان کے دل میں بٹھائے جاتے تھے۔

کسان، کاریگر یا کان کن کو اپنے برابر کا یا اپنا بھائی نہیں سمجھتا تھا۔ کیا یہ کریہہ منظر آدمی جو تہہ زمین سے تانبا نکالتا ہے جہاں سے شعلے اور بھاپ نکلتی ہے جادوگر نہیں ہے؟ وہ کیسے جانتا ہے کہ اس کے پیروں تلے کیا ہو رہا ہے؟ اور کان کن کو خام دھات کیسے ملتی ہے؟ کوئی اس کو بتاتا ہوگا کہ دھات کہاں ہے، کوئی اس کی مدد کرتا ہے اور کسی معجزے کے ذریعہ اس کو تانبے یا کانسے میں بدل دیتا ہے۔ وہاں، تہہ زمین کان کن کے پراسرار سرپرست ہیں جن سے معمولی آدمی کا الگ رہنا ہی بہتر ہے۔

برتن بھی کانسے سے بنائے جانے لگے

یہ خیالات صرف یونان کے لوگوں کے ذہن میں ہی نہیں تھے۔ قدیم زمانے کے آدمی ہر جگہ اسی طرح کے خیالات رکھتے تھے۔

تانبا تیار کرنے والے جادوگروں کے قصے ہم تک قدیم زمانے سے آئے ہیں۔

ہماری زبان میں اب بھی ایسے الفاظ ہیں جو بتاتے ہیں کہ دولت اور غربت کو کیا سمجھا جاتا تھا۔ قدیم لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ برادریاں کس طرح امیر اور غریب خاندانوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ دیوتا پہلے ہی سے آدمی کی قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

روسی زبان میں ''بوگاتی،، کے معنی ہیں امیر۔ یہ لفظ ''بوگ،، سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں دیوتا یا خدا۔ یہ لفظ اس وقت روسی زبان میں داخل ہوا تھا جب لوگ یہ یقین کرتے تھے کہ دیوتا امیروں کی مدد کرتے ہیں اور غریبوں کےلئے صرف مصیبتیں نازل کرتے ہیں۔

ایک نئے نظام کی ابتدا

آؤ پھر اس راستے کی طرف مڑکر دیکھیں جو آدمی نے طے کیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب امیر اور غریب، غلام اور مالک نہیں ہوتے تھے۔

قدیم زمانہ کے شکاری جو اپنی کھوھوں میں گلمڈ رھتے تھے مساوی طور پر غریب ہوتے تھے۔ پتھر اور ھڈیوں کے بنے ہوئے ان کے اوزار بہت ہی بھدے تھے۔ ان کو صرف یہی بات جنگلی جانوروں، بھکمری اور سردی سے بچاتی تھی کہ ایک ساتھ رہتے تھے، ایک ساتھ شکار کھیلتے تھے، اپنی طاقتوں کو متحد کرکے خطرے کا دفاع کرتے تھے اور مشترکہ رھائش گاھیں بناتے تھے۔

میموتھ کی تو بات ھی جانے دو۔ اکیلا آدمی کسی ریچھ کو بھی نہیں مار سکتا تھا۔ اکیلا آدمی اپنے چولھے کےلئے کوئی پتھر گھر تک گھسیٹ کر نہیں لاسکتا تھا یا کسی اوپر نکلی ھوئی چٹان میں پتھروں کی سلوں کا اضافہ کرکے دیوار نہیں بنا سکتا تھا۔

اس وقت لوگوں میں ھر چیز مشترک تھی۔ جب شکار کامیاب رھتا تھا تو بزرگ لوگ گوشت کاٹ کاٹ کر ان لوگوں میں تقسیم کردیتے تھے جنھوں نے جانور کا پتہ لگانے اور شکار کرنے میں حصہ لیا تھا۔

لیکن ھزاروں سال گزر گئے۔ قدیم زمانے کے خیموں اور کھوھوں کی جگہ مکانوں نے لےلی اور پتھروں اور ھڈیوں کے اوزاروں کی جگہ دھات کے اوزار آگئے۔

لوگوں نے پہلے کدالوں سے زمین گوڑنی شروع کی پھر لکڑی کے ھلوں سے۔ انھوں نے گھوڑے، گائیں اور بھیڑیں پال لیں۔ لوھارخانوں میں نہائیوں پر ھتھوڑوں کی چوٹیں گونجنے لگیں۔ کمھاروں کے چاک ناچنے لگے۔ محنت کی تقسیم شروع ھو گئی۔ اگر لوھار کسی کلھاڑی یا درانتی کے بدلے میں آسانی سے اناج حاصل کر سکتا تھا تو اس کو کاشتکاری کی ضرورت نہ تھی۔ کسان کو ریوڑوں کی دیکھ بھال کی فکر نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ضرورت بھر کا اون، اناج کے بدلے حاصل کر سکتا تھا۔

کشتیاں اور بادبانی جہاز ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے لگے۔ وہ اناج اور اون، کلھاڑیوں اور مٹی کے برتنوں سے لدے ھوتے تھے۔ باھر سے آنے والے اکثر ڈاکو بن جاتے تھے کیونکہ لوٹمار اور سامان کے تبادلے کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

پہلے کوئی بھی اپنے رشتےداروں سے زیادہ امیر نہیں ھو سکتا تھا۔ سب مساوی طور پر غریب تھے۔

اور اب امیروں اور با اختیار خاندانوں کے گھروں کو محصور کرنےوالی پتھر کی بلند دیواریں غریبوں کی جھونپڑیوں کے اوپر پہاڑیوں پر نظر آنے لگیں۔ وھاں گودام سامان سے بھرے پڑے تھے اور سال بسال خزانوں میں اضافہ ھوتا جاتا تھا۔

برادری میں امیروں نے اختیارات اپنے ھاتھ میں لےلئے اور ان لوگوں کو ماتحت بنالیا جو غریب تھے۔ غریب آدمی کو اب اپنے امیر پڑوسی سے باربار مدد کی التجا کرنی پڑتی تھی اور یہ مدد بہت گراں پڑتی تھی کیونکہ غریب آدمی کو اس اناج کےلئے جو اس نے کسی کٹھن جاڑے کے موسم میں قرض لیا تھا امیر آدمی کو برسوں تک ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔

اس طرح لوگوں نے دوسروں کو غلام بنانا شروع کیا۔

لیکن غلامی کا ارتقا صرف اسی طرح نہیں ھوا۔ لوگوں کو جنگوں میں قید کرکے غلام بنایا جاتا تھا۔

کسی زمانے میں سبھی کام کرتے تھے لیکن وہ زمانہ آیا جب کچھ لوگوں نے کام کرنا بالکل بند کردیا اور دوسروں سے کوڑے مارمار کر کام لینے لگے۔

کسی زمانے میں ہر چیز مشترکہ ملکیت تھی، شکار کے ہتیار اور شکار دونوں۔ اب غلاموں کا مالک ہی بڑی بڑی آراضیوں، گلوں اور ورکشاپوں کا پورا مالک ہوتا تھا۔ غلام اس کے کھیتوں کو جوتتے بوتے تھے، اس کے گلوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور اس کے شاپوں میں کام کرتے تھے۔

کسی زمانے میں ایک برادری کے لوگ آپس میں جنگ نہیں کرتے تھے۔ وہ امن سے رہتے تھے۔ روسی زبان میں ''میر،، کے لفظ کے معنی ''امن،، اور ''برادری،، دونوں ہیں۔

لیکن غلامی کے ظہور کے ساتھ ہر گاؤں اور شہر میں جنگ شروع ہوگئی۔

غلاموں کے مالک اپنے غلاموں سے توہین و حقارت کے ساتھ پیش آتے تھے اور غلام اپنے مالکوں سے نفرت کرتے تھے۔

غلام بھاگنے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور مالک اپنی جائداد کو، اپنے جیتے جاگتے، بولتے اوزار کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کےلئے تلا رہتا تھا۔ غلام دار ریاست مسلح طاقت کے ذریعہ آزاد لوگوں کی ملکیت کی حفاظت کرتی تھی۔ اور اگر غلام اپنے مالکوں کے خلاف بغاوت کرنے کی کوشش کرتے تو ان کو فرماں برداری پر مجبور کیا جاتا اور ظالمانہ سزائیں دی جاتیں۔

اس طرح ابتدائی برادری کے نظام کی جگہ ایک نئے نظام نے، غلام دار نظام نے لے لی۔

بارھواں باب

سائنس کی ابتدا

ایک زمانہ تھا جب ساری دنیا انسان کےلئے راز تھی۔ ہر چیز حیرت انگیز اور عجوبہ تھی۔

آدمی کا ہر قدم، اس کے بازو کی ہر حرکت ایسی ان‌دیکھی طاقتوں کو متحرک کرتی جو یا تو اس کو لے ڈوبتی ہیں یا اس کو کچھ عطا کرتیں۔

بنی‌نوع انسان اس وقت اتنا کم تجربہ رکھتی تھی اور اتنی لاچار تھی کہ لوگوں کو یہ تک یقین نہیں تھا کہ رات کے بعد دن ہوگا اور جاڑے کے بعد بہار آئے گی۔

قدیم زمانے کے لوگ اسلئے مذہبی عبادتیں کرتے تھے کہ سورج آسمان سے بلند ہو۔ مصر میں فرعون جو زمین پر سورج کا اوتار سمجھا جاتا تھا ہر روز مندر کے گرد ایک چکر لگاتا تھا کہ سورج بھی اپنا روزانہ کا چکر پورا کرے۔

خزاں میں مصری ''عصائے آفتاب،، کا جشن مناتے تھے۔ ان کے خیال میں خزاں کے کمزور سورج کو اپنے سفر میں کسی عصا کے سہارے کی ضرورت ہے۔

لیکن آدمی کام کرتا رہا، دنیا اور چیزوں کی صفات کے بارے میں روزافزوں معلومات حاصل کرتا رہا۔

قدیم زمانے کے کاریگر نے چقماق پتھر کو چمکایا اور دھاردار بنایا۔ اس طرح اس نے پتھر کی صفات کے متعلق براہ راست معلومات حاصل کیں۔ وہ جانتا تھا کہ پتھر سخت ہوتا ہے اور اگر کسی دوسرے پتھر سے اس پر چوٹ لگائی جائے تو وہ چٹخ جاتا ہے لیکن چیختا نہیں۔ یہ پتھر تو چٹخ گیا لیکن چیخا نہیں۔ لیکن دوسرا پتھر کیا کریگا؟ ایسے خیالات پر ہم کو ہنسی آتی ہے لیکن قدیم زمانے کے آدمی کےلئے یہ باتیں بالکل مضحکہ انگیز نہ تھیں۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ عام قاعدے کیسے بنائے جائیں اسی‌لئے زندگی میں اس کےلئے بہت سی باتیں استثنائی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ کبھی دو پتھر یکساں نہیں ہوتے اور اسی‌لئے اس نے سوچا کہ ان کی صفات بھی الگ الگ ہوتی ہونگی۔ جب وہ پتھر کی کوئی نئی کدال بناتا تو اس کو بالکل پرانی کی طرح بناتا تاکہ وہ بھی پہلی کدال کی طرح زمین کو کھود سکے۔

ہزاروں لاکھوں سال گزر گئے۔ پتھر کی ان مختلف قسموں کے ذریعہ جو اس کے ہاتھ آئی تھیں آدمی پتھروں کے بارے میں موٹی موٹی باتیں سمجھنے لگا۔ چونکہ سب پتھر سخت ہوتے تھے اسلئے وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ پتھر سخت ہوتا ہے۔ چونکہ کبھی کسی پتھر نے بات نہیں کی تھی اسلئے وہ کہہ سکتا تھا کہ پتھر بولتا نہیں ہے۔

اس طرح سائنس کے پہلے ذرات یعنی چیزوں کا نظریہ ظہور میں آیا۔

جب کاریگر یہ کہتا کہ چقماق پتھر سخت ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہر چقماق پتھر سے ہوتاصرف اس سے نہیں جس کو وہ بناتا۔

اسلئے اس کو قدرت کے کچھ قوانین، کچھ قواعد سے واقفیت ہوگئی جو دنیا میں تھے۔

''جاڑے کے بعد بہار آتی ہے،،۔ اس میں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ بالکل صاف ہے کہ جاڑے کے بعد خزاں نہیں بہار آتی ہے لیکن موسموں کی تبدیلی یہ پہلی دریافت تھی جو ہمارے اجداد نے کثیر مشاہدات کے بعد کی۔ لوگوں نے برسوں کا شمار اس وقت کرنا شروع کیا جب وہ سمجھ گئے کہ جاڑا اور گرمی محض اتفاقیہ نہیں آتے، کہ جاڑے کے بعد ہمیشہ بہار اور پھر گرمی اور خزاں کے موسم آتے ہیں۔

مصریوں نے دریائے نیل کے سیلاب کے مشاہدات کرکے یہ دریافت کی۔ وہ ایک سیلاب سے دوسرے سیلاب تک کے حساب سے نیا سال شمار کرتے تھے۔

بڑے مذہبی پیشوا دریا کی نگرانی کرتے تھے کیونکہ لوگوں کے خیال میں دریا خدا تھا۔ اب تک مصری مندروں کی دیواروں پر جو دریائے نیل کے کناروں پر پھیلی ہوئی تھیں وہ خطوط بنے ہوئے ہیں جو مذہبی پیشوا پانی کی سطح کا نشان بتانے کےلئے کھینچتے تھے۔

جولائی میں جب گرمی سے کھیتوں کی زمین چٹخ جاتی تھی، کسان بڑی بے چینی سے یہ انتظار کرتے تھے کہ کب دریائے نیل کا زرد، کیچڑ اور ریت سے بھرا پانی آبپاشی کی نالیوں میں دوڑےگا۔ لیکن شاید اس سال پانی نہ آئے؟ اگر دیوتا لوگوں سے ناراض ہوگئے اور ان کے کھیتوں کو پانی نہیں دیا تو کیا ہوگا؟

هر طرف سے مندروں میں تحفے اور بھینٹیں آتی تھیں۔ غریب کسان اس التجا کے ساتھ پوجاریوں کے پاس اپنے اناج کی آخری مٹھی تک لاتے تھے کہ وہ دیوتاؤں سے زیادہ سے زیادہ دعا کریں۔

پوجاری روزانہ صبح سویرے اٹھ کر دریا پر جاتے تھے تاکہ دیکھیں کہ دریا میں پانی بڑھ رہا ہے یا نہیں۔

ہر شام کو وہ مندر کی ہموار چھت پر چڑھ کر ستاروں کو بغور دیکھتے تھے۔ یہی ستاروں بھرا آسمان ان کا کیلنڈر تھا۔

اور پھر ایک دن پوجاری بڑے مقدس انداز میں اعلان کرتے:

''دیوتاؤں نے تم پر رحم فرمایا ہے۔ آج سے تین راتوں کے اندر تمہارے کھیتوں میں پانی آجائے گا۔''

فرعون مصر سورج کو بھینٹ دے رہا ہے

آہستہ آہستہ، قدم بقدم لوگوں نے اس عجیب دنیا پر قابو حاصل کرنا شروع کیا جس میں وہ رہتے تھے۔ یہ دنیا معلومات کی دنیا تھی، پریوں کے قصے کہانیوں اور جادو کی دنیا نہ تھی۔ مندروں کی چھتیں پہلی فلکیاتی رصدگاہیں تھیں۔ کمہار اور لوہار کی دوکانیں پہلی تجربہ‌گاہیں تھیں جن میں پہلے تجربات کئے جا رہے تھے۔

لوگوں نے مشاہدہ کرنا، حساب لگانا اور نتائج اخذ کرنا سیکھ لیا تھا۔

اس قسم کی سائنس اور موجودہ سائنس کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ یہ سائنس بہت کچھ جادو کی طرح تھی جس کا وہ ایک حصہ تھی۔ لوگ صرف ستاروں کا مشاہدہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ قسمت کا حال بھی ان کو دیکھ کر بتاتے تھے۔ آسمان‌وزمین کا مطالعہ کرتے وقت وہ آسمان‌وزمین کے دیوتاؤں سے دعا کرتے تھے۔ پھربھی جہالت کا گہرا غبار دور ہونا شروع ہو گیا تھا۔

دیوتاؤں کی اولمپس کی طرف پسپائی

جادو کی دنیا کے غبار سے چیزوں کے اصل خدوخال رفتہ رفتہ آدمی کے سامنے نمایاں ہونے لگے۔

قدیم زمانے کے آدمی کا خیال تھا کہ ہر جگہ روحیں ہیں — ہر پتھر، ہر پیڑ اور ہر جانور میں۔

لیکن وقت کے ساتھ یہ عقیدہ بھی غائب ہوگیا۔

اب آدمی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ہر جانور کے اندر کوئی روح بیٹھی ہوئی ہے۔ اب آدمی کے تصور میں گھنی جھاڑیوں میں رہنےوالے جنگل کے دیوتا نے ان تمام جانوروں کی روحوں کی جگہ لے لی۔

اب کسان کا یہ خیال نہیں رہا کہ گیہوں کی ہر بالی میں کوئی روح ہوتی ہے۔ اس کے ذہن میں اناج سے متعلق تمام روحیں اب زرخیزی کی دیوی میں، جو ہر چیز کی نشوو نما کرتی تھی، متحد و مجتمع ہوگئیں۔

ان دیوتاؤں نے پرانی روحوں کی جگہ لے لی۔ وہ اب معمولی فانی مخلوقوں کے ساتھ نہیں رہتی تھیں۔ معلومات نے اب ان کو آدمی کی رہائش گاہوں سے دور کرنا شروع کردیا۔ اس طرح ان کو ایسی جگہیں تلاش کرنی پڑیں جہاں آدمی کبھی نہیں جاتا تھا یعنی تاریک، مقدس گپھائیں یا درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں۔

لیکن وقت آنے پر آدمی وہاں بھی پہنچ گیا۔ علم نے تاریک جنگلوں کو روشن کردیا، اس نے اس دھند کو دور کردیا جو پہاڑی ڈھلانوں پر پھیلا تھا۔

اس طرح دیوتاؤں کو پھر ایک بار اپنی نئی رہائش‌گاہ چھوڑنی پڑی۔ اب وہ آسمانوں پر پرواز کر گئے، سمندر کی گہرائیوں میں اترگئے اور زمین کی سطح کے نیچے اندھیرے پاتال میں غائب ہوگئے۔

اب زمین پر دیوتاؤں کا آنا کم سے کمتر ہوتا گیا۔ نسلاً بعد نسلاً وہ داستانیں منتقل ہونے لگیں جن میں دیوتا کسی جنگ یا قلعہ کے محاصرے میں حصہ لینے کےلئے آسمان سے اترتے تھے۔

تلواروں اور نیزوں سے مسلح دیوتا فانی انسان کے جھگڑوں میں حصہ لیتے تھے۔ کسی فیصلہ کن لمحے میں وہ سردار کو گھیرے بادل میں چھپا دیتے تھے اور دشمن کو بجلی گراکر قتل کر دیتے تھے۔ لیکن کہانی کہنےوالا تم کو بتائےگا کہ یہ سب باتیں بہت بہت زمانہ گزرے ہوتی تھیں۔

اس طرح انسان کا تجربہ بڑھتا گیا، روشن حلقے کو وسیع کرتا گیا اور دیوتاؤں کو اور زیادہ دور تک پسپا کرتا گیا، حال سے ماضی میں، اس دنیا سے اس پار کی دنیا میں۔

اب تو دیوتاؤں سے واسطہ رکھنا مشکل ہوگیا۔ پہلے ہر شخص معجزے دکھا سکتا تھا اور جادو سے بھرے رسوم ادا کر سکتا تھا۔ یہ رسوم بجائے خود سیدھے سادے تھے۔ مثلاً بارش کےلئے منہ میں ایک گھونٹ پانی بھر کر ایک مخصوص ناچ کے دوران اس کو چاروں طرف چھڑکنا ہوتا تھا۔ بادلوں کو منتشر کرنے آدمی کو چھت پر چڑھ کر ہوا کی نقل کرتے ہوئے پھونکیں مارنا پڑتی تھیں۔

ہم جانتے ہیں کہ نہ تو اس طرح بارش ہو سکتی ہے اور نہ بادل چھنٹ سکتے ہیں۔ اور آدمی اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوتا اس کی دعاؤں کی طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس طرح مذہبی پیشوا عام لوگوں اور دیوتاؤں کے درمیان آیا کیونکہ وہ تمام پیچیدہ مذہبی رسوم اور دیوتاؤں کی تمام پراسرار داستانوں کے بارے میں جانتا تھا۔

پہلے جادوگر صرف کسی شکار کے ناچ کا ڈائرکٹر ہوتا تھا۔ وہ اپنے ساتھی قبائلیوں سے زیادہ روحوں کے قریب نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اب پوجاری اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک مقدس گپھا میں دیوتاؤں کے قریب رہتا تھا۔ وہ مندر کی چھت پر چڑھکر ستاروں کی کتاب سے دیوتاؤں کی مرضی پڑھ لیتا تھا۔ صرف وہی یہ کتاب پڑھ سکتا تھا۔ وہ قربانی دئے ہوئے جانور کی انتڑیاں ہی دیکھ کر یہ بتا دیتا تھا کہ کسی جنگ کا انجام فتح ہوگا یا شکست۔ پوجاری لوگوں اور دیوتاؤں کے درمیان بچوانی بن گیا۔

جنگ سے پہلے ایتھینا دیوی سردار کو مشورہ دے رہی ہے

لیکن دیوتا عام آدمیوں سے دور ھی ھٹتے گئے۔ وہ زمانے گزر چکے تھے جب دیوتا سب آدمیوں کو برابر سمجھتے تھے۔ اب لوگ اپنے کو دیکھنے اور اپنے ماحول کو اور یہ سمجھ لیتے کہ مساواتوالی پہلی حالت اب ختم ھوچکی ھے۔ پوجاریوں نے کہا ''ھونا یہ چاھئے کہ آدمی ھر چیز دیوتاؤں پر چھوڑ دے۔ دیوتا اسی طرح دنیا پر حکومت کرتے ھیں جس طرح بادشاہ اور سردار لوگوں پر۔،، لیکن لوگوں نے ان پوجاریوں کی باتیں سر جھکا کر نہیں سنیں۔ ایسے لوگ بھی تھے جو دیوتاؤں کی مرضی کے سامنے نہیں جھکنا چاھتے تھے۔

وقت آیا جب ایک یونانی شاعر نے پوچھا کہ دیوتا زیوس (Zeus) کا انصاف کہاں ھے جب نیک لوگ مصیبتوں میں مبتلا ھیں اور گنہ‌گار خوش حال ھیں، جب بچوں کو اپنے والدین کے گناھوں کی سزا ملتی ھے۔ اس نے کہا کہ اب یہی کرنا چاھئے کہ امید کی دیوی کی عبادت کی جائے۔ وھی صرف ایسی دیوی ھے جو لوگوں کے درمیان رھتی ھے اور باقی دیوتا تو اولمپس چلے گئے ھیں۔

علم و شعور میں وسعت

قدیم زمانے کے آدمی کو سچ اور پریوں کے قصے، علم اور وھم کے درمیان فرق ھی نہیں معلوم تھا۔

وھم کو علم سے الگ ھونے میں لاکھوں سال لگ گئے۔ ان گیتوں اور پرانی رزمیہ نظموں میں جو ھم تک آئے ھیں مختلف قبیلوں اور سرداروں کی تاریخ کو دیوتاؤں اور ھیروؤں کے قصوں سے، صحیح جغرافیائی معلومات کو مصنوعی جغرافیہ سے، ستاروں کے بارے میں پہلی معلومات کو قدیم داستانوں سے الگ کرنا مشکل ھے۔

یونانیوں نے ھم کو ''ایلیڈ،، اور ''اودیسی،، جیسی قدیم رزمیہ نظمیں دی ھیں جن میں ان کے بہت ھی قدیم گیت اور داستانیں ھیں۔ یہ داستانیں شہر ٹرائے کے محاصرے اور اس کی شکست سے (جس پر یونانی فوج نے قبضہ کر لیا تھا) اور ایک یونانی سردار اودیسیس (اولیسیس) کے ان سفروں سے تعلق رکھتی ھیں جو اس نے غیرملکوں اور سمندروں کے کئے یہاں تک کہ آخرکار وہ اپنے دیس ایتھاکا واپس آیا۔ شہر ٹرائے کی دیواروں کے نیچے دیوتا فانی انسانوں کے شانہ بشانہ لڑے۔ کچھ دیوتا حملہ‌آوروں کی طرف تھے اور کچھ محصور لوگوں کے ساتھ۔ اگر دیوتاؤں کا کوئی محبوب بندہ خطرے میں ھوتا تو وہ اسے جھپٹ لیتے اور سلامتی کی جگہ پہنچا دیتے۔ اولمپس پر جشن کے دوران وہ یہ بحث کرتے کہ آیا جنگ کو جاری رکھا جائے یا جنگ کرنےوالے ریقین میں صلح کرادی جائے۔

ان داستانوں میں سچ اور جھوٹ گڈمڈ ھیں ۔ لیکن داستان کہاں ختم ھوتی ھے اور سچا واقعہ کہاں شروع ھوتا ھے؟ کیا یونانیوں نے کبھی ٹرائے کے شہر کا محاصرہ کیا تھا؟ اور کیا شہر ٹرائے کا واقعی کوئی وجود تھا؟

علما اس پر برسوں تک بحث کرتے رھے یہاں تک کہ ایک ماھر آثار قدیمہ کے پھاوڑے نے اس کا خاتمہ کردیا ۔ ''ایلیڈ،، میں جو نشانات بتائے گئے ھیں ان کے مطابق ماھرینِ آثارقدیمہ نے ایشیائے کوچک جاکر کھدائی کی اور وھاں ٹرائے کے کھنڈرات پائے ۔

''اودیسی ،، میں بھی سچی باتیں تھیں ۔ یہ بات جغرافیہ‌دانوں نے ثابت کی جنھوں نے نقشے کے ذریعہ اودیسیس کے سفروں کا جائزہ لیا ۔ اگر تم نقشہ دیکھو تو تم کو Lotus-eaters کا ملک، جزائر ایئولس، حتی کہ سیلا اور کاریبدیس بھی ملیں گے جہاں ان دونوں کے درمیان سے گزرتے وقت اودیسیس کے جہاز کوتباہ کرنے کی کوشش کی گئی ۔

Lotus-eaters کا ملک درحقیقت افریقہ میں ٹریپولی کا ساحل ھے اور جزائر ایئولس اٹلی میں وہ جزیرے ھیں جن کو ھم لیپاری کہتے ھیں اور سیلا اور کاریبدیس سیسلی اور اٹلی کے درمیان کی آبنائے ھے۔

''اودیسی،، میں سچی باتیں تو ھیں لیکن اگر تم قدیم دنیا کی جغرافیہ کا مطالعہ ''اودیسی،، کے ذریعہ کرنا چاھو تو یہ زبردست غلطی ھوگی ۔

مہموں اور سفر کے کارناموں سے بھرپور اس پہلی کتاب میں جغرافیہ کو ناقابل یقین داستانی لباس پہنایا گیا ھے ۔ پہاڑوں کو عفریتوں میں تبدیل کردیا گیا ھے اور جزائر کے وحشی باشندے ایک آنکھوالے آدم‌خور دیو بن گئے ھیں ۔

لوگ اس زمانے میں صرف اپنے اطراف سے واقف ھوتے تھے ۔ یہ سچ ھے کہ سوداگر جہازوں میں سمندروں کے پار سفر کرتے تھے ۔ لیکن وہ بھی ساحل سے زیادہ دور جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے کیونکہ کھلے سمندر میں سفر کرنا بہت ھی ھولناک تھا ۔ اس زمانے میں نہ تو قطب نما تھے اور نہ نقشے ۔ جہاز راں اپنا راستہ بھولتے بھٹکتے اور اس کو سورج اور ستاروں کے ذریعہ معلوم کرتے تھے ۔ ساحل پر کوئی اونچی پہاڑی یا لمبا درخت ھی ان کا مینار روشنی ھوتا تھا ۔

سمندر ھزاروں خطروں سے بھرا پڑا تھا ۔ چوڑے، چپٹے پیندےوالے جہاز ھلکی سی ھوا سے بھی لہروں پر جھولنے لگتے تھے اور بادبانوں کو قابو میں رکھنا بھی مشکل ھوتا تھا ۔ ھوا آدمی کی فرماں‌برداری نہیں کرتی تھی اور اس کے جہازوں سے اس طرح کھیلتی تھی جیسے وہ لہروں پر تنکے ھوں ۔

لیکن آخرکار جہاز ساحل پر پہنچ جاتا ۔ تھکے ھارے ملاح اس کو کھینچ کر کنارے تک لاتے ۔ یہاں خشک زمین پر وہ بالآخر آرام کرتے ۔ لیکن وہ بےچین
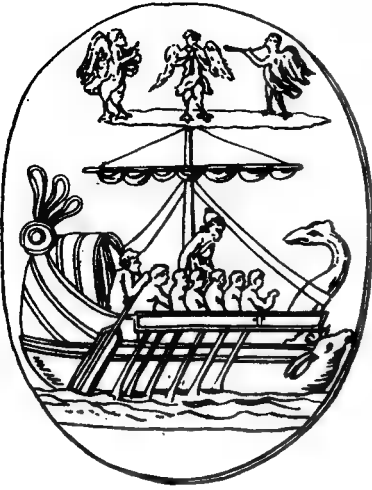
اودیسیس کا جہاز

رہتے کیونکہ جس ملک کو وہ پہنچتے وہ اجنبی ہوتا اور سمندر سے بھی زیادہ ڈراؤنا لگتا۔ ملاحوں کو یہ خیال ستاتا رہتا کہ اب آدم‌خور ان پر ٹوٹ پڑنے‌والے ہیں کیونکہ انھوں نے دوسرے ملاحوں سے ان وحشیوں کے قصے سن رکھے تھے۔ ہر نیا عجیب جانور ان کی خوفزدہ آنکھوں کےلئے ڈراؤنا دیو بن‌جاتا۔ وہ خشکی پر زیادہ دور اندر تک جانے کی جرأت نہ کرتے۔

پھربھی ہر نیا سفر آدمی کی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ نامعلوم کی سرحدیں، دیو اور پریوں کے قصوں کی سرحدیں دور پیچھے ہٹتی گئیں۔ بہت ہی جری ملاح سمندر کے پھاٹکوں تک جاتے جہاں سے بحرذخار شروع ہوجاتا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ یہ بحرذخار سارے عالم کی طرح بے‌کنار ہے۔ جب وہ وطن لوٹتے تو اپنے دوستوں سے بتاتے کہ وہ دنیا کے سرے تک گئے تھے اور خشکی ہر طرف سے بحروں سے گھری ہے۔

ہزاروں سال بعد لوگ یورپ سے ہندستان کا اور چین سے یورپ کا سفر کرنے لگے۔ ملاح سمندر پار کرتے اور دوسری طرف ان کو خشکی ملتی جہاں آدمیوں کی آبادی ہوتی۔

لیکن زمین کی سائنس میں مدتوں تک دیو پریوں کے قصے برقرار رہے۔

امریکہ دریافت کرنے‌والا کرسٹوفر کولمبس واقعی یہ یقین کرتا تھا کہ دنیا میں کہیں ایسا بہت اونچا پہاڑ ضرور ہے جہاں جنت واقع ہے۔ اس نے ملکۂ اسپین تک کو لکھا کہ اس کو اس جنت کے قریب تک پہنچنے کی امید ہے اور وہ اس کے حالات کی کھوج کریگا۔

ابھی پندرھویں صدی تک روس کے یورپی حصے کے لوگوں کا مضبوط عقیدہ یہ تھا کہ اورال کے پہاڑوں کے اس پار جو لوگ رہتے ہیں وہ ریچھوں کی طرح جاڑوں میں نیند کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہم کو ایک پرانا نسخہ ملا ہے۔ اس کا نام ہے ’’مشرقی ملک کے نامعلوم لوگ،،۔ اس قلمی نسخے میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایسے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جن کے منہ سروں کے اوپر ہوتے تھے اور ایسے بے سر لوگ جن کی آنکھیں سینوں پر ہوتی تھیں۔

یہ سب ہم کو بہت ہی مضحکہ انگیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب بھی سائنسی قصے کہانیاں لکھنےوالے اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فضائے کائنات میں واقع انجانی دنیاؤں کے رہنےوالے خوفناک عفریت ہیں۔
سطح زمین کا مطالعہ کافی وسیع پیمانے پر کیا جا چکا ہے۔ اسی‌لئے ان مصنفوں نے اپنے کرداروں کو زمین کے مرکز، سیارۂ مریخ اور چاند کو روانہ کیا ہے۔

پہلے گائک

ہر صدی کے ساتھ پراسرار باتیں، زندگی کے بارے میں اجنبی اور انجانے واقعات کم ہوتے گئے۔ کاریگروں کو اپنے اوپر زیادہ اعتماد ہوتا گیا اور دیوتاؤں کی پوجا اور عبادت میں کمی ہوتی گئی۔ روزمرہ کی زندگی سے جادو ٹونے کے رسوم اسی طرح غائب ہوتے گئے جیسے سورج نکلنے پر کہرا غائب ہوجاتا ہے۔
مختلف قسم کے رسوم، مذہبی کھیلوں، ناچوں اور گیتوں میں جادو اچھی طرح سمایا ہوا تھا لیکن آدمی کے جاگتے ہوئے دماغ نے اس کو یہاں سے، خود جادو کے گھر سے نکالنا اور بھگانا شروع کردیا۔
جادو ٹونےوالے رسوم، ناچوں اور گیتوں سے جادو تیزی سے غائب ہوتا جا رہا تھا اور صرف گیت اور ناچ باقی رہ گئے تھے۔
جب یونان کے لوگ ڈیونیسس (شراب کے دیوتا باخوس) کا جشن مناتے تھے جو ان کو انگور دیتا تھا تو اس میں پہلے مقدس جادووالے کھیل ہوتے تھے۔ ان میں جو کورس گایا جاتا تھا وہ باخوس کی موت، اس کے نئے جنم اور اس بارے میں ہوتا تھا کہ باخوس قدرت کو جاڑوں میں سردوں جیسی نیند سے پھر بیدار ہونے میں، لوگوں کو اناج، پھل اور شراب دینے میں مدد دے۔
اس جشن کے دوران سوانگ کرنےوالے جانوروں کا روپ دھارتے تھے اور گاؤں کی قربانگاہ کے گرد ناچتے تھے۔
قدیم جادو کے کھیل کچھ ڈرامہ سے ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ہمیں سوانگ بھرنےوالوں اور پہلے گانےوالوں میں مستقبل کے ایکٹروں کی جھلک ملتی ہے۔ پہلا گائک صرف دیوتا کی مصیبتوں کا ہی ذکر نہیں کرتا بلکہ اس کی تصویرکشی بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی چھاتی پیٹتا ہے اور دعا کےلئے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے۔
جب باخوس پھر جنم لیتا تھا تو سوانگ بھرنےوالے خوش نظر آتے تھے، وہ ایک دوسرے کو چھیڑتے اور ہنسی مذاق کرتے۔

صدیوں بعد جادو کی رسم سے جادو غائب ہوگیا۔ لیکن رسم اب بھی باقی تھی۔ پہلے کی طرح اب بھی لوگ ڈرامہ کرتے تھے، ناچتے اور گاتے تھے۔ لیکن اب وہ دیوتاؤں کی مصیبتوں کی تصویرکشی نہیں کرتے تھے۔ وہ فانی ہستیوں کی مصیبتوں کو دکھاتے تھے۔ ان کی اداکاری کو دیکھ کر لوگ ہنستے اور روتے تھے، ہمت اور بہادرانہ کارناموں کی داد دیتے تھے اور حماقتوں اور بدھوپن پر ہنستے تھے۔
اس طرح قدیم کورس کا پہلا گائک المیے کا اداکار بن گیا اور زندہ‌دل سوانگ بھرنےوالے کامیڈی اور ہنسی مذاق کے اداکار ہو گئے۔

لیکن پہلا گائک صرف پہلا ایکٹر ہی نہ تھا۔ وہ خاص گائک بھی ہوتا تھا۔ شروع میں وہ سب کے ساتھ کورس گاتا تھا۔ پھر وہ اکیلا گانے لگتا تھا۔

وقت آنے پر گیت کو مذہبی رسوم سے الگ کرلیا گیا۔ گائک مقدس کھیلوں، سردار اور سپاہیوں کی دعوتوں میں گانے لگا۔ گائک گاتا، اپنی بانسری بجاتا اور کبھی کبھی ناچتا بھی اور پرانے رواج کے مطابق الفاظ، موسیقی اور اداکاری کو ملا کر ہم آہنگی پیدا کرتا۔ وہ پہلا گائک اور کورس گانےوالا دونوں ہوگیا۔ وہ گیت بھی گاتا اور ٹیپ کے بول بھی۔

لیکن وہ کس کی بابتہ گاتا تھا؟ وہ دیوتاؤں اور ہیروؤں کے بارے میں، اپنے قبیلے کے سرداروں کے متعلق گاتا تھا جنھوں نے بہادر سے بہادر آدمیوں کو مار بھگایا۔

یونانی دیوتا باخوس کے اعزاز میں ناچ

وہ جنگ میں کام آنےوالے سورماؤں کے بارے میں، ان بھائیوں کے بارے میں گاتا تھا جن کا بدلہ لینا تھا۔

یہ گیت نہ تو جادو ہوتا تھا اور نہ دعا۔ یہ جری کارناموں کی کہانی ہوتی تھی جو دراصل مزید بہادری کےلئے للکارتی تھی۔

اور محبت، بہار اور غم‌ورنج کے بارے میں گیتوں کی بابتہ کیا کہا جا سکتا تھا! وہ کہاں سے آئے تھے؟ وہ بھی کسی زمانے میں ان رسموں کا حصہ تھے جو شادی اور موت کے موقعوں پر، فصل کی کٹائی اور انگوروں کی چنائی کے وقت گائے جاتے تھے۔ کورس باری باری چھوٹے چھوٹے گیت گاتے تھے۔

چرخہ کاتنےوالی کمسن لڑکی ان گیتوں کو گاتی اور ماں بچے کی لوریوں میں ان کو گاتی۔

آج بہار کے گیت صرف بہار ھی میں یا محبت کے گیت صرف شادی کے موقع پر ھی نہیں گائے جاتے۔

ہیروؤں اور محبت کے گیت سب سے پہلے کس نے بنائے؟

ھمیں اس کا جواب نہیں معلوم جیسے کہ ھم یہ نہیں جانتے کہ دراصل کس نے سب سے پہلی تلوار یا سب سے پہلا چرخا بنایا تھا۔ ایک شخص نے نہیں بلکہ سیکڑوں نسلوں نے ھمارے اوزار، گیت اور الفاظ بنائے ھیں۔ گائک اپنے گیت نہیں بناتا تھا، وہ صرف ایسے گیت دوسروں تک منتقل کر دیتا تھا جو اس نے پہلے سنے تھے۔ لیکن ایک گائک سے دوسرے گائک تک منتقلی کے دوران گیت بڑھتے اور بدلتے تھے۔ جس طرح چشموں سے سیراب ہوکر دریا پیدا ھوتا ھے اسی طرح ان ابتدائی گیتوں سے بڑی بڑی رزمیہ نظمیں پیدا ھوئیں۔

ھم کہتے ھیں کہ مشہور یونانی نظم ''ایلیڈ'' ھومر کی تخلیق ھے۔ لیکن ھومر کون تھا؟ ھم اس کے بارے میں صرف داستانوں کے ذریعہ جانتے ھیں اور ھومر بھی اتنی ھی داستانی ھستی ھے جتنے وہ ھیرو جن کے گن ھومر نے گائے ھیں۔

جب بہادر ھیروؤں کے بارے میں پہلے گیت بنائے گئے تو گائک اس وقت اپنے جرگے اور قبیلے سے مضبوطی کے ساتھ منسلک تھا۔ اس وقت لوگ ھر کام ساتھ ملکر کرتے تھے اور گیت بھی نسلوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ھوتے تھے۔

گائک اپنے کو گیت‌کار نہیں سمجھتا تھا چاھے وہ پچھلی نسلوں سے ملنےوالے گیت میں کوئی تبدیلی کرکے اس کو بہتر ھی کیوں نہ بنائے۔

لیکن جب آدمی نے ''میرے'' اور ''تیرے'' کی تفریق شروع کی جرگے ایک دوسرے سے الگ ھوگئے اور پہلا جیسا اتحاد نہ رھا۔ اب کاریگر اپنے لئے کام کرنے لگے۔ اب وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ جرگے کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ تھے۔

کئی صدیوں بعد میگارا کے شاعر تھیوگنیس نے لکھا:

247

''میں نے ان شعروں پر
اپنی مہر لگا دی ہے جو
میرے فن کا پھل ہیں۔
کوئی ان کو نہ تو چرا
سکتا ہے اور نہ بدل سکتا
ہے۔ سب یہی کہیں گے:
'یہ ہیں میگارا کے تھیوگنیس
کے اشعار!،،

برادری والے نظام کا کوئی شخص یہ کبھی نہیں کہہ سکتا تھا۔
رفتہ رفتہ آدمی نے ''میں،، کا لفظ اکثر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ زمانہ بہت دن ہوئے گزر گیا تھا جب وہ یقین کرتا تھا کہ وہ خود نہیں کام کر رہا ہے بلکہ اس کے ذریعہ کوئی اور کارفرما ہے۔ یہاں گائک فنون لطیفہ کی دیوی کا ذکر کرتا تھا جس نے اس میں گیت کےلئے ولولہ پیدا کیا۔ وہ کہتا تھا کہ ''گیت کا عطیہ،، اسے دیوتاؤں سے ملا ہے لیکن وہ اپنے بارے میں بھی کہنا نہیں بھولتا تھا۔

''دیوتاؤں نے وعدہ کیا ہے
کہ مجھکو بھلایا نہ جائے گا۔''

یونان کی قدیم دور کی شاعرہ سافو کی مندرجہ بالا نظم میں نیا پرانے سے بغل گیر ہے۔ سافو کو یقین تھا کہ فنون لطیفہ کی دیوی نے اس کو الفاظ کا عطیہ دیا ہے نہ کہ اس نے خود اس کو اپنی زبان میں پایا ہے جس طرح کان کن پہاڑوں میں خام دھات پاتا ہے۔ لیکن اسی سطر میں ہم کو مصنف کا فخر، ایک شاعر کا فخر ملتا ہے جو جانتا ہے کہ اس کو بھلایا نہیں جائیگا۔
اس طرح آدمی بڑا ہوتا گیا اور جتنا ہی وہ بلندیوں پر چڑھتا گیا اتنا ہی اس کا افق وسیع ہوتا گیا۔

اس کتاب کے بارے میں کچھ اور

ابھی ابھی ہم نے زمانۂ تاریخ سے قبل کے آدمی کے بارے میں کہانی ختم کی ہے۔ یہ کہانی تم کو غلام‌دار نظام کی ابتدا تک لاتی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے جو مکمل ہوکر شایع ہو چکے ہیں زبردست غلام‌دار ریاستوں کے قیام، غلام مالکوں کے خلاف غلاموں کی جدوجہد اور اس نظام کے زوال کے بارے میں ہیں جس کی بنیاد غلامی پر تھی۔

ہم نے یہ کتاب شروع کرنے سے پہلے بہت سی کتابیں پڑھیں۔

ہم نے چارلز ڈارون اور ان کے پیروؤں ولادیمیر کووالیفسکی اور کلیمنٹ تیمیریازیف سے یہ معلومات حاصل کیں کہ ہماری دنیا کی زندہ مخلوقات میں تبدیلی اور ارتقا کیسے ہوتا رہا یہاں تک کہ آدمی کا ظہور ہوا۔

فریڈرک اینگلس کی کتابوں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کام نے بندر کو کیسے آدمی بنایا۔

ایوان پاولوف نے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد دی کہ آدمی نے کیسے سوچنا اور بولنا سیکھا۔

کارل مارکس، فریڈرک اینگلس اور ولادیمیر ایلیچ لینن کی تصانیف نے ہمارے سامنے لاکھوں سال کے دوران انسانی سماج کے ارتقا کا وسیع منظر پیش کیا۔

ہم نے فطرت کی تحقیقات کرنےوالوں، مؤرخوں اور کھوج کرنےوالے سیاحوں کی دوسری بہت سی کتابیں بھی پڑھیں۔

اور اگر تم بھی تاریخ انسانی کے بارے میں اور زیادہ جاننا چاہتے ہو جیسا کہ ہم چاہتے تھے تو علم کے ابتدائی سرچشموں کو لو، ان سائنس‌دانوں کی کتابوں کو، جنھوں نے کرۂ ارض اور بنی نوع انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔

ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم تم کو سائنس کے دروازے تک پہنچا دیں اور کہیں کہ ''اندر جاؤ''۔

دور و نزدیک

میخائل ایلین (۱۸۹۵ء — ۱۹۵۳ء) نے اپنی ساری زندگی انتہائی مشکل لیکن باعزت کام کے لئے وقف کر دی یعنی انھوں نے کم از کم ایسے ایک لاکھ سوالات کا جواب دیا جو تمام پروان چڑھتے ہوئے بچوں کے خیالات کو اکساتے ھیں جب وہ کھوجی نظروں سے اپنے چاروں طرف کی دنیا کو دیکھتے ھیں۔

''انسان بڑا کیسے بنا،، ، ''موٹروں نے چلنا کیسے سیکھا،، ، ''عظیم منصوبے کی کہانی،، ، ''پہاڑ اور لوگ،، ، ''آج اور کل،، ، ''کیا تم جانتے ہو؟،، ، ''آدمی اور عناصر،، ، ''ایٹم کے اندر سفر،، ، ''سورج میز پر،، ، ''کیا وقت ھے؟،، ، ''لوگ تعمیر کرتے ھیں،، اور بہت سی دوسری کتابوں نے جو ایلین نے لکھی ھیں لاکھوں کم‌عمر قارئین کو علم کی دنیا میں داخل ہونے میں، یہ سمجھنے میں مدد دیتی ھیں کہ آدمی اور سماج کی زندگی کیسی ھے، لوگ کیسے کام کرتے ھیں اور کام کس طرح چلتا ھے۔ ھر کتاب میں مصنف نے اپنے طریقے پر آدمی کے لئے تعریف‌وتحسین کا اظہار کیا ھے جو قدرت کے رازوں کی گہرائیوں میں برابر اترتا جا رہا ھے، جو کام اور رهن سهن کے نئے نئے طریقے بناتا جا رہا ھے۔ ایلین چاھے یہ لکھ رھے ہوں کہ آدمی نے پہلی گھڑی کس طرح ایجاد کی یا ''میز پر سورج،، کس طرح روشن کیا یا کسی خودکار فیکٹری یا عظیم سوشلسٹ منصوبے کے بارے میں لکھتے ہوں انکا باجوھر قلم ھمیشہ سائنس اور ادب کے درمیان ایک دلکش اور ولولہ‌انگیز رشتہ پیدا کر دیتا ھے۔

خود اپنی تصانیف کے بارے میں جن میں سائنس‌داں اور مصنف ھم‌آھنگی سے کام کرتے ھیں لیکن پہلا دوسرے پر کبھی حاوی نہیں ہونے پاتا ایلین نے کہا ھے ''سائنس‌داں اپنے اطراف کی دنیا کا تجزیہ کرتا ھے اور اپنے منتخبہ شعبے کا مطالعہ کرتا ھے۔ آرٹسٹ ھمیشہ پوری دنیا سے مجموعی طور پر متاثر ہوتا ھے۔ جب آرٹسٹ فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ھے تو وہ ماھر نباتات، حیوانات اور موسمیات کا مجموعہ بن جاتا ھے۔ تمام دوسرے ادب کی طرح مقبول عام سائنسی ادب بھی آدمی اور فطرت کے اتحاد پر نظر رکھتا ھے۔،،

ایلین نے ہر کتاب، ہر سطر جو لکھی ہے وہ دریافت عالم کی مسرت‌انگیز شاعری سے بھرپور ہے۔ وہ عام طور پر بہت ہی زیادہ سادہ رویے سے نہیں کام لیتے جو آجکل مقبول ہو گیا ہے بلکہ سائنس انسان کے لئے جو چیزیں اپنی جھولی میں بھرے ہے ان کے بارے میں وہ واقعی شاعرانہ اور ولولہ‌انگیز سوجھ بوجھ سے لکھتے ہیں۔ یہی انکی تصانیف کی جان و روح ہیں، اسی وجہ سے وہ اتنی انسان‌دوست اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ ایلین کو ہمیشہ ایسے مصنف کی حیثیت سے یاد رکھا جائیگا جس کی تصانیف علم کی پیاس رکھنے والے تمام ذہنوں کو سائنس اور قدرت کا بنیادی اور ابتدائی چہرہ دکھاتی ہیں، ایسے مصنف کی حیثیت سے جس نے اپنے قارئین کے دماغوں اور تصورات میں ھلچل پیدا کردی ہے۔ دنیا بھر میں کروڑوں آدمی روباکین اور فلاماریون، بریم اور فابرے، تیمیریازیف اور پال‌دے کروئی، فیریڈے اور فیرسمان کے شکرگذار ہیں۔ لیکن ایلین خود اپنی جگہ پر خاص پوزیشن رکھتے ہیں کیونکہ ان سے پہلے کوئی بھی اس قدر قابل بھروسہ اور بعض وقت غیرمتوقع طریقے پر ''انسان اور فطرت کے اتحاد،، کو نہیں پیش کر سکا۔ سائنس کے رازوں کی صاف اور جامع طریقے پر وضاحت کرنا جو صرف قدرت کو نہیں بدلتی بلکہ انسانی سماج کو بھی بدل دیتی ہے ان کی خاص صفت تھی کیونکہ وہ اپنے وقت کے سچے سپوت تھے، ترقی پسند دماغ کے انسان اور نئے سماج کے نقیب۔ ایلین مقبول عام سوویت سائنسی ادب میں بنیادی طور پر ایک نئے اسکول کے بانی اور لیڈر تھے۔ جو راستہ انہوں نے دکھایا تھا اس پر دوسرے سوویت ادیب بھی چلے۔ یہ تھے پیسارژیفسکی، آگاپوف، ایوویچ، میخائلوف، ویبیر، دوروحوف، شاروف، دانین، استروگووا، حالفمان اور اورلوف وغیرہ۔

ایلین نے اس کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی جس کو میکسم گورکی نے شروع کیا تھا۔ گورکی نے بچوں کے لئے تعلیمی کتابوں کا ایک بڑا سلسلہ تیار کرنے کا ایک دلکش پروگرام بنایا تھا جس کے ذریعہ بچوں کو زمین پر زندگی کی ابتدا اور انسانی ترقی اور تہذیب کی تاریخ کی تعلیم دی جا سکے۔ اس منصوبے میں مختلف موضوعات کا ذکر کیا گیا تھا اور کتابوں کے لئے عنوان تک تجویز کئے گئے تھے۔ مثلاً ان میں سے چند یہ تھے ''زمین،،، ''ہوا،،، ''پانی،،، ''پودے،،، ''جانور،،، ''زمین پر لوگوں کا ظہور کیسے ہوا،،، ''لوگوں نے سوچنا کیسے سیکھا،،، ''آدمی نے آگ پر کس طرح قابو پایا،،، ''خیال اور کارنامے،،، ''سائنس نے انسان کو بڑا کیسے بنایا،، وغیرہ۔

گورکی کا منصوبہ برسوں کے لئے تھا اور حالانکہ اب بھی یہ تکمیل تک نہیں پہنچا ہے پھر بھی بہت سے معروف سوویت مصنفوں اور سائنس دانوں نے ان کے منصوبے سے ولولہ حاصل کرکے بچوں اور نوجوانوں کے لئے مقبول عام سائنس کی بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں اور ایلین کا ان میں سب سے بڑا حصہ ہے۔

یہ منصوبہ متعدد مصنفوں کے تعاون سے بنایا گیا تھا جن میں خود ایلین بھی شامل تھے۔ اسی لئے انھوں نے سیگال کے ساتھ مل کر ''انسان بڑا کیسے بنا،، نامی کتاب لکھی جو ان موضوعات میں سے ایک کا عنوان ہے جنھیں گورکی نے تجویز کیا تھا۔

ان موضوعات پر ٹھیک سے کام کرنے کےلئے آدمی کو مخصوص قسم کا مصنف بننے کی ضرورت تھی — سائنس داں، تعلیم دینےوالے اور آرٹسٹ کا مجموعہ۔ اور ایلیا مارشاک جو پیشے کے لحاظ سے انجنیر تھے اسی قسم کے مصنف تھے۔ انھوں نے ایلین کا قلمی نام اپنایا اور انھوں نے کہا ''تاکہ لوگ مجھکو اور میرے بھائی سموئل مارشاک کو گڈمڈ نہ کر سکیں جو مشہور سوویت شاعر ھیں۔،،

ایلین کی زبردست مقبولیت کا خاص سبب ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ ''مشکل اور دانش مندانہ بات کو بڑی سادگی اور صفائی سے کہہ دیتے تھے۔،،

ایلین، ادیب اور انسان، یہ محسوس کرتے تھے کہ سائنس، علم اور تخلیقی کام ایک دوسرے سے علحدہ نہیں کئے جا سکتے اور ان کی تمام تصانیف کی ولولہ‌انگیز طاقت دراصل علم کی کبھی نہ بجھنےوالی پیاس تھی۔ مصنف صرف بڑے عالم ھی نہیں بلکہ بہت ھی زودحس انسان بھی تھے۔ ان کی ایک سطر بھی ایسی نہ ملیگی جس میں انھوں نے بے تعلق ھوکر محض لکچر دیا ھو جو اکثر بہت ھی اچھے تعلیمی مضامین کی طرف سے بھی نوجوان قارئین کے جوش کو ٹھنڈا کر دیتا ھے۔ ایلین کی کتابوں میں حقیقی سائنس کی گرمی پائی جاتی ھے جو انسان کی خدمت بڑی وفاداری کے ساتھ کرتی ھے اور جو اب اس کو عظیم مسرتوں کے ذرائع فراھم کرسکتی ھے۔ ایلین نے نوجوان قارئین کے سامنے قدرت کے بہت سے راز افشا کئے ھیں لیکن ان کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ یہ راز سمجھ میں آجائیں بلکہ وہ اپنے سننےوالوں کو یہ دکھانا چاھتے تھے کہ تمام علم میں مسرت اور شاعری ھوتی ھے۔ ان کی تصانیف ھمیشہ دلچسپ اور خوشکن ھوتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ھی ان میں پختگی بھی تھی۔ وہ مختلف قسم کی ادبی پینترے بازی سے کبھی کام نہیں لیتے تھے جیسا کہ زیادہ مقبول عام سائنس کی کتابوں میں کہانی کی دلچسپی بڑھانے کے لئے کیا جاتا ھے۔ مصنف اپنے موضوعات کے لئے ایسے احترام کے جذبات رکھتے تھے کہ وہ ان بھڑکیلی اور شوخ باتوں کی طرف متوجہ نہیں ھوئے جو ان موضوعات میں پنہاں تھیں۔ اس لئے انھوں نے حقیقی سائنس کی منزل طے کرتے ھوئے راستے میں ادبی گل‌افشانیاں نہیں کیں۔ انھوں نے نوجوان قاریوں کے ساتھ اپنے منتخبہ موضوع کے راستے پر، سچے علم کی شاھراہ پر سفر کیا۔

ایلین نادر خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے پاس علم کا زبردست اور کارآمد خزانہ تھا اور کام کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ اس مہلک بیماری کے باوجود جو ان کی طاقت کو برابر چوس رھی تھی وہ آخری دم تک کام کرتے رھے۔ ان کی ھمت حیرت‌انگیز

تھی۔ ان کو لکھنے کی میز سے ھی اسپتال پہنچایا گیا۔ وہ ایک لاکھ ایسے سوالوں کا جواب دینے سے پہلے ھی ختم ہو گئے جو بچے کے کھوجی دماغ میں پیدا ہوتے ھیں۔ لیکن اس باھمت انسان نے اپنی مختصر زندگی میں جو کچھ کیا اس نے سائنس کو حقیقی آرٹ سے مربوط کر دیا۔ کروڑوں نوجوانوں میں، اس عظیم دور کے نوجوان ہمعصروں میں چیزوں اور واقعات کی زیادہ گھری معلومات اور مستقبل کے بارے میں بہتر سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی۔

آج تمام ملکوں کے کروڑوں بچوں کی توجہ ان کی کتابوں کی طرف جاتی ھے جب ان کے کھوجی ذھن اس بات کے لئے پوری طرح پختہ ہوتے ھیں کہ ان میں یہ جاننے کا اشتیاق پیدا ہو کہ آدمی کا ارتقا بےچارگی کی حالت سے جب وہ بالکل قدرت کے رحم و کرم پر تھا کیسے ہوا اور کس طرح وہ ایسی عظیم اور ہمہ‌گیر طاقت کا مالک بن گیا کہ سمندروں کو ملا دے اور ان پہاڑوں کو ھٹا دے جو اس کی مسرتوں کی راہ میں حائل ہوں۔ ان سوالوں کے جواب اس حیرت‌انگیز مصنف کی کتابوں سے ملتے ھیں۔ ھر براعظم کے بچے جب ایٹم کے قلب کی گہرائیوں تک اترنا چاھتے ھیں، جب یہ جاننا چاھتے ھیں کہ موٹرکاروں نے کس طرح چلنا سیکھا یا اپنے سیکڑوں ہزاروں سوالوں کے جواب معلوم کرنا چاھتے تو ان کی کتابیں مانگتے ھیں۔

لیکن ایلین نے اپنے قارئین کو آدمی کی خدمت کرنےوالی قدرت اور چیزوں اور آدمی کی روز افزوں بڑھتی ہوئی ٹکنیکی طاقت کے بارے میں بتانے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کیا ھے۔ انھوں نے ھمارے سوشلسٹ سماج کے نئے قوانین کی وضاحت کی جو کمیونزم کی طرف اس کی فاتحانہ پیش‌قدمی کا تعین کرتے ھیں۔

میرے ذھن میں خاص طور سے ''عظیم منصوبے کی کہانی،، ھے جو ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی تھی۔ یہاں قاری کے سامنے دلچسپ اور سادہ طریقے سے اس عظیم سوشلسٹ منصوبے کی شان و شوکت کا مظاھرہ کیا گیا ھے جو تاریخ میں پہلی بار کروڑوں انسانوں کی زندگی کو اتنی سمجھداری کے ساتھ منظم کرتا ھے۔

اس کتاب کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہوا اور یہ عالمی ادب کا ایک سنگ میل بن گئی— مغربی یورپ، ایشیا اور امریکہ میں بڑی تعداد میں متعدد بار چھاپی گئی۔ اس طرح دنیا کے کونے کونے میں کروڑوں آدمیوں نے پہلی بار یہ جانا کہ ایک عظیم ملک کا کایاپلٹ کرنے کے لئے سوشلسٹ منصوبہ کیسے کارفرما ھے۔ اس نے یہ ولولہ‌انگیز حقیقت دکھائی کہ محنت کش لوگوں کی سوویت قوم کس طرح عوام کی بہبودی اور مسرت کے لئے زندگی کا ایک نیا راستہ بنا رھی ھے۔

''عظیم منصوبے کی کہانی،،، ''انسان بڑا کیسے بنا،، اور ایلین کی دوسری تصانیف زمانہ ہوئے سوویت کلاسیکی ادب میں شامل ہوچکی ھیں۔ ان کا شمار بچوں کی بہترین کہانیوں میں ہوتا ھے۔

لیکن ہم مصنفوں نے بھی جن کا تعلق انھیں اشاعت گھروں سے تھا جن سے ایلین متعلق تھے، ہم لوگ جو ایلین سے برابر اپنے جلسوں میں، گھر پر یا ادارتی دفتروں کی گھما گھمی اور بھاگ دوڑ میں ملتے تھے اکثر بھول جاتے تھے کہ یہ بہت ہی منکسر، ہمدرد اور دوست قسم کا انسان جس نے اپنی خوبیوں سے ہم کو متحیر کر رکھا ہے مشہور عالم ہستی ہے۔

اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے لئے کہ ایلین کا مقام عالمی ادب میں کیا ہے یہ یاد کرنا مناسب ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں ان کی کتابیں کتنی مقبول ہوئیں ۔ حالانکہ کتابیں کم عمر لوگوں کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن وہ ہمارے ملک اور غیرملکوں میں بھی عام طور پر تمام پڑھنےوالوں کی پسندیدہ بن گئیں ۔ ان کی تصانیف اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ بچوں کے لئے کوئی اچھی اور معقول کتاب بڑوں کےلئے بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ بچوں کی کوئی ایسی کتاب جو تاریخ کے کسی عظیم دور کی خدمت کرتی ہے ایک نئی صدی کی ابتدائی کتاب بن کر کرۂ ارض کے کونے کونے میں پھیل سکتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں ''عظیم منصوبے کی کہانی،، پڑھکر رومیں رولاں نے لکھا تھا ''یہ کتاب ایک چھوٹا سا شاہکار ہے۔ اگر یہ ہر زبان میں ترجمہ ہو تو بہت اچھا ہوگا۔ کوئی اور کتاب سوویت یونین کے جری کارناموں کی عظیم اہمیت کو اتنی صفائی اور سادگی سے نہیں پیش کرتی ۔ ،،

امریکی اخبار ''شیکاگو ڈیلی نیوز،، کے ادبی تنقیدنگار کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس کو یہ کتاب پڑھکر اس قدر حیرت ہوئی ہے کہ وہ اس کی بےحد تعریف کرنے سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس سے کتاب کو نقصان نہ پہنچ جائے ۔ اس کے خیال میں سادہ طرز تحریر کا یہ شاہکار تھا اور حالانکہ اخبار سوویت پنج سالہ منصوبے کی رپورٹوں سے بھرے پڑے تھے اور اس موضوع پر بہت سی اور کتابیں تھیں لیکن اس کتاب نے تنقید نگار کو ان باتوں کا تصور کرایا جو سوویت یونین میں ہو رہی تھیں اور بلاشبہ اس زمانے کی سب سے اہم باتیں تھیں ۔

جرمنی کے اخبار ''اشٹوٹ‌گارٹ زونتاگ زیتونگ،، نے لکھا: ''انجنیر ایلین نے بڑی نمایاں تخلیق کی ہے۔ انھوں نے پیچیدہ اور زبردست پنج سالہ منصوبے کو قابل فہم صورت میں پیش کیا ہے۔ ان کی کتاب جس کی بنیاد اعداد و شمار پر ہے ہمیں اس عظیم‌ترین تبدیلی کی کہانی بتاتی ہے جو زمین کے ایک بڑے حصے میں ابھی تک ہوئی ہے۔ یہ زبردست واقعہ بہت ہی سادہ، جامع اور متوازن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہمارے دور کی رومانیت سے بھرپور ہے۔ ،،

امریکی رسالے ''سیٹرڈے ریویو آف لٹریچر،، نے اس کو روس کے بارے میں،

خواہ وہ انگریزی زبان میں ہو یا دوسری زبان میں، سب سے دلکش کتاب کہا۔ اس رسالے نے اس بات پر زور دیا کہ ایلین نے پہلے سوویت پنج‌سالہ منصوبے کے بارے میں معقول طور پر لکھا اور ساتھ ہی اس دلکشی اور وقار کو بھی قائم رکھا جس نے کتاب کو بہترین ادبی تخلیقات میں جگہ دی۔ رسالے نے اس کو نثر میں نظم کہا جو تورگینف ایسے مشہور مصنف کے لئے زیبا تھی۔ اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ Book of the Month Club نے اس کو اپنے مئی کے رسالے میں اشاعت کے لئے منتخب کیا۔

''میگزین آف وال اسٹریٹ،، نے لکھا کہ حالانکہ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن غیرملکوں میں بڑے لوگوں کے لئے بھی مناسب ہے جو اس وقت تک پہلے سوویت پنج سالہ منصوبے کو محض نام چار کے لئے جانتے تھے۔

اس حقیقت کی تصدیق کے لئے ایک امریکی نے مصنف کو لکھا تھا:

''شاباش! اس نے تو مجھکو چاروں خانے‌چت کردیا۔ ،،

امریکہ میں یہ کتاب بہت ہی مقبول ہوئی۔ بچوں کی کتاب جس کا تعلق انتہائی مقبول فیشن‌ایبل جاسوسی ناول یا نفسیاتی تجزئے پر مبنی کسی سنسنی‌خیز ناول سے نہ تھا۔ سماجی معاشی موضوع پر بچوں کی یہ کتاب ایک سب سے زیادہ بکنے‌والی کتاب، سب سے زیادہ پڑھی جانے‌والی کتاب بن گئی۔ ناقد اور کتاب کو پسند کرنے‌والے قارئین دونوں نے تعریف و تحسین کی بارش کی۔ کولمبیا یونیورسٹی کے ٹیچروں کے کالج کے ڈین اور اپنے زمانے کے ایک ممتاز امریکی ماہر تعلیمات پروفیسر جی۔ ایس۔ کاؤنٹ نے خود ایلین کی کتاب کا ترجمہ کیا اور اس کو چھہ کاپیوں میں ٹائپ کیا۔ انھوں نے روسی کی اصل کتابوں سے ہر کاپی میں کچھ وضاحتی تصویریں چسپاں کیں اور ان مسودوں کی جلدیں بندھوا کر کالج کی لائبریری میں اس سے قبل داخل کر دیں کہ کتاب کا ترجمہ انگریزی میں شایع ہو۔ انھوں نے کہا ''ہر صفحہ مصنف کی لاجواب ذہانت کا ثبوت ہے۔ ،،

امریکہ میں صرف یکا دکا تعریف نہیں ہوئی۔ ''نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون،، نے لکھا کہ وہ ایلین کو واقعی لاجواب ادیب سمجھتا ہے جو سوویت یونین نے پیدا کیا ہے۔ ان کی کتابیں اپنے اسٹائل اور خیالات کی سادگی کی وجہ سے نمایاں ہو گئی ہیں جو واقعی عظیم ہیں اور ہمیشہ مصنف کے مقصد سے ہم‌آہنگ پائے جاتے ہیں۔

کئی سال بعد ۱۹۳۶ء میں ترقی‌پسند رسالے New Masses نے ایلین کی تصانیف کے بارے میں لکھا کہ ان کے مصنف ''غیرمعمولی ذہانت کے مقبول عام مصنف ہیں جن میں وہ کردار صاف نظر آتا ہے جو صرف سوویت ادیبوں کا حصہ ہے یعنی شعوری طور پر عظیم اور نئی جدوجہد میں حصہ لینا،،۔ اس رسالے نے آگے چل کر لکھا کہ

''ایلین ایسے نئے سماجی شعور کے بھی مالک ھیں جو کسی سرمایہ‌دار ملک کے مصنف کی ملکیت نہیں ھو سکتا۔ ''

میخائل ایلین کی حیرت انگیز خوبی یہ ھے کہ وہ بہت سے مجرد خیالات کی ایسی لاجواب تصویرکشی کرتے ھیں کہ تم ان کو دیکھ سکتے ھو۔ ان کی خوبی یہ ھے کہ وہ انوکھی چیز کو چن لیتے ھیں اور قاری کو یہ سہولت دیتے ھیں کہ وہ خود، اپنی آنکھوں سے دیکھے اور خود ھی زندگی کی تبدیلیوں کی بابتہ سمجھے۔

رئیک‌یاویک (آئس‌لینڈ) کے ایک قاری نے ان کو لکھا ''آپ دیکھئے، مغربی دنیا کے لوگ تو اس معاملے میں چھوٹے بچوں جیسے ھیں اور ھم کو ابتدائی کتاب کی سب سے زیادہ ضرورت ھے''۔ اس نے لکھا کہ ایلین کی کتاب کی حیرت‌انگیز وضاحت ھی ھر عمر کے قارئین کے لئے اس کی مقبولیت کا باعث ھوئی ھے۔

ایلین کی کتابوں نے اپنا پیغام دور و نزدیک پہنچایا ھے۔ غیرملکی قارئین نے کتاب کو کھولکر ایک ایسی نئی، انوکھی دنیا کی کھڑکی کھول دی جو محیرالعقل ایجادوں اور زبردست حقیقتوں سے بھرپور ھے۔ بہت سے ملکوں میں ان کی کتابیں بڑی تعداد میں شایع ھوئیں اور انھوں نے لاکھوں لوگوں کو سوویت یونین کی زندگی کی حقیقتوں کو اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا۔ اس بات کی بھی مثالیں ملتی ھیں کہ اس کتاب نے سفارتی گفت و شنید کے راستے کھولے۔

''نارفوک ھیجر ڈیسپیچ'' نے نومبر ۱۹۳۳ء میں لکھا تھا کہ اگرچہ یہ بحث زوروں میں جاری ھے کہ روس کو وفاقی حکومت کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے یا نہیں لیکن کارو باری لوگوں نے سرکاری طور پر روسی ادیبوں کو تسلیم کر لیا ھے مثلاً م۔ ایلین کو۔

دنیا کے بہت سے ادیبوں اور سماجی لیڈروں نے ان کی تصانیف کو بہت سراھا۔ رومیں رولاں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگر انھوں نے لڑکپن میں ایلین کی کتابیں پڑھی ھوتیں تو انھوں نے مین ریڈس اور جولس ورن کی جگہ لے لی ھوتی۔ رسالۂ ''فرانس — سوویت یونین'' کے جنوری ۱۹۳۶ء کے شمارے میں ایک مضمون لکھتے ھوئے فرانس کے مشہور شاعر پول ایلیوآر نے وقت کی رفتار پر فتح حاصل کرنے اور بہتر مستقبل بنانے کے لئے آدمی کی خواھش کا ذکر کیا اور ایلین کی کتاب ''عظیم منصوبے کی کہانی'' کے بارے میں کہا: ''کوئی شاعر اس خواھش کو ایسی سادگی سے نہیں پیش کر سکا جیسا کہ ایلین نے کیا ھے جو پہلے سوویت پنج‌سالہ منصوبے کا شاعر ھے۔''

میخائل ایلین کی تصانیف کے بارے میں مندرجہ بالا رائیں غیرملکی قارئین کے تاثرات میں سے چند ھیں خصوصاً ان کی بہت ہی مقبول کتاب ''عظیم منصوبے کی کہانی''

کے بارے میں - بہرحال، اس ممتاز اختراع پسند ادیب کی اور بھی کتابیں اسی طرح مقبول ہوئی ھیں -

رومیں رولاں نے لکھا ''میری بیوی نے ابھی آپ کی تازہ‌ترین کتاب ''پہاڑ اور انسان،، مجھے پڑھکر سنانا ختم کیا ھے جو مجھے اس سے پہلی والی کتاب ''عظیم منصوبے کی کہانی،، سے زیادہ پسند آئی -،،

یہ کتاب انگلستان، سویڈن، امریکہ، چین، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں بہت مقبول ہوئی -

نومبر ۱۹۳۸ء میں ''نیویارک هیرلڈ ٹریبیون،، نے لکھا کہ ''یہ چھوٹی اور هلکی پھلکی ''کارآمد جغرافیہ،، غالباً سب سے زیادہ نمایاں اور مدلل دستاویز ھے جو پچھلے برسوں سوویت یونین میں چھپی ھے- ،،

۱۹۳۶ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ''ورلڈ نیوز،، نے لکھا کہ ایلین نے اپنی کتاب کا نام ولیم بلیک کی اس لائن سے لیکر کہ ''جب آدمی اور پہاڑ ملتے ھیں تو بڑے بڑے کارنامے ظہور میں آتے ھیں،، بڑی صفائی، صحت اور سادگی کے ساتھ لکھا ھے- ''ایلین کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ اپنے موضوع کو مقبول عام طریقے سے پیش کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سادگی سے کام لیں - وہ چاھتے تھے کہ اپنے موضوع کو ایسی صفائی اور پرجوش طریقے سے بیان کریں جس سے اشتیاق پیدا ھو اور پھر جوابات دیکر قاری کے لئے واقعی دلچسپی پیدا کریں- لوگوں نے ''پہاڑ اور انسان،، کو وہ تمام ٹکڑے یکجا کرنے میں جو پوری دنیا بناتے ھیں ایک عظیم رول قرار دیا - ،،

غیرملکی ناقدوں نے ایلین کی اس خواهش کو بھی سراها کہ وہ زندگی کی زبردست رنگا رنگی پر بحث کرنا اور اس کے عوامل کی منطقی وحدت کو شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں طرح سے حاصل کرنا چاھتے ھیں -

''لیٹر فرانسیس،، نے نومبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں ''پہاڑ اور انسان،، کے بارے میں لکھا ''ایک معجزہ؟ جادو؟ نہیں، سائنس اور شاعری ایک ساتھ... ایلین موجودہ شاعروں میں ایک سب سے بڑا شاعر ھے-

''ایسا شاعر جو صرف نثر لکھتا ھے لیکن اس کی کہانیاں تازہ اور جاندار شاعری سے بھری ھوتی ھیں - وہ ایلیوآر کے محبوب شاعروں میں داخل ھو گیا ھے-

''سوویت تصانیف میں سے کوئی بھی ''پہاڑ اور انسان،، سے زیادہ اشاعت کی مستحق نہیں ھے جو دوسری عالمی جنگ سے پہلے لکھی گئی تھی- رڈیارڈ کپلنگ کی کتابوں کی طرح اس کی بھی لاکھوں کاپیاں شایع ھونی چاھئیں کیونکہ ایلین بھی کپلنگ کا هم‌پایہ مصنف ھیں - ،،

''عظیم منصوبے کی کہانی،، میں جس نے ایلین کو بین اقوامی شہرت بخشی لوگوں نے پہلے پہل پرانے سماجی نظام پر فتح کا قصیدہ پڑھا اور اب انھوں نے ''پہاڑ اور انسان،، میں نئے انسان کی آزادی اور قدرت کی طاقتوں پر اس کے کنٹرول کا گیت پایا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں ''ڈیر فریئے باویر،، میں ایک جرمن کسان کا خط چھپا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

''اب میں ''پہاڑ اور انسان،، کی کہانیاں پڑھنے کے بعد سوویت عوام اور ان کی سوشلسٹ ریاست کے بارے میں سمجھنے لگا ہوں۔،،

سفری ایجنسی کک کے پریس کے شعبے کے سربراہ نے ایلین سے کہا کہ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں ان کی کتاب ''پہاڑ اور انسان،، سپاہیوں، ملاحوں، کان کنوں، قانون‌دانوں اور حتی‌کہ ایک امیر بیگم نے بھی پڑھی ہے۔،،

یہ بات دلچسپ ہے کہ ایلین اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ دوسرے مصنف ان کی کتابوں کا ذکر اپنے ناولوں میں بےتکلفی کے ساتھ کرتے تھے جب وہ کسی خاص کردار کے کسی خاص پہلو کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً لوئی اراگوں نے اپنے ناول ''کمیونسٹ،، میں اپنے ایک کردار کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کو ایک کتاب ''پہاڑ اور انسان،، مل گئی جو ایک روسی نے لکھی تھی۔ اس کو ذرا اس کتاب پر شک تھا کیونکہ وہ پروپگنڈے سے عاجز آچکا تھا لیکن یہ کتاب واقعی جولس ورن کی تصانیف کی طرح دلچسپ تھی۔،،

الجیریا کے ایک ترقی‌پسند مصنف محمد دیب نے اپنی کتاب ''بڑے گھر،، میں لکھا ہے:

''دراصل حامد نے عمر کو ''پہاڑ اور انسان،، نامی کتاب دی اور لڑکے نے بڑے صبر کے ساتھ اس کتاب کے ایک ایک صفحے کو اپنے میں سمولیا۔ اس نے چار مہینے میں یہ کتاب ختم کی۔،،

سان فرانسیسکو سے ایک چھوٹی لڑکی نے ایلین کو لکھا کہ اس نے اور اس کے نوسالہ دوستوں نے ان کی کتاب ''سفیدی پر سیاہی،، (تحریر کی تاریخ کی بابتہ) بڑی دلچسپی سے پڑھی۔ اور انھوں نے اس کی بنا پر ایک کھیل بنایا۔

۱۹۴۴ء میں ''نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون،، نے سال کی پہلی ششماہی میں لکھی ہوئی بچوں کی بہترین کتاب کےلئے دوسو ڈالر کے انعام کا اعلان کیا۔ یہ انعام میخائل ایلین اور ایلینا سیگال کی ''پہیلیوں کی کہانی،، نامی کتاب کےلئے ملا۔

ہم ایسے بےشمار مضامین پیش کر سکتے ہیں جن میں ''انسان بڑا کیسے بنا،، کی غیرملکوں میں بڑی تعریف کی گئی ہے۔ یہ مضامین ریاستہائے متحدہ امریکہ،

میکسیکو ، جاپان، انگلستان، ھنگری ، آسٹریا، سویڈن، فرانس اور جرمنی کے اخباروں میں شایع ھوئے ھیں ۔

غیرملکوں کے اکثر دوروں میں اس موضوع پر بحث کرتے ھوئے کہ سوویت آرٹ اور ادب کا عالمی تہذیب کے خزانے میں کیا حصہ ھے میں نے مایاکوفسکی، شولوخوف، آئزینشٹین، گالینا اولانووا، شوستاکوویچ، خاچاتوریان اور موخینا کے ساتھ میخائل ایلین کا نام سنا ھے۔ فرانس، چین اور جاپان کے بہت سے اخباروں نے میخائل اینین کی موت پر ماتمی مضامین میں ان کو سوویت روس کا عظیم ادیب کہا ھے۔

اگر کوئی ایلین کی کتابوں پر ادبی تنقید نگاروں کے مضامین، اخباروں کی رائیں، قارئین کے خطوط، نمایاں ادیبوں، سائنس دانوں، شاعروں اور سماجی لیڈروں کے انٹرویو جمع کرے تو ان کی ایک ضخیم کتاب بن جائیگی اور کون جانے کہ ایسی کتاب کسی دن شایع ھی ھوجائے۔

پھر ان کی کتابوں میں جو کچھ کہا گیا ھے اس کے علاوہ ھمیں ایک اور ولولہ‌انگیز کتاب لوگوں کو یہ یاد دلانے کے لئے مل جائیگی کہ کس طرح ایک سوویت ادیب، ایک عظیم فن‌کار اور سائنس‌داں کے صاف، جامع اور دانش‌مندانہ الفاظ نے دوسرے ملکوں کے لئے ایسے خیالات کا راستہ کھولا جو ھمارے طریقۂ زندگی کے لئے جوش پیدا کرتے ھیں اور دنیا کے سامنے اس زندگی کی عظیم حقیقت کو آشکار کرتے ھیں ۔

لیف کاسیل

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، جُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني ۾ چان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳَر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا ہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو ہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو ہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وٽن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ ٽالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪٻئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پوءِ بيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌ کان وَڌ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، جانڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جٿ جٿ جاڙ وڏي تي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا:

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا:

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄڪلهہ جي پاڙهو تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪچي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڄڪلهہ ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين

ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بڻائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشش ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نه رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان به پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها، توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو ته "منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ".
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)